

پکی لہائیاں

August
2016

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

☆ ”مسئلہ یہ ہے“ قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆ ایم اے راحت کا نیا تہلکہ خیز سلسلہ زور و لومڑی

www.paksociety.com

ماہنامہ سخی کہانیاں گرجا

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانہی سہام مرزا



منیجر مارکیٹنگ

021-35893121

منیجر سرکوشن

0333-2269932

مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام
مدیر : کاشی چوہان / دانیال شمشی

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈوائٹس)

رکن آل پاکستان پبلیشرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان پبلیشرز ایسوسی ایشن

MEMBER
APNS
CPNE

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

خط و کتابت کا پتہ: 88-C II فرسٹ فلور خیابان جامی کرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے جلد: 33 - شمارہ: 08 - اگست: 2016

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دو شیزہ اور سخی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادا محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کپی کی اجازت نہیں ہے اور ایسی صورتوں میں ذرا مبالغہ آلودہ اور ناقابل اعتدال اقدامات کیے گئے ہیں۔ اس کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیکھنا راز و قائلانی چاہو جو کچھ کہنا ہے۔



احوال

08

کاشی جوهان

قارئین کے خطوط اور حوالہ احوال کا دل چسپ سلسلہ

ایڈھی بھی چلے گئے

07

منزہ سہام

میت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر کامیابی کے راز چھپا رکھی ہیں

فریب نظر

35

جاوید راہی

اس اسکرین کی بہشت ناک داستان جو فریب نظر کا شکار ہو کر اپنی جان گنوا بیٹھا

لاائف بوائے

31

اسماء اعوان

میت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر کامیابی کے راز چھپا رکھی ہیں

پھر سے زندہ ہو گئی

55

محمد سلیم اختر

اس ہندوہ شیزہ کی داستان کا عجیب جو مر کر پھر سے زندہ ہو گئی تھی

یاور آفس کو

70

غلام محمود

ان فلم کی کہانی جو بیوی کے قاتل سے انتقام لینے کے لیے ہر گرجی نہ مرا تھا

وہ فرشتہ

60

مشرقی

ان بہانہ دوست کی کہانی جو ہمیشہ فرشتہ بن رہے تھے مگر ایک دن وہ بھی مارا گیا

بس ذرا سی چھاؤں...

88

محمد قاسم بلوچ

اس نوجوان کی ہر اسرار داستان جو آج بھی ایک بڑی اتم کی قید میں جی رہا ہے

رب کا انصاف

100

سجاد احمد

رشتہ نہ بننے پر کالے غم کا سہارا لے کر برباد ہونے والے شخص کی داستان

VICTIM کون؟

98

ماہر وشنو

اُن خاندان میں کوئی بھی سیٹھا جانے پایا کہ ان میں سے شیطان کون تھا

وہ چٹکبری بلی

112

نادرہ ملک

ان قارئین کے لیے ہر اسرار گہری سوچات جو بلبوں سے بہت عقیدت رکھتے ہیں

بندر کا بیچہ

130

صدیقہ حسین ساجد

ایسا بچہ جس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے لیے دنیا میں اندھا ہو جائے اور اپنی ساری دولتیں اپنے لیے لے کر چلا جائے

خمیا زہ

119

ثمنہ طاہرہ

کھیل ہی کھیل میں پڑنے والی افتاد نے اس خاندان پر زندگی ہی جگ کر دی تھی

زرد لو مڑی

136

ایم اے راحت

جاسوسی کی دنیا میں تہلکہ مچا دینے والا ایم اے راحت کا نیا سلسلہ

آخری فرعون

160

ملک صفدر عباس اعوان

فرعون کی سرزمین سے اُن آخری فرعون کے کہ جس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا قرار دیا

فرعون کے مجرم

152

بنت حوا

اسے اہرام میں فرعون کو خند سے بے دخل کرنے والوں کی انہماک تھی کہ وہ داستان

آکھ کے کسے میں محفوظ ہو جائے
 ان عناصر کو آپ فراہم نہیں کر سکتے

188

میرزا بیگی کی سیول سروس جونی تھی؟

201

دیکھتے ہیں کہ بیرون کا اسلوب اور
دور شیرازہ پر چلنے پر داتا تھا اور پھر

220

پوری پستی میں آج کے زمانے کے مسائل کے ساتھ رہنے والے ہیں۔

237

ایک جن زاویہ کی انہی راستوں اور جگہوں پر
اور جنگ میں سب کچھ چاہئے، محنتی تھی

1

میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا



ایدھی بھی چلے گئے

شنا تھا اور پرکھا بھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہر شے تبدیل ہوتی ہے،
 چاہے موسم ہوں، حالات ہوں یا پھر رشتے سب ایک دن ضرور اپنی اصل شکل
 کھودیتے ہیں یا کم از کم کسی حد تک تبدیل ضرور ہو جاتے ہیں.....
 بات بہت پرانی نہیں قصہ 80ء کی دہائی کا ہے جب ملیشیا شلوار قمیض میں، قدرے سیاہ
 دارھی والے لٹکھن کو میں نے بچی کہانیاں کے آفس میں دیکھا۔ پیر دن میں سستی سی چپل
 اور ہاتھ میں سیاہ سرورق والی کتاب، لب و لہجہ سادہ مگر کچھ نہ سمجھ میں آنے والا..... یہ
 میری پہلی ملاقات تھی ایدھی صاحب سے ابو کے کمرے میں..... پھر وقتاً فوقتاً بلقیس
 ایدھی صاحبہ سے رابطہ ہوتا رہا..... ایک مکمل انسان جس پر بنانے والے کو بھی 'فخر' ہوتا
 ہوگا..... بے سہاروں کا مسیحا اور اُن لاوارث زندگیوں کو جھولے سے اٹھا کر سینے
 سے لگانے والا، جنہیں ان کے اپنے جانوروں کی غذا بننے کے لیے چھوڑ جاتے
 تھے۔ اُن لاوارث لاشوں کا کفن دفن کرنے والا جن کا حق تھا کہ انہیں انسان
 ہونے کے ناطے دوسرے انسان کم از کم عزت و تکریم سے زمین برد کریں۔ ایسے بلند
 کردار انسان کے بارے میں کچھ بھی لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف
 ہے۔ مگر بحیثیت پاکستانی یہ میرا فرض ہے کہ میں ایدھی صاحب کو خراج عقیدت
 پیش کروں۔ مجھے یقین ہے کہ جس عزت و احترام سے وہ اپنے آخری سفر پر
 روانہ ہوئے رب کائنات نے ان کے لیے بہترین
 اجر رکھا ہوگا۔ اللہ ہم سب کے ایدھی صاحب کو
 کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آمین۔

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور ان کے جواب

پیارے ساتھیو!

عید گز گئی۔ بہت پیارے دوست اظہر حبیب کا ایک شعر آپ کی سماعتوں کا رزق بناتے ہیں۔

میرے دل میں رہنے والے ہٹا ہٹا سب لوگوں کو عید مبارک۔

گو کہ عید پرانی ہوئی مگر اچھا شعر بھی امانت کی طرح ہوتا ہے۔ یہ تو تھی خوشی آئی اب روح کے ساتھ

لگے گھاؤ کا سینہ چاک کرتے ہیں۔ رمضان میں امجد صابری کی بے وقت موت نے تڑپایا تو عید بعد عید السار

ایڈیٹی صاحب بھی اس دنیا سے پردہ کر گئے۔ ایڈیٹی صاحب کے لیے میرے جذبات احوال کے اختتام پر نظم

کی صورت پر جیسے گا۔ یہ سانحہ مجھے رنجور کر گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے ساتھیو! جیسے انسانیت سے محبت کرنے والے

شیشے پر پھیلنے پانی کی طرح ہو گئے ہیں۔ اس پانی کی تحریر بھی سب نہیں پڑھ سکتے بلکہ کوئی کوئی ہی اس شفاف

زبان کا ماہر ہوتا ہے۔ یادو! کراچی میں آج کل جنت نظیر موسم ہے۔ بجلی بجی بارش برسی ہے اور من جل تھل

کر دیتی ہے۔ کوئی بھی ہمارے شہر میں چھتری استعمال نہیں کرتا۔ کیوں چلیں ہم چھاتا نیک کر بھائی، ہمیں

بھی حق ہے بوند بوند سے پانی سے تن من میرا ب کرنے کا۔ میرے شہر نے بڑی خون آشامی دیکھی ہے۔

برسوں بیت گئے چھین کی نیند سوئے۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ اگر نیند آگئی تو سمجھو شہر کے روز ہی انہیں گئے۔

کتنے زمانوں بعد تو میرے شہر میں کچھ سکھ کا موسم آیا ہے۔ اور سکھ کا موسم آتے ہی یہ کالی کالی گھٹائیں روز ہی

چلی آتی ہیں۔ اور یہ بیٹا کچھ کا موسم چپکے سے کچھ نہیں بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ اور اس موسم کی سوغات لیے ہم

یہ اعلان کر رہے ہیں کہ نجی کہانیاں کا پہلا سٹریٹس ایوارڈ بہت جلد منعقد ہوا ہی چاہتا ہے۔ اب تو خوش ہونا

پیارو! سجنو! مترو! مٹھوں! خدا کرے ہم اس امتحان میں سرخرو ٹھہریں۔ چلیے ساتھیو! اب احوال کا آواز

کرتے ہیں۔ اپنے بہت پیارے لکھاری ساتھی ممتاز احمد کے نام سے۔ سرگودھا سے ہمارے عزیز ساتھی

لکھتے ہیں۔ ”ماہ جولائی کا شمار 2 جون کو موصول ہوا۔ چاروں بعد عید الفطر تھی تو ڈبل عید ہو گئی۔ اللہ کریم تمام

مسلمانوں کی عبادات اور دعائیں اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے، آمین۔ اس بار ٹائٹل بہت شاندار تھا۔

معصومی دوشیزہ کے سر پر دوپٹہ جو اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا اور پرکار فر عید مبارک نے ٹائٹل

کو دلکش بنا دیا۔ ادارہ میں بہن مزہ اپنی نیک تمناؤں، خواہشات کے ساتھ عید کی مبارک باد دے رہی تھیں تو

دل سے خیر مبارک۔ احوال میں پہنچا تو دل بہت غمگین اور دکھی ہو گیا۔ کاشی بھائی کے پھوپھا جان کے انتقال

اور ان کے جوان سال خالو کی وفات نے دل کو دکھی کر دیا۔ سرکولیشن منیجر اقبال زمان صاحب کے بہنوئی کی

وفات اور پینا تاج کے دنیا سے چلے جانے کی خبروں نے بہت غمگین کر دیا۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں

مرحومین کی بخشش و مغفرت بلندی درجات کے لیے دعا گو ہوں۔ ایک لمبی مدت کے بعد ہمارے محترم

عبدالعزیز جی آ صاحب احوال میں تشریف لائے ان کا خط پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ جی آ جی! اب آئندہ غیر حاضری نہیں چلے گی ورنہ..... سب سے پہلے نئے احوالیوں نعمان احمد آرائیں، فرزانہ گل، بشری کنول، اسد اللہ سانگی، ایم مجاہد حسین جاگی، نور صبا، رمشا ملک، ثناء ملک، شہناز پروین کو احوال میں خوش آمدید۔ دیکھم۔ جن دوستوں نے میری کہانی ”یکوڑے گرم“ کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ میری حوصلہ افزائی کی ان سب کا دل سے ممنون اور شکر گزار ہوں۔ اب بات ہو جائے جولائی کے شمارے کی۔ کمرشل کہانی ”لائف بوائے“ کچھ نیا کر دکھائے حسب سابق بہت شاندار کہانی تھی۔ ”نئے چراغ“ بہت زبردست اور انوکھی سچ بیانی تھی۔ ”رشتے ناتے“ سب مایا ہے آج کے دور کی ایک تلخ سچ بیانی ہے۔ غریب انسان کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو بااخلاق ملنسار ہو۔ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی بس مالداروں کے ہی سبب ہوتے ہیں۔ ”کون سے فریاد“ ایک رلا دینے والی سچ بیانی تھی۔ ایک عرصے کے بعد فیصل ندیم بھٹی ایک بہت اچھی سبق آموز کہانی نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم لے کر آئے۔ ویلڈن فیصل۔ منزل کہاں تھی، ہیرو، نام بھی نہ رہے گا، آپا بیگم، ملن، سوکھی اچھی کہانیاں تھیں۔ بھائی مقصود احمد بلوچ ”قسمت“ کے عنوان سے کہانی لے کر آئے جو کچھ بے چاری نازد کے ساتھ ہوا۔ ایسی بے شمار کہانیاں ہمارے ارد گرد بکھری پڑی ہیں۔ شاہد رفیق سہکی ”سلو پوئزن“ حسرت کا سامان لیے شاندار کہانی تھی۔ مسرت غفار نے ”کیا لے جائے گا“ کے عنوان سے بہترین کہانی پڑھنے کو دی بہت اچھی کہانی تھی۔ ”آدھی سہاگن“ جاوید رائی حسب سابق بہت عمدہ اور لا جواب کہانی لے کر آئے۔ ”زربخت اور شب گل“ سیدہ عطیہ زاہرہ کی مختصر مگر ایک اچھی تخلیق تھی۔ راشد لطیف کی کہانی ”انصاف کون کرے گا“ مارچ 2016 کے ایک میگزین میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ ابھی یہاں تک پڑھا ہے۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ ”ہائیڈ پارک“ میں حسین خواجہ کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ نزابت افشال اور عمارہ ناز کے کلام بہت عمدہ تھے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو.....“

☆ پیارے بھائی ممتاز! تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار رہا۔ آپ کی محبت کی کیا مثال ہو۔ اب تو لفظ بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں راشد لطیف کے لیے صرف اتنا کہنا کہ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو... امید ہے راشد سمجھ گئے ہوں گے۔ نیشاندہی کا شکریہ“

✎ مجید احمد جاگی، ملتان شریف سے لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں جولائی عید مبارک دیتا ہوا بہت لیسٹ ملا۔ وجہ عید کی چھنیاں جو آئی تھیں۔ سرورق بہترین اور اعلیٰ تھا۔ منزہ سہام سے عید مبارک وصول کی اور ان کے عید کے ساتھ آمین کہتے احوال کی محفل میں پہنچے۔ خواجہ حسین صدارت کی کرسی پر براہمان تھے اور ہمیں یاد بھی کر رہے تھے شکریہ۔ عبدالعزیز جی آ کا لیسر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ مینا تاج کے انتقال پر ملال ہے اور کاشی چوہان کے پھوپھا جان اور محمد اقبال زمان کے بہنوئی محمد زمان کی وفات کا سن کر دل دکھوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ 9 جولائی کو انسانیت کا مسیحا اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ شخصیت کسی انعام، ایوارڈ کی محتاج نہیں تھی۔ فرزانہ گل صاحبہ ہم آپ کو بھولے نہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا جو ہم یاد نہ رکھیں۔ اسد اللہ سانگی نے یاد رکھا ممنون، مشکور ہوں۔ اس کے علاوہ نئے چہروں سے ملاقات ہوئی، خوش آمدید۔ نئے پرانے احوالیوں سے محفل خوب جی ہوئی تھی۔ سبھی کو سلام و دعا میں۔ خوش رہیں، خوشیاں بانٹیں۔ کہانیوں میں خدا ملا نہ صنم سب سے پہلے پڑھی۔ شازیہ نے غلطی کی اور سزا بھی اُسے ہی ملنی تھی۔ منزل کہاں تھی، ملن، نئے چراغ، آپا بیگم، کیا لے جائے گا، آدھی سہاگن، بازی گر، خزانہ، انصاف کون کرے گا، ملاپ، بہترین کہانیاں تھیں، بادبان خوب جا رہا ہے ہر عشق روٹنے کٹے کر دیتا والا نادل ہے، بھارت میں بلیک لسٹ بھی خو

سب چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، اور تیرنیم کش زبردست جار ہے ہیں۔ ڈاکٹر خادم حسین، ایم مجاہد حسین جانی، اور تمام دوستوں کو محبتوں بھرا سلام۔

☆ بھائی مجید! بہت شکریہ ”آپ“ کی محبت کا۔

نور صبا، ملت کا کچا قاسم پور، ملتان سے لکھتی ہیں آئے ہیں ہم بڑے سچ درج کے، عید کی خوشیوں میں اضافہ کرتے چکی کہانیاں نے دل جیت لیا۔ نئی کہانیاں کا سردرق بہت خوبصورت تھا اور منظر و سہام عید کی مبارک باد دے رہی تھیں۔ ناں۔۔۔۔۔ کرد۔۔۔۔۔ گرد شوق سے بچپن کی باتیں کر دے۔ کاشی بھائی کی وجہ سے احوال کی محفل مجبتیس بانٹ رہی ہے۔ خوشیوں کا سماں ہے، مسکراہٹیں ہیں، جاہلیس ہیں۔۔۔ اللہ سب کو سلامت رکھے آمین۔ سبھی احوال اچھے تھے۔ آپ کی نظم بہت پسند آئے۔ بڑی گہری نظر رکھتے ہو۔ ارد گرد بے محاشرے پر کہانیوں میں لائف بوائے خوب نکلی، نئے چراغ، رشتے ناتے، چنبھی نہ کوئی سندیس خزانہ، اچھی لگی، زہر عشق کی قسط سپر ری، بادبان، زرد لومڑی بھی خوب رہی، سفر نامہ اچھا ہے۔۔۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔۔۔ تبصرے کیوں۔۔؟ جب پڑھی ہی نہیں۔ اب اجازت۔

☆: اچھی نور صبا! تمہارا تبصرہ بڑا بولڈ تھا۔ تمہیں ہمیں سنسکر کرنا پڑا۔ خوش رہو بچی! ہمیں سیاست میں بھیج رہی ہو۔ سیاست کی نانی ہو تم لڑکی تم۔

ہوئی ہو۔ سیاست کی مانی ہو مرنے م۔

ہمارے بہت پیاری بھابی صائمہ مجید، ملتان شریف سے لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں ماہ جولائی عید مبارک دینا ہوا موصول ہوا۔ سرورق پہ لڑکی دوپٹہ خوبصورتی سے اوڑھے خوبصورت انداز میں کسی کو گھور رہی تھی۔ خوبصورت انداز میں محبت پوشیدہ ہے۔ منورہ سہام سبھی اہل وطن اور قارئین کو عید مبارک پیش کر رہی تھیں۔ (خبر مبارک) احوال میں کاشی بھیا کی باتیں دل کو بھاگئیں۔ بھائی مقصود احمد بلوچ دعائیں دینے کا بہت بہت شکریہ کہانی کی پسندیدگی کا شکریہ، آپ کی قسمت کہانی اچھی ہے۔ نزابت افشاں، انکل ممتاز احمد صاحب، سید ملازم حسین شیرازی، بخارو نازا آپ کی محبتوں کی مقروض، فرزانہ گل صاحبہ آپ کا فیصلہ تسلیم ہے۔ خالد یوسفی صاحب، شازیہ گل، بشری کنول، اسد اللہ سانگی، احسن ابرار رضوی، ڈاکٹر خادجہ حسین کھیرا میرے شہر سے کنڑہ ملک، ایم اے راحیل صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے کہانی کو پسند کیا۔ اس کے علاوہ نئے لوگوں کی آمد اچھی لگی، پرانے چند ساتھی ردپوش ہو گئے ہیں، مہربانی فرما کر مغل میں حاضری لینی کریں، عبدالعزیز جی، انکل اب آپ آگئے ہیں تو جانا نہیں ہے، کاشی بھیا آپ کی نظم ول کی نہاں خانوں کو دہی کر گئی۔ اللہ آپ کی زبان مبارک فرمائے۔۔۔ آمین۔ مینا تاج اللہ تعالیٰ کو پیاری ہوئی، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ کہانیوں میں ملن، منزل کہاں تھی، آپا بیگم، نہ خدا ملا نہ صنم، رشتے ناتے، نئے چراغ، کون سے فریاد، آفیسر، چٹھی نہ کوئی سندیس، ایک سنٹ تیس سکینڈ، کیا لے جائے گا، سپر ہٹ کہانیاں تھیں، آدھی سہاگن، جرم کہانی بہت اعلیٰ تھی، زہر عشق کسی تعریف کی محتاج نہیں، بھارت میں بلیک لسٹ، خوب جارہا ہے، بادبان ناول اچھا چل رہا ہے، مستقل سلسلے خوب سے خوب تر ہیں۔

☆ پیاری سی صائمہ نجی! تبصرہ خوب رہا۔ جیواور من کی مرادیں پا کر جیو (آمین)

✽: سونیا خان، بہتی شاد گردیز کوئلہ رحم علی سے عرض گزار ہی ماہ جولائی کا جی کہانیاں حسب روایت ملا۔ ٹائل زبردست تھا، منزہ سہام، عید مبارک دے رہی تھیں خیر مبارک آپ کو بھی بہت بہت عید کی خوشیاں مبارک۔۔۔ احوال میں کاشی بھیاء بچپن کی باتیں کر رہے تھے۔ بچپن تو سہانی یادیں ہوتی ہیں۔ احوال کی محفل میں پرانے لکھاریوں کو واپس آنے پر خوش آمدید، جن میں عبدالعزیز جی، آٹمنشی محمد عزیز مئے اور شازیہ

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم!

مینی پاکستان سے نکل کر.....

پاکستان کے دل میں.....

زندہ دلاں لاہور کے درمیان

بہت جلد.....!

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کی جا رہی ہے

کیا لاہور..... کراچی سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب..... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

آپ اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے.....

میرا ساتھ کس طرح دیں گے؟

آپ کے جواب کا منتظر.....

آپ کا اپنا.....

کاشان

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

گل صاحبہ اب پھر غائب نہیں ہوتا۔ نئے احوالوں کی آمد پر دل خوش ہوا، ان کو دیکھ کر، ست بسم اللہ، عظمیٰ شکور، سدرہ انور علی غائب..... کیوں۔ کہانیوں میں لائف بوائے، رشتے ناتے، نئے چراغ، کون سے فریاد، نام بھی نہ رہے گا، آپا بیگم، ملن، زردلو مڑی، کیا لے جائے گا، ملاپ، خزانہ، بازی گر، اچھی کہانیاں تھیں۔ قسمت پہلے بھی شاید کہیں پڑھ چکی ہوں۔ زرد بخت اور شب گل زبردست کہانی۔ قسط دار تینوں سلسلے اچھے جا رہے ہیں، زہر عشق ناپ پہ ہے اور بادبان، زرداو مڑی، بھارت میں بلیک لسٹ عمدہ چل رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت۔

۵۵: پیاری سونیا! تبصرہ اچھا کیا تم نے۔ ممتاز احمد اور مجید احمد جانی کی کہانیاں اسی شمارے میں پڑھ لو۔
۵۶: عشال احمد نواب، لاہور سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ بھیکے بھیکے موسم میں تچی کہانیاں ننھنرا تامل۔ شاید بارش کی وجہ سے سردی لگ گئی تھی یا تیز ہواؤں میں جھوم رہا تھا۔ جو بھی تھا پرچہ پیارا تھا۔ میں بھی سچی کہانیاں کا حصہ بننے کے لیے حاضر ہو رہا ہوں۔ اُمید کے خوش اہمید کہیں کے۔ بے اسرار نمبر کے لیے کہانی ای میل کر دی ہے۔ احوال کی محفل زبردست تھی، چند خطوط کے سوا باقیوں نے بہت عمدہ لکھا۔ کہانیوں میں قسمت، کے الزام دوں، نئے رشتے، کون سے فریاد۔ سوئی، سلو پوائزن، پسند آئیں۔ اب تک اتنا ہی باقی حوصلہ افزائی کے بعد۔

۵۷: بھائی عشال! خوش آمدید! انشاء اللہ آپ اگلے بے اسرار نمبر میں ضرور شامل ہوں گے۔
۵۸: احسن ابرار رضوی، ساہیوال سے ہمارے احوال بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں جولائی عید سے پہلے مل گیا گویا ہماری عید ہوئی لیکن منجانبہ تیرہ کی دل ہلا دینے والی خبر نے ساری خوشیاں ماند کر دیں۔ کاشی بھیا، کے پھو پھا جان کے انتقال کا پڑھ کر دل صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ کاشی بھیا اور باقی لواحقین کو صبر عطا کرے آمین۔ بے شک ہر کسی کے واپس پلٹنا ہے۔۔۔ زندہ وہ رہتے ہیں جو انسانیت کی خدمت کرتے ہیں، جیسے عبدالستار ایدھی صاحب،۔۔۔ بے مثال شخصیت، جس نے کسی مسلک کی بات نہیں کی، صرف اور صرف انسانیت کی باتیں، انسانیت کی خدمت۔۔۔ ہمیں ایسے کام کرنے چاہیے۔ منزہ سہام نے عید مبارک دی، بہت شکر ہے آپ بھی مبارک۔۔۔ احوال میں کاشی بھیا، بچپن کی یادوں کو تیسرے کر رہے ہیں۔ بچپن سبھی کا بے سول ہوتا ہے اسی لیے تو ابچ نہیں آتا، ہی کوئی اسے خرید سکتا ہے۔۔۔ بس یہ گزر جاتا ہے۔۔۔ بچپن جو ہوا۔۔۔ احوال سب کے سب اچھے تھے۔ کس کس کا نام لوں۔۔۔ کس کس کو سہرا ہوں۔ سب کو مبارک باد۔۔۔ جن لوگوں نے مجھے یاد کیا۔ اُن کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔۔۔ آپ کی نظم کمال کی تھی۔ آپ سوئے ضمیروں کو جھنجھوڑیں گے۔۔۔ مینا تاج کی وفات کا سن کر افسوس ہوا۔۔۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے آمین۔ کہانیوں میں ممتاز احمد اور مجید احمد جانی کی کہانیاں نہ پا کر دل مرجھا سا گیا۔ ان کی تحریریں پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ نئے چراغ، رشتے ناتے، کون سے فریاد، نہ خدا ملا نہ قسم منزل کہاں تھی، ہیرہ، نام بھی نہ رہے گا، قسمت، سلو پوائزن، سوئی، کیا لے جائے گا، آفیسر، استغنی، خزانہ اچھی کہانیاں تھیں۔ سلسلے دار ٹاول خوب چس رہے ہیں اور سفر نامہ بھی اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔

۵۹: پیارے بھائی! سچ کہا زندہ وہ رہتا ہے جو دوسروں کے لیے جیتا ہے۔ خدا سب کو حقوق العباد ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) تبصرہ اچھا کیا تم نے۔

۶۰: کنزہ ملک، قاسم پور کالونی، ملتان سے ہمارے ساتھ ہیں، لکھتی ہیں، سنائیے کیسے ہیں سب، عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ اب دیکھیں ناں۔ سچی کہانیاں کا سرورق ہی بھی شرارتی سا لگا۔ منزہ سہام عید مبارک

مبارک باد

حجی کہانیاں کے سابق ایڈیٹر ناصر رضا ماہ رمضان میں ماشاء اللہ ایک پیارے سے نواسے کے نانا جان بن گئے ہیں۔ اور وہ ان کو دائمی خوشیوں کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ نومولود کی محنت اور ہر ازی عمر کے لیے بھی دعا گو ہے۔

کہہ رہی ہیں، خیر مبارک، ست مبارک، احوال میں کاشی بھیا بچپن کی یادیں شیر کر رہے ہیں۔ محاسن لبوں میں غنود کر آئی ہے۔ مسکراتے لبوں کے ساتھ، جھملائی آنکھوں کے ساتھ سب ایک دوسرے سے عید مل رہے ہیں۔ کاشی بھیا صدارت کی کرسی کو منصبی سے قابو کیے ہوئے ہیں اور سب کو یک تک دیکھ رہے ہیں۔۔۔ یوں استاد کے عہدے پہ مسلط ہیں اور احوالیوں کو سنوار رہے ہیں۔۔۔ کسی کے کان تو کسی کی ناک ان کے ہاتھ میں ہیں اور حکومت نے فارمولا لاگو کیا ہوا ہے (مار نہیں ایپار) یعنی پیار سے مار۔۔۔ تو کاشی بھیا اجازت ہے کھلی اجازت۔۔۔ آویہ دنیا فانی ہے سب نے چلے جاتا ہے، کاشی بھیا پھوپا جان کی وفات کا سن کا ڈکھ ہوا۔ جن دوستوں نے مجھ نٹ کھٹی کو یاد رکھا، ان کو وارننگ ہے ہمیشہ یاد رکھیں۔۔۔۔۔ بھلا دو۔۔۔۔۔ گے۔۔۔۔۔ تو میں کیا کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔ بابا بابا۔۔۔۔۔ احوال کی پرستہ مخفل سے کہانیوں کی مگری میں سیر پائے کرنے لگی تو ہر کہانی ایک سے ایک بڑھ کر لگی، چند کہانیاں عام ہیں تھیں، شاز یہ گل کی خزانہ نے متاثر کیا، اسی طرح نہ خدا ملانہ قسم آپ بیگم سوئی، زربخت اور شب گل بہت اعلیٰ تحریریں تھیں۔ نام بھی نہ رہے گا، رشتے ناتے، کون سے فریاد بے مثال تحریریں تھیں۔ زہر عشق ڈرائی، دھمکانی آگے کو بڑھ رہی ہے، دیکھو ہوتا ہے کیا۔۔۔؟ جرم کہانی بھی خوب رہی۔۔۔۔۔ مستقل سلسلے بھی ٹھیک چل رہے ہیں۔۔۔۔۔ لوجی پورے کا پورا رسالہ عید کی چھینوں میں ہضم کر لیا اب کوئی پھنکی دینے نہ چل پڑے۔

۱۵: پیاری کزنہ خدا تمہیں اسی طرح ہستی مسکراتی رکھے (آمین) تبہ اچھا کیا۔
۱۶: ایم اے راجیل، ملتان سے عرض گزار ہیں۔ ماہ جولائی 2016 کا حجی کہانیاں، عید مبارک دینا ملا۔ ماشاء اللہ سرورق خوبصورت ہے۔ ادارہ میں منورہ بیہام، سبھی کو عید مبارک دے رہی ہیں۔ احوال میں کاشی بھائی بچپن کی یادیں لیے حال کے حالات سے سنجیدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پاک اور شہ وطن میں امن قائم کر دے آمین۔ چند لوگوں نے مجھے یاد رکھا، بہت شکریہ نوٹزش۔۔۔۔۔ احوال کی جھٹک نئے اور پرانے احوالیوں سے چٹ رہی تھی۔ کچھ بہت پرانے بھی لوٹ آئے ہیں جیسے عبدالعزیز بی، آ، شاز یہ گل صاحبہ۔۔۔۔۔ بیگم۔۔۔۔۔ ابھی کے تبصرے اچھے رہے مبارک باد اور کاشی بھائی آپ کی قسم بہت پسند آئی۔۔۔۔۔ آپ کے پھوپا جان محمد اقبال زمان کے سہیلی محمد زمان، مینا تاج، اور محسن وطن جناب عبدالستار ایدھی صاحب کی مغفرت کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ کہانیوں میں سوئی، خزانہ، ہیرو، نئے چراغ، رشتے ناتے، آپا بیگم، منزل کہاں تھی، نام بھی نہ رہے گا، کیا لے جائے گا، ملاپ اچھی کہانیاں ہیں۔ قسمت، میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں، سلو پوائزن عام سے کہانی تھی۔ زربخت اور شب گل بہترین کہانی تھی۔ ممتاز احمد کی کہانی شامل نہیں تھی، مینوں نابل ایک سے براہ کرایہ ہیں۔ کس کی تعریف کروں، کس کے قصیدے پڑھوں۔ سفر نامہ بھی اچھا چل رہا ہے۔ چھوٹے سلسلے بھی خوب ہیں۔

۱۷: پیارے راجیل تبصرے کا شکریہ۔ بس احوال سے غائب نہ ہونا اب۔

۱۸: ایم مجاہد حسین جانی، ملتان سے ہمارے ساتھ ہیں۔ لکھتے ہیں۔ میرے کزن نے کال کی کہ آپ کا خط حجی کہانیاں میں لگا ہے، یقین کریں دل باغ باغ ہو گیا۔ اپنی تحریر شائع ہونے کی وہ بھی پہلی تحریر بڑی

خوشی ہوتی ہے۔ میں بھگم بھاگ ممتاز آباد مارکیٹ گیا اور چچی کہانیاں لے آئیا۔ اب چچی کہانیاں میرے ہاتھوں میں پڑا مجھے دیکھ کر جا رہا ہے۔ ساری کہانیاں پڑھ لی ہیں اور احوال بھی۔ احوال کی محفل میں نیا ہوں سو کسی سے پہلو ہائے ہے نہیں۔ البتہ میری برادری کے مجید احمد جانی ہیں تو بڑے لکھاری ہیں، عمدہ لکھتے ہیں۔ اور میرے ملتان سے ہیں۔ کبھی ملاقات بھی ہو جائے تو مزہ آ جائے۔ سرورق پیار ہے۔ ادارہ یہ منزلہ سہام، عید مبارک کہہ رہی ہیں۔ احوال میں کاشی بھائی ہیں۔ محفل میں ساری رونقیں انہی کے دم سے ہیں۔ کہانیوں میں استغنیٰ، فیئر، چینی نہ کوئی سندیس، خزانہ، انصاف کون کرے گا، ملاپ، ایک منٹ میں سکینڈ، سلو پوائزن، سوکھی، سننے چراغ، رشتے ناتے، لائف بوائے، اکمال تحریریں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی تحریریں بھی اچھی رہیں، تیرنیم کش، اس کے ساتھ ہی اجازت۔

بھلا: لو پیارے! تم اس بار بھی چچی کہانیاں میں شامل ہو! خوش ہو جاؤ اور اب خوشی میں کہیں اگلے ماہ

احوال میں آنا ہی نہ بھول جانا۔

ملک علی رضا شاکر کالونی فیصل آباد سے لکھتے ہیں۔ ”آج عید کا چوتھا دن ہے اور فیصل آباد میں مسلسل آج بھی بارش ہے مگر اس موسم میں چچی کہانیاں کا ساتھ ہے۔ لیجئے: دو ماہ کے طویل عرصے کے بعد پھر سے ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ یقیناً میری کمی محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔ (یہ کیسے سوچ لیا تم نے پیارے!) آخر اسے پیارے پیارے لکھنے والے سنے قاری جو میدان میں آگئے ہیں ایسے میں بھلا کون ہمیں یاد رکھتا ہے۔ سب سے پہلے تو جی چچی کہانیاں کے کیے بعد دیگرے مسلسل خاص نمبر شائع کرے پر مبارکباد، یقیناً مابے طویل کہانی نمبر شماروں کی ایک ایک تحریر پسند آتی ہے۔ تمام لکھاریوں کو مبارکباد، اپنی خوب صورت تحریریں لکھنے کے لیے۔ سرورق پر ایک مسکراتی حسینہ نظر آئی۔ حمد و نعت کیا خوب تھیں۔ ادارہ سے اخلاقی سبق کی کڑ میں سمیٹیں۔ چچی کہانیاں کے دیرینہ ساتھی کافی محنت کر رہے ہیں۔ ممتاز احمد کی تحریر ”پکوز بے گرم“ سبق آموز تھی۔ ”اشارہ“ بھی اچھی کاوش تھی سلیم صاحب کی۔ حاتمہ مجید کی کہانی ”ٹرین دہاں بھی ملے گی“ ساثر کن تھی۔ اسماء اعوان آپ کی تحریر اچھی ہوتی ہیں۔ خطوط میں نوزیہ فرید احمد، افضل آزاد، ملک عاشق حسین، شامکہ شہزادی، محمد شعیب، ریاض حسین شاہد، مجید جانی، رانا حبیب الرحمن کے تبصرے بہت اچھے تھے۔“

بھلا: پیارے بھائی علی رضا! تبصرے کا شکریہ۔ کبھی یہ نہ سوچنا کہ ہم تمہیں بھول گئے۔ ہم سے محنت کرنے والے ہمیشہ ہمارے دل کے قریب رہتے ہیں۔ آپ سب کا تبصرہ ہمارے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔ کراچی سے بہت دنوں بعد ہمیں یاد کیا ہے ہماری بہت پیاری آنٹی نفیسہ فضل نے لکھتی ہیں۔ ”کافی عرصے سے لکھنا چاہتی تھی احوال میں، آخر کچھ اپنے دل کی سنانا چاہتی تھی مگر خرابی صحت اور کچھ مصروفیات کی بنا پر تاخیر ہوئی دو ماہ سے چچی کہانیاں پڑھ نہیں سکی اس لیے تبصرہ نہیں کر رہی مگر ایک بات ہے کہ میں چچی کہانیاں کی قاری 1996ء سے بنی اور لکھاری بنی 1999ء سے۔ اس وقت پرویز بلکرای صاحب تھے انہوں نے میری بہت بہت افزائی کی پھر تو مجھے لکھنے کا حوصلہ ہوا۔ 70ء سے میں نے اخبار جہاں میں تین عورتیں تین کہانیاں میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ہاں تو بات تھی چچی کہانیاں کی پھر ناصر رضا بھیا آئے تو چچی بات ہے پرچے میں مزید لکھا آگیا۔ لکھا کیوں نہ آتا سہام مرزا صاحب مرحوم، دانش دیردی صاحب مرحوم اور دیگر اصناف کی بہترین کاوشوں سے پرچہ دن بدن مقبول ہوتا گیا۔ اس کے بعد کے ایڈیٹر حضرات تو یوں آئے یوں گئے جیسے چند کرکٹ کے کھلاڑی۔ جب سے باگ دوڑ چچی کہانیاں کی منزلہ بنی اور بیٹے کاشی کے ہاتھ آئی ہے پرچے کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ میری کزنز اور بھابی جن سے بھی میں مانگ کر پڑھتی تھی دیوانی ہیں

سچی کہانیاں کی۔ کہتی ہیں جب سے کاشی چوہان آئے ہیں کہانیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ہر موضوع ہمیں اس میں ملتا ہے، نیز یہ کہ پراسرار نمبر اب تین آتے ہیں پہلے صرف ایک ہی ہوتا تھا۔ غزلیں اور اشعار بھی اچھے اور معیاری ہوتے ہیں۔ غرض مجموعی طور پر سچی کہانیاں آپ کی اور منزلہ بیٹی و دیگر اسٹاف کی کاوشوں سے لا جواب ڈائجسٹ ہے جو مرد و خواتین میں مقبول ہے۔ میں انشاء اللہ ایک کہانی جلد بھیجوں گی۔ میری طرف سے آپ کو منزلہ بیٹی، ارخسانہ بھابی و دیگر اسٹاف کو عید مبارک۔ تمام احوالیوں کو عید مبارک۔

☆ بہت پیاری آنٹی! اتنی محبت کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ آپ کی صحت کے بارے میں دل پریشان رہتا ہے اور یہ دعا میں بھی لبوں پر رہتی ہیں کہ خدا ہمارے بزرگ اور محبت کرنے والوں کا سایہ تابندہ سلامت رکھے، (آمین)۔

جناب: جناح کالونی فیصل آباد سے احوال میں یہ آمد ہے ہماری بہن بشری کنول کی، لکھتی ہیں۔ ”ایڈیٹر صاحب تمہیں کے پھوپھا طالب حسین، اقبال زمان کے بہنوئی محمد زمان اور مینا تاج نے داعی اجل کو لبیک کہا اور یہ خاک ہوئے۔ اللہ جل شانہ مرحومین کی قبروں کو جنت کا باغ بنائے۔ ان کی مغفرت و بخشش فرمائے، لواحقین کو صبر عطا فرمائے آمین۔ آپ نے احوال میں نہ صرف میرا خط شائع کیا بلکہ بہن بھابی کے رشتے میں پرہیزگار خوش آمدید کہہ کر میرا دل جیت لیا۔ مجھے بہت خوش ہوئی۔ آپ کا بے حد شکریہ۔ آپ نے بہن کہا ہے تو اب آپ کی یہ بہن احوال میں حاضر ہوتی رہے گی۔ جولائی کا شمار میرے ہاتھوں میں ہے۔ تاہم بہت شاندار ہے پسند آیا۔ برقی کردانی کرتی ہوئی احوال میں بخوبی جہاں خطوط کی تعداد کافی ہے جو کہ ڈائجسٹ کے اتنے معیار اور مقبولیت کا ایک ثبوت ہے۔ سب احوالیوں نے اچھے خط اور تبصرے لکھے۔ میں نے ایک خاص بات نوٹ کی ہے وہ یہ کہ احوال میں محبت اور خلوص کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے لیے عزت اور احترام کے جذبات نظر آتے ہیں جو بہت اچھی بات ہے۔ اب آنی ہوں کہانیوں کی طرف لائف بوائے کچھ نیا کر دکھائے بے مثال کہانی تھی۔ یہ کہانی پڑھ کر اب تو میں نے بھی لائف بوائے شیپو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ سنے حیران رشتے ناتے، سب مایا ہے، کون سنے فریاں، نام بھی نہ رہے گا، آپا بیگم، سچی اور کیا لے جائے گا سیر ہٹ اور اول نمبر کہانیاں تمہیں۔ جاوید راہی کی آدھی سب کچھ بہت شاندار رہی۔ اب میں دو کہانیاں پر اپنے کچھ تاثرات شیئر کرنا چاہوں گی وہ یہ کہ فیصل ندیم بھٹی نیا اور نوا موزیکھاری ہے ان نے اپنی کہانی نہ خدا ملانہ وصال صنم کا آغاز تو اچھا کیا مگر اختتام بہتر نہیں تھا۔ وہی روایتی انجام۔ بہر حال اچھی کوشش تھی۔ کہانی اچھی تھی۔ شاہد رفیق سہوے ایک حساس موضوع پر ایک درس اور نصیحت کا پیغام دیتی سلو پوائزن تحریر کی۔ یہ بالکل سچ جب نوجوان شہناز نایب عورتوں کے نرسے میں آتے ہیں تو وہ پھر عقل و خرد کھد دیتے ہیں۔ مختصر کہانیوں میں زربخت اور شب گل، سوروپے کا نوٹ، بازی، استعفیٰ اور چٹھی نہ کوئی سندیس بہتر کہانیاں تھیں۔ مصنفین کی اچھی کاوش تھی۔ صائمہ بشیر کا کلام عید کا جاند بہت اعلیٰ تھا علاوہ ازیں ہائینڈ پارک میں محمد قاسم خان بلوچ اور عمار و ناز کا کلام بھی شاندار تھا۔ اب تک کے لیے بس اتنا ہی اب ستمبر کے شمارے میں ملاقات ہوگی۔ سب کی سلامتی۔ خیر و عافیت، صحت تندرستی کی دعا کے ساتھ اجازت۔“

☆ پیاری سی بہن بشری! تم نے تبصرہ لکھ کر محبت کا حق ادا کر دیا۔ ہمیں اسی طرح ہر ماہ تمہارا بھرپور تبصرہ چاہیے۔

☆ غزالہ کرن کی ایک زمانے بعد جھنگ روڈ فیصل آباد سے آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ”ڈیڑھ سال کے بعد احوال کی محفل میں شریک ہوں۔ ایک طویل عرصے سے سچی کہانیاں کی ریگورقاری ہوں۔ اب بہت جلد اپنی کچھ تحریریں اور کلام ارسال کروں گی۔ امید ہے کہ اشاعت کے ساتھ حوصلہ افزائی کریں گے۔ مینا تاج کی

سانحہ ارتحال

گزشتہ ماہ ہمارے لکھاری عبدالغفار عابد کی والدہ، حمیم جو نیو اور زرینہ جو نیو کی بڑی بھانج اور مور شاہد حسین کی دادی اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ادارہ دکھنا ان گزریوں میں ان کے ساتھ ہے اور مرحومین کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

موت کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ آپ کے پھوپا اور اقبال زمان کے بہنوئی کی مغفرت فرمائے۔ جولائی کے شمارے میں شائع کہانی ”کسے الزام دوں“ پر بات کروں گی۔ کیا پورے شہر میں صرف ایک ہی ڈاکٹر تھا جس سے ناظم علاج کروا رہا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی کہ آرزو کو اس نے بتانا بھی گوارا نہ کیا اور جھٹ پٹ طلاق دے دی۔ راشد لطیف کی کہانی ”انصاف کون کرے گا“ آج سے تین ماہ قبل ایک شمارہ میں صفحہ نمبر 223 پر ”منتظر“ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ لائف یو آئے کچھ نیا کر دکھائے Excellent Story تھی۔ ”نئے چراغ“ ایک انوکھی اور خوب صورت کہانی تھی۔ رشتے ناتے سب مایا ہے، دولت کے پجاریوں پر مبنی داستان حق تھی جن کے نزدیک خونی رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ”دون“ نے فریاد ”زبردست رہی۔“ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم“ ایک سبق آموز کہانی تھی۔ ”سلو پوائزن“ ایک چونکا دینے والی کڑوی حقیقت پر مبنی کہانی تھی۔ ”قسمت“ بن گزرا رے لائق کہانی تھی اس نام پر کی کہانیاں بہت بور کرتی ہیں۔ پلیز ایسی کہانیاں شائع نہ کیا کریں۔ پور کرتی ہیں۔ ”سوئی“ میں معاشرے میں پھیلے کچھ گند کو اجاگر کیا گیا ہے۔ رہینہ جیسی عورتوں کے منہ پر ایک پتھر ہے۔ کیا لے جائے گا۔ آدھی سہاگن، ملن نام بھی نہ رہے گا اور ایک منت نہیں سیکنڈ متاثر کن کہانیاں تھیں۔ اب اجازت چاہوں گی۔

بھلا: پیاری غزالہ جی! غصہ تھوک دیجیے۔ آپ کا تبصرہ قطع برید کے بعد شامل اشاعت ہے۔ اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

بھلا: ہماری شاعری بہن عمارہ ناز کمالیہ سے عرض کرتی ہیں۔ ”دل سے شکر پڑا ادا کرتی ہیں کہ آپ نے میرے کلام کو سچی کہانیاں کے قیمتی صفحات میں جگہ دی۔ منزہ باجی نے تمام بڑھنے والوں کو عید کی مبارک باد دی، بہت بہت شکر یہ۔ خیر مبارک۔ احوال میں شامل تمام خط بہت اچھے تھے۔ محبتیں اور خلوص خوب چھلک رہا تھا۔ اللہ سب بخیر رکھے۔ جولائی کا شمارہ خوب رہا۔ کہانیوں میں اقبال بانو کی لکھی ہوئی کہانی ”نئے چراغ“ دل میں اتر گئی۔ ”رشتے ناتے سب مایا ہے“ غضب کی اسٹوری تھی۔ ”کون سے فریاد“ نجم ناز صفر نے بہترین کہانی لکھی۔ فیصل ندیم بھٹی نے ”نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم“ اچھی کہانی لکھی۔ شاہد محمود مغلی کی لکھی کہانی ”نام بھی نہ رہے گا“ ایک عورت کی مظلومیت کی داستان تھی۔ منصور احمد بلوچ کی لکھی کہانی ”قسمت“ اس طرح کی Same کہانی کچھ عرصہ پہلے ایک اور رسالے میں پڑھ چکی ہوں۔ شاہد رفیق کی لکھی ہوئی کہانی ”سلو پوائزن“ میں شہناز جیسی عورتوں کے گندے کردار سے پردہ اٹھایا گیا۔ سنبل نے ”سوئی“ لکھ کر لفظ کتیا کے بارے میں کمال کا لکھا۔ جاوید راہی صاحب نے ”آدھی سہاگن“ کے نام پر ایک اچھوتی کہانی لکھی۔ سورہ پے کا نوٹ، بازی گر، اسٹوری، چنپی نہ کوئی سندیس اور خزانہ اچھی کہانیاں تھیں۔ ”ہائینڈ پارک“ میں محمد قاسم خان بلوچ کا کلام بہت اچھا تھا۔ پسند آیا۔ اب اجازت چاہوں گی۔ رب را کھا۔

بھلا: پیاری بہن عمارہ! خوش رہو، تم نے تبصرہ بہت اچھا کیا۔ پرچے پر رائے آپ کا حق ہے مگر معیار طے کرنا ہمارا کام ہے۔ ہمیں اپنا کام کرنا آتا ہے بے جا تنقید ماحول خراب کرتی ہے۔

بھلا: کوٹ مومن سے یہ آمد سے ہماری بہن فرزانہ گل کی۔ لکھتی ہیں۔ ”آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ

آپ نے میرے چند نوٹس پڑھوئے الفاظ جو کہ خط کی شکل میں تھے کو بھی کہانیاں کی ریت بنایا اور ناچیز بندی کو ویکلم کہا۔ آپ کا خوش آمدید کہنادل میں اتر گیا۔ جی بھائی! اب احوال میں حاضر ہوتی رہا کروں گی۔ یہ آپ کی بہن کا وعدہ ہے۔ خط کے آغاز میں تمام مرحومین کی بخشش و مغفرت کے لیے صدق دل سے دعا گو ہوں۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ احوال میں بہت رونق تھی سب احوالی اپنے خوب صورت خیالات اور جاندار تبصروں کے ساتھ محفل میں براجمان تھے۔ خاص طور پر سید ملازم حسین شیرازی، عمارہ ناز، ایم اے راحیل، صائمہ مجید نے بہت اچھے تبصرے رقم طراز کیے۔ مجموعی طور پر جولائی کا شمارہ انتہائی زبردست رہا۔ چند ایک کہانیاں چھوڑ کر باقی تمام کہانیاں بہت شاندار رہیں۔ جن میں نئے چراغ، رشتے ناتے، سب مایا ہے، کون سے فریاد، نہ خدا ہی ملانہ وصال صنم، ہیرو، نام بھی نہ رہے گا، آیا بیگم، ملن، سوئی، سلو پوائزن، کیا لے جائے گا اور آدمی سپاگن بلاشبہ شمار سے کی بہترین اور لاجواب کہانیاں تھیں۔ بازی گر، استغنیٰ، چٹھی نہ کوئی سندیس اور خزانہ بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ پلیٹ فارم کہانی ”ملاپ“ پسند نہیں آئی۔ کاشی بھائی اگر میں بھی طبع آزمائی کروں اور کوئی کہانی لکھ کر بھیجوں تو کیا آپ شائع کریں گے؟

بھئی: اچھی بہن! سب سے پہلے تو تبصرے کا شکریہ اور ہاں تحریر بھیجنے کے لیے اجازت کیسی؟ تحریر قابل اشاعت ہوگی تو شائع ہو جائے گی ورنہ مزید محنت کیجیے گا۔

فلک صفدر عباس اعوان ماشاء اللہ ہمارے سلطان کہانیاں لکھتے ہیں۔ ”آداب! کہتے ہیں خط لکھنے میں کیا ہے۔ قلم اٹھاؤ اور لکھی لکھی رکھے بنا جو بھی دل میں آئے صفحہ قرطاس پر نکھیر دو لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں ہوتا کسی ایسے رسالے میں جہاں بات مختصر کرنی اور شگفتگی بھی برقرار رہے اس پر کاشی بھیا کی ایڈیٹنگ کی فینچی بھی منتظر نگاہ ہو۔ تو بے چارہ خط مشن ایسوسی ایٹس بن کر رہ جاتا ہے۔ اس بار بھی ٹائٹل پر پہلی نظر پڑتے ہی الفاظ نے خود بخود قطار بنانا شروع کر دی۔ نھندی دوپہر کو رسالہ ہاتھ لگا۔ کیونکہ موسم کالی ایر آلود اور ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ تو جناب ہم بھی مصنوعی ٹھنڈک کو خیر آباد کہہ کر قدرتی خوشگوار غم ہوا کے سنگ رسالہ ہاتھ میں تھامے اپنے باغات کی طرف نکل پڑے ہوئے جہاں تازہ دانی بھرے تالاب کے پاس جہازی سائز کری پر براجمان ہو کر رسالہ پڑھنے کی ابتداء کی۔ ٹائٹل گرل نشلی آنکھوں، گھنی زلفوں اور گلابی رخساروں والی ہونے کے باوجود بھی حسینہ عالم کہلائے جانے کی حق دار نہ تھیں۔ ہمیں تو لگا کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم سے اپنی تعریف اگلوانا چاہ رہی ہو لیکن ہم نے بھی ڈھیت بن کر کوئی خاص رسپانس نہیں دیا (ڈھیت تو تم کے ہو) رسالہ کھولتے ہی بادل نخواستہ یکساں اشتہارات سامنے آ گئے۔ جلدی سے احوال شہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ سدرہ صاحبہ کی بیماری کا سن کر اچھا نہیں لگا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو کر احوال میں اپنی باقاعدگی اور جامع انداز تبصرہ کو جاری و ساری رکھیں۔ ویسے صح معنوں میں احوال کی ملکہ بھی مس سدرہ صاحبہ ہی ہیں کیونکہ میڈم تحسین جو نوجو صاحبہ کے خطوط میں اب وہ دلکشی چاشنی ناپید ہوئی جا رہی ہے جو پہلے تھی۔ انکل ممتاز احمد، شاہد حسین، حنا بشری اور مجید احمد جانی کو بھی سلام۔ نئے قارئین میں نزابت افشال آپ کا نام بہت اچھا ہے۔ باقی خط جلدی لکھ کر عید کی چٹھیوں کی وجہ سے جلد ہی پوسٹ کرنے پر کوئی بھی کہانی نہ پڑھنے کی صورت میں تبصرہ گول۔ ”ہائیڈ پارک“ سلسلہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں میری تحریر ”ودتی کہتے ہیں جسے“ لگانے کا شکریہ۔ پراسرار نمبر میں اپنی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ آخر میں جاتے ہوئے ہماری طرف سے سب قارئین کو عید کی ڈھیروں ڈھیر مبارک۔ بجلی کی آنکھ مچوئی کی

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤلز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے ایچ پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

خواتین کی محبوب قلم کار

رفعت سراج کا ناول ”دام دل“

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے لطف سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

”دام دل“ دو شیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

”دام دل“ کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی اور جب

محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو.....

”دام دل“ کہانی ہے اُس ماں کی جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی

رویوں نے سولی چڑھا دیا

”دام دل“ کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریمہ چہروں

سے نقاب اُتارنے والوں کی

”دام دل“ کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی جن کی

ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول ”دام دل“

آئیے کہ اپنے ماہنامہ ”دو شیزہ“ ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

وجہ سے اور چار جنگ کی ڈم لائٹ میں رائے کو کچھ اور لکھنے سے قاصر ہوں۔

بھائی صغیر! تم ہر بار کہانی لکھ کر کہتے ہو یہ کہانی چھاپ دیں، یہ میری آخری کہانی ہے، میں یہ رسالہ چھوڑ رہا ہوں! افسوس! آپ اپنے ہر خط میں تبصرے کے علاوہ سب کچھ لکھتے ہیں؟ کیوں؟ آپ پرچہ لیٹ کر پڑھیں یا بیچ کر؟ آپ کی مرضی..... سانوں کی؟؟؟ خوش رہو! امید ہے برا نہیں مانگے ہماری سرزنش کا۔

ابنا: نسیم سحر، کراچی سے۔ "بہت اچھے کاشی بھائی اور منزہ صاحب! رمضان کا بابرکت مہینہ اب رخصت ہوا چاہتا ہے اور عید بس آنے کو تیار ہے۔ یقیناً یہ اللہ کا انعام ہے جو وہ اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ حالانکہ بحیثیت مجموعی اب ہم اس انعام کے حقدار نہیں رہے۔ رمضان آتے ہی تقویٰ خوروں کی من مانیاں اٹھ، دہشت گردی جیسے ہماری پہچان بن کر رہ گئی ہے لیکن وہ "رحیم و کریم" پھر بھی نوازنا رہتا ہے یہ اس کی شان ہے خیر۔ آپ تمام لوگوں کو رمضان اور اب عید الفطر کی بہت ڈھیر مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ ہم سب پر ہمارے ملک پر اپنی رحمتیں جاری رکھے۔ ہم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ سچی کہانیاں اور دو شیزہ کے تمام اسٹاف کو عید کی ڈھیروں مبارک اور مدیران کرام کو خصوصی مبارک۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ بھی زندگی اور ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے، آمین۔"

بھائی سحر! خدا آپ کو بھی خوش رکھے۔ یہ تو بتائیں احوال میں بھر پور آمد کب ہوگی آپ کی؟؟
ابنا: سناں چنوں سے مہر پرویز وہ لو کی آمد ہے لکھتے ہیں۔ "سچی کہانیاں سے 1992ء سے ایک انجانا رشتہ ہے۔ اس کو پڑھنا شروع کیا، اس محفل کے سرسید جناب سہام مرزا صاحب کی محبت اور رہنمائی سے تھوڑا بہت لکھنا شروع کیا۔ ابھی ٹھیک طرح سے قلم پکڑنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ وہ عظیم مہربان اپنے پیاروں کو بے یار و مددگار روتے بلکتے چھوڑ کر داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ بعد میں بڑے دھمی دل سے اس محفل میں کبھی کبھار شرکت ہو جاتی تھی۔ اس دوران کتنے ہی ایڈیٹر صاحبان آئے اور چلے گئے لیکن میرا ناٹری پین برقرار رہا۔ محترم جناب کاشی چوہان صاحب ایڈیٹر بنے لیکن میں ان کے معیار کے مطابق نہ لکھ سکا۔ ایک دفعہ خط نما تحریر کی گئی۔ جو کہانی یہ بتی تھی اس وجہ سے میں نے کاشی چوہان صاحب سے سخت لہجے میں بات کی۔ لیکن یہ میری غلطی اور زیادتی تھی۔ میری اس حرکت اور سوچ سے ان کا دل دکھا۔ میں اس زیادتی پر ان سے معذرت خواہ ہوں۔ جو بھی لفظ ان کی دل آزاری کا باعث بنے میں اس پر شرمندہ ہوں۔ یہ چند جملے لکھ کر ان کے دل کے دکھ کو کم کرنے کی کوشش ہے۔ زندگی کا پتا نہیں کسی موز پر جواب دے جائے بعد مرنے کے اگر کوئی دعا نہ دے تو بد دعا بھی نہ دے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

بھائی پیارے بھائی! سلامت رہو، تم نے کہا ہم نے سنا لیکن یاد رکھو حق کی کہو تو اثر بھی ہو۔ لکھنے والا اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے، ہمیں ہر ایک کو فیس کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے لیے سب ہمارے اپنے ہیں۔ ہمارے لیے تم ہی نہیں ہمارا ہر قاری اور لکھاری اہم ہے۔ خوش رہو۔

ابنا: ایم افضل آزاد، ساہیوال سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "ایک ماہ غیر حاضر ہونے کی معذرت۔ میں پاکستان سے باہر تھا تو غیر حاضر ہوا۔ سب سے پہلے منزہ سہام کا "کبھی تو ایسا ہو" کے بہت اچھے الفاظ تھے جو بازیاں ہوئے تھے۔ وہ ملک کے وزیراعظم کے یا گورنر کے بیٹے تھے نام پاکستانی کا بیٹا نہیں تھا۔ احوال میں بہت سارے نئے احوالیوں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید۔ سدرہ انور، شاہد حسین، آسیہ عنبر، عائشہ، آپی سنبل، فوزیہ فرید، ملک عاشق حسین، ساجد، محمد شعیب، صائمہ مجید، داد احمد خان نیازی آف بورے والا نے احوال میں بہت اچھا لکھا۔ اسٹوریز میں سب سے

زہر عشق اور بادبان

پیارے ساتھیو! پراسرار نمبر میں اس بار آپ کے ذوق مطالعہ کو مد نظر رکھتے ہوئے پراسرار کہانیوں پر ہی زور رہا اور صفحات کی شدید کمی ہو گئی۔ اس بنا پر اس ماہ آپ اپنے پسندیدہ ناول زہر عشق اور بادبان نہ پڑھ پائیں گے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ یہ دونوں ناول شمارے کا حصہ ہوں گے۔

پہلے "زہر عشق" کو پڑھا۔ بہت اعلیٰ کاشی بھائی آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ "زرد لومڑی" ایم اے راحت، "چوہے" غزالہ زہت، "ٹرین دہاں بھی" صائمہ مجید، "پکڑے گرم" ممتاز احمد، "اشارہ" سلیم اختر، "آنٹی صدف آصف"، "کورا کاغذ" ثمنہ فیاض، "کس نے کھیل کھیلا" شمس قمر، "کانٹا کھینچ گیا" جاوید راہی، "دیوانہ" سید عامر حسین، "بھارت میں بلیک لسٹ" محمود شام، "انجام محبت" زہت جمیں، "شیشہ عزت" اور پتھر" راحت دفا، "آزادی" شعیب بلوچ، "بادبان" نعمان اسحاق، "میرا دامن تارتار" سعید سیٹھی، "اشارہ" سلیم اختر ان سب کی اسٹوریز بہت اعلیٰ تھیں۔ اللہ کرے آپ اس سے بھی زیادہ اچھا لکھیں۔ "ہائینڈ پارک" حسین خواجہ، خضر حیات، مقصود بلوچ، راحیلہ بنت مہر علی، شاعرہ نوشاہہ نوش، جواد انور، کرن شہزادی، شعبان کھوسہ نے بہت اچھی معلومات دی۔ "تیرنیم کش" میں شاملہ شہزاد سلیمان شیر، سیدہ آسیہ عنبر، ملک عاشق حسین ساجد، شبانہ زمان کی شاعری بہت پسند آئی۔ نئی کہانیاں پلیٹ فارم نمبر بہت اچھا تھا۔ کاشی بھائی بہت محنت کرتے ہیں آپ نئی کہانیاں کے لیے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ میری دعا ہے اللہ آپ کو صحت بہت دیتی دے نئی کہانیاں کو دن دن ترقی دے، آمین۔ فضل آزادی کی طرف سے سب کو سلام اور دل کی گہرائیوں سے دلی عید مبارک باد۔

☆ پیارے افضل! ہمارا اجر تمہاری محبت ہے۔ احوال میں آمد اسی طرح برقرار رہتی چاہیے۔
☆ کراچی سے ہماری بہت پیاری آنٹی گہت غفار ہتھی ہیں۔ "اس ماہ یعنی جولائی کا رسالہ بک اسٹال سے منگوایا۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ میری کہانی شائع ہوئی ہے۔ شکریہ بیجا جی۔ خوش اور کامیاب رہو۔ زندگی کی ہر نعمت نصیب ہو، (آمین)۔ ماڈل اچھی لگی۔ پیاری منزلہ آپ کو اور اہل خانہ کو عید مبارک آپ سب کو ایسی ہزاروں عیدیں ایوں کے حصار میں منانا نصیب کرے، (آمین) کاشی بھائی آپ کے بیویا صاحب اور اقبال صاحب کے بہنوئی کے انتقال کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ "آپا بیگم" فیسو آصف کی کہانی بہت پسند آئی۔ منزل کہاں تھی۔ ملن، خزانہ، زہر عشق، نہ خدا ہی ملا، ساری کہانیاں اچھی لگیں۔ "ہائینڈ پارک" اور "تیرنیم کش" میں رضوانہ کوثر، مقصود احمد بلوچ، معادیہ عنبر، اسد اللہ، قاسم بلوچ، ثناء اللہ کے اشعار اور قطعات پسند آئے۔

☆ پیاری آنٹی! اللہ پاک آپ کی تمام پریشانیاں ختم کرے، تیرے کا شکریہ۔

☆ علی اصغر انصاری، جن آباد سے لکھتے ہیں۔ "تمام حلقہ ادب کو بہت بہت عید مبارک۔ چار جولائی کو تازہ شمارہ ملا۔ ایک طرف عید کی خوشی اور دوسری طرف تازہ شمارے کی خوشی۔ اپنا دل تو پھولے نہ سما۔ سرورق ہمیشہ کی طرح دیدہ زیب تھا۔ پہلے خط پر خواجہ حسین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ نے میرا شعر "تیرنیم کش" میں لگا یا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جو دنیا سے چل بسے ان کے لیے دعا ہے۔ کاشی بھائی آپ کی نظم بہت خوب تھی۔ اب اجازت۔"

☆ اچھے ٹلی اصغر! سلامت رہو بھیا بس ہر ماہ آپ کی آمد ہمیں چاہیے۔ آپ ہیں تو ہم ہیں۔

۷۸: شاد فیصل کا لونی کراچی سے یہ پہلی آمد ہے ہماری بہن غلطی یوسف زئی کی۔ لکھتی ہیں۔ ہمارے گھر تقریباً 15 سال سے سچی کہانیاں کارسالا آرہا ہے۔ پہلی بار میں نے کچھ لکھا ہے اور یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔ اس لیے آپ ضرور اسے شائع کریں اور ہم یوسف زئی پنچان ہیں۔ اس لیے تصویر نہیں بھیج سکتے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس بات کو نظر انداز کریں۔“

۷۹: ناچھی گڑیا! خوش آمدید! الو بھی احوال میں تو ہم نے تمہیں خوش آمدید کہہ دیا۔ اب ہر ماہ ہمیں اپنی اس بہن کا تبصرہ احوال میں نظر آئے۔ کہانیاں پڑھ کر جلد مطلع کر دیا جائے گا۔

۸۰: براوہ پلندی سے فرزانہ ٹہنت اپنے مختصر نامے کے ساتھ احوال کی رونق میں اضافہ کر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔

”بہت عرصے بعد حاضر خدمت ہو رہی ہوں۔ مصروفیات اور کچھ بیماریوں نے کچھ لکھنے کی مہلت نہیں دی۔ نہ سچی کہانیاں باقاعدگی سے پڑھنے کی۔ شمارہ جون کے تمام مضامین کہانیاں، سلسلہ وار کہانیاں عمدہ ہیں۔ ابھی کچھ پڑھنی باقی ہیں۔ بعد میں رائے دوں گی۔ آپ کو اور اراکین ادارہ کو عید جو کہ گزر چکی ہے پھر بھی بہت بہت عید مبارک قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو رو بہ عروج و ترقی رکھے۔ خدمت ادب و قوم کی توفیق عطا کرے، آمین۔“

۸۱: ناچھی بہن! سلامت باشد! آپ کی مختصر آمد بھی ہمیں قبول ہے مگر آمد مستقل ہو۔ کہانیاں جلد اشاعت پذیر ہوں گی۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے گا۔ اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

۸۲: جو کی لکھا سے یہ پہلی آمد ہے ناظم حسین شاہد کی۔ لکھتے ہیں۔ ”پیارے بھائی کاشی چوہان میں

احوال میں پہلی بار شریک ہو رہا ہوں۔ جناب ساحل و سمندر پر سب کا براہِ حق ہے اور سچی کہانیاں میرے

لیے کسی سمندر سے کم نہیں اس لیے میں بڑا پُر امید ہو کر خط لکھ رہا ہوں۔ سچی کہانیاں سے مجھے وابستہ کروانے

والے میرے کزن برادر خواجہ حسین ہیں۔ بھائی حسین نے مجھے جولائی کا شمارہ گفت کر کے اس پرے سے

متعارف کروایا ہے۔ سب لوگوں کے خط بہت زبردست تھے۔ کاشی، بھیا کی نظم میرے دل کو بھاگتی۔ کہانی

”باو بان“ نعمان اسحاق کی بہت اچھی لگی ”کون سے فریاد“ نجمہ ناز اصغر کی میرے لیے پسند آئی ہے اور اقبال بانو

کی تحریر ”نئے چراغ“ نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ سارے شعر مجھے اچھے لگے ہیں۔ اب اجازت۔“

۸۳: پیارے بھائی ناظم! خوش آمدید، لو تم اب بھی ہمارے احوالی بن گئے۔ بھیا اب ہر ماہ اپنی محبت اسی

طرح برقرار رکھتا۔

۸۴: روڈ تھل سے ہمارے پیارے احوالی خضر حیات عرض گزار ہیں۔ ”جولائی کا شمارہ ایک دوشیزہ کے

خوب صورت چمکتے، دیکھتے چہرے کے ساتھ چار جولائی کو مل گیا۔ ٹائٹل کی واہ کیا بات تھی۔ جب شمارے کی

ورق گردانی کی تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ بہت ہی عمدہ اور سپر ہٹ تھا۔ سب کی سب کہانیاں

بہت بہت ہی اچھی، زبردست اور سبق آموز تھیں۔ سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اقبال بانو،

عرفان حسین آصف، فیصل ندیم بھٹی، نجمہ ناز اصغر، جاوید راہی، محمد شعیب، راشد لطیف، عبدالغفار عابد، شاہد

محمود مغل ان سب لوگوں کی کہانیاں بہت ہی اچھی اور سبق آموز تھیں۔ ان لوگوں کی کہانیاں آج کل کے

حالات پر مبنی تھیں۔ عرفان آصف ویری گڈ بہت اچھا لکھا۔ پیارے کاشی صاحب سچ پوچھیے تو آپ نے عید

کا مزہ ہی دو بالا کر دیا۔ جولائی کا شمارہ آپ کی محنت، لگن اور محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میں ان لوگوں کا بھی

شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو میری شاعری اور تحریروں کو پسند کرتے ہیں اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

میرے اندر مزید سچی کہانیاں میں لکھنے کا جذبہ اور شوق بڑھ گیا ہے۔“

۸۵: پیارے خضر! تم لکھو اور خوب لکھو، خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ بس کامیابی محنت کرنے والوں ہی



میں کس جگہ
سچی کہانیاں

کے چرچے نہیں
آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو
نرمبادلہ پیجیے

اندرون ملک = 890 روپے

ہر ملک ہر شہر اور محلے میں دستیاب ہے

55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز	کویت
55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز	سعودی عرب
55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز	یو اے ای
55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز	مصر
55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز	یونان
55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز	فرانس
55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز	برطانیہ
55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز	ناروے
65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز	امریکہ
65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز	افریقہ

زرسالا

آج ہی رابطہ کیجیے II C-88 فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے قدم چومتی ہے۔

☆: ڈسٹرکٹ جیل کو باٹ سے ہمارے عزیز لکھاری، قاری ساتھی سید ملازم حسین شیرازی لکھتے ہیں۔
 ’جولائی کا شمار وصول پایا۔ بہت شکریہ۔ سب سے پہلے تمام قارئین، لکھاریوں، ایڈیٹر صاحبان، اسٹاف ممبران کو عید مبارک۔ شمارے نے حقیقتاً عید کی خوشیوں کو دو بالا کر دیا۔ سرورق، مونا لیزا جیسی ملکی مسکراہٹ، بکھیرنی اور کن اکھیوں سے نظر التفات دیتی دوشیزہ بہت بھلی لگی۔ کاشی چوہان آپ کے پھوپھا اور اقبال زمان کے بہنوئی کے انتقال پر تعزیت ہے اور صبر کی دعا ہے۔ مینا تاج کی بے وقت موت نے او اس کرویا۔“
 ”نئے چراغ“ از قلم اقبال بانو، ”خوبصورت“ موثر اور لا جواب داستان۔ ”نہ خدا ملانہ.....“ فیصل ندیم بھٹی کی اچھی تحریر تھی۔ ”ملاپ“ ضرغام محمود، سالوں بعد پچھڑنے والوں کا عجیب ملاپ۔ نیابت عمدہ۔ ”منزل کہاں تھی“ حسین جو نیجو عبرت پکڑنی بہترین کہانی۔ ”انصاف کون کرے گا“ راشد لطیف غربت میں پے خاندان کا دکھ بھرا انجام۔ ”خزانہ“ شازیہ گل کی نصیحت آموز کہانی تھی۔ ”آدھی سہاگن“ جاوید راہی ایسا جرم جو زندہ ہونے کے باوجود تحسین نگاہوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ بہت خوب۔ ”زر دلو مڑی“ شرلاک سونکر کے کسی ناول کے مقابلے میں زیر نظر سلسلہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ از قلم ایم اے راحت۔ ”باو مان“ نعمان اسحاق سلسلہ دلچسپ ہے۔ ”زہر عشق“ کاشی چوہان رات کو یا تنہا میں اگر داستان بڑھی جائے تو رو ٹکٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ”عشق سے نا آشنا“ مذکورہ داستان بڑھ کر یقین کریں گے کہ عشق انسانیت کی بنیاد ہے۔ ویل ڈن۔ مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، تیرنیم کش نہایت دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ باقی خوب صورت کہانیوں پر کچھ کہنا خط کی طوالت کا باعث بنے گا۔ معذرت خواہ ہوں۔ اب ”ذرا“ احوال“ کی طرف آتا ہوں۔ شمیمہ ناز کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ نزابت افشال، ممتاز احمد، ایم یعقوب احمدانی آپ کے خط اچھے لگے۔ سپاہی عاصم لعل، سچی کہانیاں سے مسلسل رابطہ رکھیں۔ ڈھول سپاہیا، اسد اللہ ساگی، ڈاکٹر خادم حسین کھیرا کے علاوہ باقی سب کے خط خط اور تبصرے لائق تحسین ہیں۔ آخر میں عرض ہے سچی کہانیاں پڑھ کر علم و معرفت کے ہر خرمن سے خوشہ چینی حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کی باہر اور شور و طلاطم سے دور فصیح البیان خزانہ علم عطا ہوتا ہے۔ ہر شمارہ قوس و قزح کے رنگوں میں رنگا ہوا۔ یاہ واٹھم کے اجالوں میں ڈھلا ہوا ملتا ہے۔ یہ علم داوب کی خدمت ہے۔ آپ سب احباب مبارکبادی کے مستحق ہیں۔“

☆: پیارے بھائی شیرازی! آپ جیسے پیار کرنے والوں کا تعاون ہمیں حاصل ہے تو کس طرح یہ قوس و قزح نہ سجے۔ سلامت رہے، تبھرہ زبردست رہا آپ کا۔

☆: احوال میں یہ پہلی بار حیدر آباد سے ہماری احوال کی رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ امیر حمزہ مری بلوچ لکھتے ہیں۔ ”پیارے بھائی آپ نے ماہ جولائی میں میری کہانی شائع کر کے جس طرح میری حوصلہ افزائی فرمائی وہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔ سچی کہانیاں ایک بہت معیاری اور اعلیٰ پائے کا پرچہ ہے۔ جس میں معاشرے کا ہر سچ نمایاں طور پر شائع کیا جاتا ہے۔ آج اس کی مقبولیت عروج کو چھو رہی ہے۔ ایم اے راحت، کاشی چوہان صاحب کے ناول بے مثال ہیں۔ دونوں ناول اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہر ماہ انتظار کراتے ہیں۔ اس بار اقبال بانو، عرفان حسین آصف، ریحانہ آفتاب احمد، کجیل میلو کی سچی کہانیاں باکمال تھیں۔ جب کہ شعلہ سامانیوں میں سنبل یازی لے گئیں۔ جاوید راہی ”آدھی سہاگن“ کمال لکھی۔ حکایتوں میں سیدہ عطیہ زاہرہ کی حکایت لازوال تھی جب کہ عبدالغفار عابد، سیماء عروج صدیقی، شیخ معظم الہی اور محمد اسماعیل بردہ نے بھی خوب لکھا۔ مرد کہانیوں میں محمد شعیب اور شازیہ گل کی کہانیاں اچھی لگیں۔

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں گھومے تجزیہ کار

محمود شام کی زیر ادارت

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

کراچی

اطراف

جولائی 2014ء سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا

بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین

☆ ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں، تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا
☆ دنیا بھر میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص
☆ پاکستان کے سیاست دانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں عالمی تحقیقاتی اداروں کی
بے لاگ رپورٹیں، آسان آزد وین
☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی او کی سرگرمیوں سے سجا عوام نامہ

☆ مصوری ☆ سفارت کاری ☆ کتابیں ☆ کامیاب زندگی ☆ فن تعمیر ☆ تندرستی
☆ پاکستان کے اخبار ☆ موسیقی ☆ ہم اور ہمارے بچے ☆ فلمز و مزاح ☆ اردو ادب سے انتخاب
☆ لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت ☆ نیوز ایجنٹس کو معقول کمیشن

جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے..... ماہ نامہ اطراف میں ہے

Ph: 0092 21 32274661

Mob: 0300-8210636

508، لینڈ مارک پلازا، آئی آئی چندریگر روڈ - کراچی

Email: mahmoodshaam@gmail.com Web Site: www.atraalmagazine.com

گھر کی مفت کاپی سٹیٹ نمبر 508 کے لیے ڈالئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

اگست 2016ء

کوین
برائے
احوال

نام:

بکمل پتا:



میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کر لیں۔

اگست 2016ء

کوین
برائے
اشاعت
کہانی

عنوان کہانی:

تعداد صفحات:

نام:

بکمل پتا:

فون رسیل نمبر:



میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اگست 2016ء

کوین
برائے
پسندیدہ
کہانی

اول، عنوان:

مصنف:

دوم، عنوان:

مصنف:

سوم، عنوان:

مصنف:

نام:

شہر:

WWW.PAKSOCIETY.COM

سچی کہانیاں

26

ضرغام محمود کی ”ملاپ“ بھی بہتر تھی مگر جو مزہ ممتاز احمد صاحب کی پلیٹ فارم کہانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ بات قطعاً نہ تھی۔ ”بادبان“ بہت عمدگی سے رواں دواں ہے۔ مستقل سلسلے زبردست ہیں۔ اچھا اب اجازت۔ میری کہانی پر آپ سب کی رائے کا انتظار رہے گا۔“

☆: پیارے بھائی حمزہ! خوش آمدید۔ تم نے اچھی کہانی لکھی تھی اس لیے شائع بھی ہو گئی۔ دوسری تحریر کب بھیج رہے ہو۔ اپنا خیال رکھنا اور احوال تمہارا منتظر ہے۔

☆: کوثری سے نئے نئے احوالی نعمان احمد آرائیں لکھتے ہیں۔ ”آپ نے میرا تبصرہ شامل احوال کیا اچھا لگا اور آپ نے میرا ادھر انتخاب درست کر کے ہائیڈ پارک میں شامل کیا اور آپ نے میرا دل خوش کر دیا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں اور تبصرے کی طرف آتے ہیں۔ تمام احوالیوں، کہانیاں اور ناول لکھنے والوں میں کاشی چوہان ایم اے راحت، مسئلہ یہ ہے میں باباجی، ہائیڈ پارک میں مراسلے انتخاب اور تیرنیم کش میں شعر لکھنے والوں کو سلام کہتا ہوں۔ جون جولائی کا ادارہ اور احوال۔ تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ احوال میں شامل ہونے والوں کو خوش آمدید اور سچی کہانیاں میں شامل تمام لوگوں کے لیے سلامتی، خوش حالی، تندرستی کی دعا اور جن کے عزیز واقارب اس دنیا سے فانی ہو چکے ہیں ان سب کے لیے دعائے مغفرت اب اجازت چاہتا ہوں۔“

☆: بھائی نعمان! وہ کون TCS والا تھا جو آپ سے اتنی تفصیلی گفتگو کر گیا۔ کبھی پیسوں کے لیے خط لکھا جاسکتا ہے؟ پیسوں سے خوشیاں خریدی جاسکتی ہیں؟ یہ پیسوں سے بس دکھ خریدے جاتے ہیں۔ ہم بھی تحقیقات کر رہے ہیں کہ وہ کون سی ایس والا تھا جس نے آپ کو نیاراستہ دکھایا۔ شکر ہے مالک کا کہ ہمارا اور قارئین کا ساتھ نصف صدی سے ہے۔

☆: منجن آباد سے ہمارے نئے احوالی ساتھی خواجہ حسین کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ”تمام حلقہ ادب کو سلام! شمارہ ہیشیہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا جریدے تو اور بھی بہت ہیں جن کے ساتھ میں منسلک ہوں لیکن سچی کہانیاں کا کوئی غائب نہیں۔ میری اولین ترجیح سچی کہانیاں کو ہی حاصل ہے۔ بھلا کاشی صاحب آپ کے پھوپھا طالب حسین کی وفات کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ جناب اقبال زمان کے بہنوئی کے لیے بھی دعا گو ہوں۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ جولائی کے شمارے میں میرے خط کو جگہ عنایت فرمائی۔ کہانی کے لیے اب مجھے اپنی باری کا بہت بے صبری سے انتظار ہے۔ کاشی بھائی شکر یہ۔ بہن شانہ نسیم کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سر ملازم حسین شیرازی آپ کا تبصرہ بہت شاندار تھا۔ میں آپ کے لیے دعا گو ہوں آپ کا ایل ایل ایم مکمل ہو جائے، آمین۔ کوٹ مومن سے بہن فرزانہ گل خدارا میری بات کا یقین کرنا میں دو سال تک سوچتا رہا کہ سچی کہانیاں کو خط لکھو یا نہ لکھوں۔ پھر ایک دن ول کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس یقین کامل کے ساتھ خط لکھا کہ یہ ضرور شائع نہیں ہوگا۔ ہائے افسوس میں واقف نہ تھا۔ سچی کہانیاں کی دریاوٹی ہے۔ کاشی صاحب کی عظمت کو سلام جو ہر بار میرے خط کی نوک پلک سنوار کر قابل اشاعت بنا دیتے ہیں۔ تمام بہن بھائیوں نے بہت خوب تبصرے کیے ہیں۔ بالخصوص بہن عمارہ ناز، بہن شازیہ گل اور بہن بشری کنول۔ بھائی مجید احمد جانی صاحب واہ کیا خوب تبصرہ تھا آپ کا۔ احسن ابرار رضوی، خالد یوسفی، ریاض حسین شاہد کے تبصرے مجھے بہت پسند آئے ہیں۔ اسد اللہ سانگی صاحب نے فرمایا ہے (سوچی وی نا) لہذا میں نے جناب کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا۔ اس ماہ اجازت، اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔“

☆: پیارے خواجہ حسین! لو بھیا! تمہارا تبصرہ ہو گیا شامل احوال۔ تبصرہ بھیج کر تم لوگ ہم سے سچی محبت کا اظہار کرتے ہو۔ خدا محبتوں کا یہ سفر جاری و ساری رکھے، آمین۔

نہایت افشال مہورہ فتح جنگ سے شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ ”اس ماہ کی تین باتیں قابل ذکر ہیں۔ (1) رسالہ ولنت پر ملا۔ (2) ماہ رمضان تھا اس لیے۔ (3) اس ماہ کی 19 تاریخ کو میرا بہت ہی عزیز شاگرد جمشید تھا پاکستان آرمی میں بھرتی ہو گیا۔ ایک غریب خاندان کا چشم و چراغ تھا مگر اپنی محنت کے سبب بڑھا اور آج اپنی منزل پر پہنچ گیا مگر یہ تمام خوشیاں غارت ہو گئیں جب پتا چلا کہ امجد صابری صاحب شہید ہو گئے۔ احوال میں سب اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ خصوصاً ثمنینہ ناز، مقصود احمد بلوچ، ممتاز احمد، ملک علی رضا کے تبصرے زبردست تھے۔ نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید۔ نعمان احمد، فرزانہ گل، سسر بشری کنول، اسد اللہ ساگی، سب کو بہت بہت خوش آمدید۔ ڈاکٹر خادم حسین صاحب اچھا تبصرہ تھا۔ سید ملازم حسین صاحب اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے کہانیوں میں رشتے ناتے، نہ خدا ہی ملا، منزل کہاں تھی، قسمت، سلو پوائزن، کیا لیا جائے گا، آفیسر، ایک منٹ میں سیکنڈ، ملاپ، زر بخت اور شب گل بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ ناول اور سفر نامہ بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ ہائیڈ پارک میں بھی اچھی تحریریں ملیں اور تیرنیم کش بھی خوب تھا۔ کچھ پرانے احوال غائب ہیں۔ دوستوں لوٹ آؤ سب کو سلام اور کاشی بھائی پچھلے خط کی طرح اس خط کو پیچی نہ دکھائیے گا، پلیز۔“

☆ پیارے بھائی نزابت تبصرہ اچھا لگا تمہارا۔ مگر تبصرے کے اندر پرچے سے ہٹ کر ایک حد تک بات بہتر لگتی ہے مگر..... سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے والا معاملہ ٹھیک نہیں۔ جن شخصیات کے بارے میں آپ نے لکھا ان کے بارے میں ہم سب بھی ایسے ہی جذبات رکھتے ہیں۔

☆ ثواب، بلوچستان سے زمانے بعد آمد ہے ہمارے بہت پیارے بھائی عمران مظہر کی، لکھتے ہیں۔ ”کیسے ہیں آپ سب، زندگی کی الجھنوں میں اس طرح پھنسنے ہیں کہ ہنسنے تک کی توفیق ختم ہو گئی ہے۔ خیر کافی عرصے بعد ڈائجسٹ پڑھے۔ بھائی آپ نے کہانیوں کا معیار بلند کر دیا ہے۔ میں مجبور ہو گیا ہوں آپ کو خط لکھنے پر دو باتوں کی وجہ سے۔ ایک تو آپ کا ذوق انتخاب اور ایک اقبال بانو صاحبہ کی مٹی میں شائع ہونے والی تحریر ”اک دیا جلتا ہے“ یہ تحریر پڑھ کر آنکھوں میں آنسو ٹھہر گئے۔ ایک کرم کر دیجیے گا کہ میرا تبصرہ اس بار کے پرچے میں شائع کر کے اقبال بانو صاحبہ تک میری تعریف پہنچاویں۔ اس کہانی کے ورد نے مجھے مجھ سے ملا دیا ہے۔ شکریہ کاشی بھائی۔“

☆ پیارے عمران! تمہاری تعریف اقبال بانو تک پہنچ گئی۔ تم غائب کہاں ہو گئے۔ محبتوں میں دوریاں غلط فہمیوں کو بھی جنم دے دیتی ہیں پیارے۔

☆ ہمارے بہت پیارے بھائی فیصل ندیم بھٹی چک 58 شمالی سرگودھا سے اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ”ماہ جولائی کا شمارہ تین جولائی کو ہی مل گیا تھا۔ ٹائٹل میں ماؤل ثقافت کی ترجمانی کر رہی ہے اور لبوں پر لب اسٹک لگائے عید مبارک کہہ رہی ہے۔ منزہ سہام مرزا کا ادارہ بڑا صاحب سے میلے عید الفطر کی مبارک باد قبول کی۔ کاش اگر ہم مسلمان ہر لمحہ اپنے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کریں تو ہم زندگی اور آخرت سنوار سکتے ہیں۔ احوال میں نئے آنے والے احوالوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جن میں نعمان احمد، فرزانہ گل، بشری کنول، اسد اللہ ساگی خوش آمدید اور میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ نور صبا، رمشا ملک صاحبہ کشمیر تو واقعی جنت ہے تو ہم بھی ویکہ نہ لیں۔ شازیہ گل واپس آنے پر خوش آمدید اور آپ کے امتحانات کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے، آمین۔ نزابت افشال، سید ملازم شیرازی صاحب، تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ مجید احمد جانی، ممتاز صاحب، ڈاکٹر خادم حسین کھڑا کے تبصرے بہترین تھے۔ سدرہ انور علی آپ مائی پیر کے ور بار پر جا کر حاضری ویں جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ عمارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

خسبہ کانیان

انتباہ!

معزز لکھاری حضرات سے گزارش ہے کہ ناقابل اشاعت کہانیوں کے بارے میں بحث و مباحثے سے اجتناب برتتے۔ کہانی بھیجتے وقت مسودے کی فوٹو کاپی اپنے پاس رکھیں۔ ناقابل اشاعت کہانیاں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ ادارہ تحریر کی واپسی کا ذمہ دار نہیں۔ امید ہے لکھاری حضرات تعاون کریں گے۔

ناز کا تبصرہ اور غزل بہت پسند آئی۔ ہماری ساسھی لکھاری اور سابقہ ایڈیٹر مینا تاج کی وفات کی خبر سن کر بہت دکھ ہوا۔ کہانیوں میں ”لائف بوائے“ کہانی کی کیا بات ہے۔ ”نئے چراغ“ اقبال بانو۔ علم تو ایک روشنی ہے کمال ہے۔ ”رشتے ناتے سب مایا ہے“ عرفان آصف کی زبردست کہانی ہے۔ ”کون سنے فریاد“ نجم ناز۔ ”منزل کہاں تھی“ تحسین جونجو۔ ہیرہ، نام بھی نہ رہے گا، قسمت مقصود بلوچ، ملین، سوئی، سلو پو اترن، کیا لے جائے گا، آدمی سہاگن کمال کہانیاں تھیں۔ ”بھارت میں بلیک لسٹ“ معلوماتی سفر نامہ ہے۔ زربخت اور شب گل، کسے الزام دوں، 100 روپے کا نوٹ بھی زبردست حکایتیں تھیں، پسند آئیں۔ اللہ، کاشی چوہان کے پھر پیا کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ جناب عبدالستار ایدھی صاحب بھی فانی دنیا کو چھوڑ کر آخرت کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ایدھی صاحب کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

☆ پیارے فیصل! خدا خدا کر کے تمہارا تبصرہ آخر مل ہی گیا۔ تبصرہ زبردست رہا۔ اگلے ماہ انتظار رہے گا۔

☆ ذیشان ریاض، فیصل آباد سے بڑے دنوں بعد ہمیں یاد کر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ جولائی کا شمارہ ملا۔ عید کی چھٹیوں کی وجہ سے لیٹ ہو گیا۔ موسم کی انگڑائیاں بادلوں کی انگلیلیاں حسن بڑھادیتی ہیں اس کا۔ عید کی خوشیاں سب قارئین کو اداس کر گئیں۔ عبدالستار ایدھی صاحب ہم سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مسکرت کرے۔ مینا تاج صاحبہ ہم سے جدا ہو گئیں۔ اللہ ان کے بھی گناہ معاف کرے۔ ملک علی رضا کو بھی کہانیاں میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ کہانیاں سبھی اچھی تھیں آدمی رومانوی آدمی افسانوی، ممتاز احمد صاحب

نا قابل اشاعت تحریریں

دھیہہ پردیز	کھلتے پھول مرجھا گئے
طالبہ داؤد	جی لگن
فیضان خورشید	(1) داغ تمنا (2) داستان ہجر
شاہد محمود مغل	درد کے جزیرے
مومینہ بتول	آسیب کدہ
انیلہ امام بخش	فلس کا غلام
نمر و محمد	ذرا سوچے
ملک محمد اکرم آہیر	(1) طوائف (2) پراسرار خوشبو
منعم اصغر	نارت کر

کی کمی محسوس ہوئی۔ عبدالعزیز جی آ کی والدہ کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔ جاوید راہی صاحب کی آدھی سہاگن زبردست رہی۔ محمود شام کے سفر نامہ ہند سے بہت معلومات میں اضافہ ہوا۔ مسئلہ یہ ہے نورین فیصل آباد کا خط شائع ہوا ہے۔ بہت دیکھی خط ہے۔ اللہ تعالیٰ نورین کو صبر دے۔ معاذیہ غبروٹو کے اشعار اچھے لگے۔ عظمیٰ شکور افسانچہ اچھا لگا۔ آخر میں سب کو بے حد سلام۔

بھائی ذیشان! احوال میں آئے اچھا لگا۔ حاضری مستقل بنالو تو زیادہ اچھا لگے گا۔

غزالہ زبیت فاطمہ کوئٹہ سے عید کارڈ سمیت احوال میں موجود ہیں کھتی ہیں۔ برسوں کی گردش کے بعد ایک بار پھر اپنی تحریر کو آپ کے مؤقر جریدے (شمارہ جون) کی زینت بننے دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ میں نے دوست احباب اور گھر والوں کو مٹھائی کھلائی (حالانکہ 17 اپریل کو میری سب سے چھوٹی ہمشیرہ کا انتقال ہو گیا تھا) آپ لوگوں نے مجھے وہ خوشی دی ہے جو کہ ایک قریب المرگ شخص کے حلق میں آپ حیات ثابت ہوئی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ یوم آزادی یا یوم دفاع کی مناسبت سے آپ لوگوں کو اپنی کوئی اچھی سی تحریر عنقریب ارسال کروں..... امید کامل ہے کہ حوصلہ افزائی ہوگی۔ پلیٹ فارم کے حساب سے لکھنے والوں کی تمام تحریریں پسند آئیں خصوصاً محمد سلیم اختر کی تحریر، اشارہ اور ممتاز احمد کی پکوڑے گرم نے خاصا متاثر کیا۔ لائف بوائے کے ذریعے کامیابیوں کا سلسلہ اس مشکل دور میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور خوش بھی کرتا ہے۔ رانا حبیب الرحمن کی آپ بیتی کا انتظار ہے۔

بی بی یار: آپ اپنی ہماری بھی دعا ہے کہ یہ ساتھ اب چھوٹے نہ پائے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور ہاں..... احوال میں اب آپ کی غیر حاضری بالکل قابل قبول نہ ہوگی۔

ساتھیو یہ تو تھے اب تک موصول ہونے والی خطوط۔ اس کے ساتھ ہی ہم آپ سے اجازت لیں گے، اگلے ماہ ان ہی صفحات پر پھر ملاقات ہوگی۔ اگر رب نے چاہا تو..... ارے اجازت سے پہلے تازہ ترین نظم آپ کی نذر۔

عبدالستار ایدمی کے نام

یہ کون ہو گیا ہے

نسل آدم سے بابا!!

یہ کیسا بدلہ لیا ہے

یہ معذور، مفلس، بے سہارا، مفلوج

تیرے بھولے میں پڑے ہیں..... اور

تو چل دیا ہے

خاک کا پیوند اوڑھ کے.....

دیکھو اے دنیا والو

بادشاہ سب کچھ ساتھ لے گیا ہے

ایدھی آج مر گیا ہے

مر کر امر خود کو کر گیا ہے

ہر شاخ سے لپٹا ہے سناٹا

ہر موڑ پہ چٹکی ہے خاموشی

شہر سارا ہی مر گیا ہے کیا؟

خالی رہ گئے درتچے

بند کوڑ پڑے ہیں

گلیوں، کوچوں، بازاروں میں

جسے کہہ سنا پھر گیا ہے

آوازوں کے شہر ناگہاں میں

باسی وقت ٹھہر گیا ہے

کیا ہو گیا ہے..... یہ سب کیا ہو گیا ہے

دیکھو دیکھو..... لوگوں کی بھیڑ کے پیچھے

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

لائف بوائے، مون سون میں بھی کا دکھائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں



بھگانے کا۔ نیوی پرائے سارے اشتہارات آتے ہیں ای۔ پلیز آپ کوئی شیمپو ہی لاویں نا۔“ اریبہ نے جیسے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔
”ارے میری گڑیا ایسی ٹوٹے دیر پا ہوتے ہیں اور یہ جو تم سب دیکھتی ہو نا اشتہار وغیرہ یہ سب کہنے کی حد تک ہی کی باتیں ہوتی ہیں کتنے سارے شیمپو تو استعمال کر لیے ہیں مگر نتیجہ..... وہی خشکی، ٹیکری اور بالوں کی بے روئی۔“ عندلیب اپنی بات پر قائم تھی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ سب کچھ کہنے کی حد تک کی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ کریں ان دیکھی نسخوں سے میرے بالوں کا مزید پیڑا غرق۔“ اریبہ رو دکھی ہوئی۔
”ارے دہن! چھوڑ دو معصوم کو، ساری خشکی آج ہی ختم ہو جائے گی کیا اس تیل وہی سے۔“ دادی ماں پوٹی کی گریہ زاری سن کر اپنے کمرے سے باہر آ گئیں۔

”ارے ہٹاؤ یہ سب چیزیں..... میری بچی کا کتنا سامنہ نکل آیا ہے۔ بھیا بڑی جلا دماں ہو۔ دیکھو تو چھپی کر کے میری بچی کا سارا خون ماتھے پر جمع کر دیا۔ آ میری گڑیا..... میری چھرا۔“ دادی اُسے پچکارنے

”او فوہ! ایک تو یہ مون سون جب آتا ہے نا ہمیشہ ہی ڈھیروں ڈھیروں بالوں کے مسائل میں الجھا دیتا ہے قسم ہے۔“ عندلیب بیٹی کے بالوں میں تیل میں وہی ملا کر سماج کر رہی تھی۔
”ای آرام سے کریں، اتنی تیزی سے آپ ہاتھ مار رہی ہیں سر پر۔ میرا سر بجائے سکون کے ٹھنٹھے لگا ہے۔“ اریبہ ماں کی ایسی محبت سے ٹک کر سر پکڑتی ہوئی بولی تھی۔

”میری شہزادی تو تم بارش میں کیوں نہانے کھڑی ہو جاتی ہو۔ دیکھو بالوں کا حشر کیا کر دیا تمہاری لا پرواہی نے۔“ عندلیب نے اب اُس کے سر پر تیزی سے چھپی شروع کر دی تھی۔

”مجھے نہیں کرانی یہ مشقت آپ سے، بس میں اٹھ رہی ہوں۔“ اریبہ نے منہ بسورنا شروع کر دیا۔

”خبردار جو تم یہاں سے ذرا بھی ملیں تو..... چپ چاپ بیٹھی رہو۔ دیکھو تو بھلا خشکی نے کیا حال کر دیا میری بچی کے سر کا۔“ عندلیب بوڑائی اور پھر سے دیکھی نسخے پر طبع آزمائی کرنے لگی۔

”آپ کے پاس صرف یہی ایک حل ہے خشکی دور

لگیں۔ "www.paksociety.com" آج دروازے سے بنا۔
 "ارے..... دروازے پر تو تم مجھے گفٹ دو بہو۔"

دادی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 "ہم روایت بدل دیتے ہیں۔ دروازے پر ہم دونوں ماں بٹی کو گفٹ دیتے ہیں۔" عندلیب نے ساس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
 "کیوں نہیں! بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ ماؤں کا سب کچھ بٹی بیٹوں کا ہی تو ہوتا ہے۔"
 "مجھے آپ لوگوں سے کچھ نہیں لینا ہے۔ آپ ہی میرا گفٹ ہیں۔" اریہ نے کہا اور ماں کے گلے لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

ناشتے کے بعد اریہ، عندلیب کے ساتھ ٹی وی پر مارنگ شو دیکھ رہی تھی۔ چمکدار لہراتے بالوں والی، لڑکیوں کو دیکھ کر اریہ اُداس سی لگنے لگی۔ عندلیب نے فوراً محسوس کیا اور اس کا سر گود میں رکھ کر بال سہلانے لگی۔
 "کیا ہوا، اُداس کیوں ہو گئیں بیٹا؟" عندلیب نے محبت سے گھر کا۔

"پتا نہیں امی! جب بھی میں لڑکیوں کے ایسے خوبصورت بال دیکھتی ہوں تو اللہ میاں سے ایک ہی دعا مانگتی ہوں کہ کاش اللہ میاں میرے بھی ایسے ہی خوبصورت بال کر دے۔ اور میں بھی خوب اثر اؤں۔" اریہ معصومیت سے دل کی بات کہہ گئی۔
 "میری پیاری بیٹا! تو اُداس نہ ہوا کر، جب تو اُداس ہوتی ہے تو کائنات اُداس ہو جاتی ہے۔ تو تو اس گھر میں زندگی کی علامت ہے چننا۔" عندلیب نے اریہ کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"تیرے بال انشاء اللہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔ میں نے حل سوچ لیا ہے۔ اتنے سارے ٹوٹے اور شیمپو استعمال کیے مگر اب میں ایک آخری بار ڈرائی کروں گی۔"

"دل بہلانے والی باتیں مت کریں امی، سب کے بال اچھے ہوتے ہیں مگر بس میرے ہی بال ایسے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ انسان کی خواہش پوری

اریہ دادی کی طرف بڑھ گئی اور عندلیب کچھ دیر پہلے کے منظر کو پھر سے یاد کرنے لگی۔
 "کیا میں نے واقعی کچھ غلط کیا ہے اریہ کے ساتھ؟"
 "نہیں تم ٹھیک ہو اپنی جگہ....." اُس کا دل بولا۔
 "مگر..... میری مثبت بات کو مننی رنگ کیوں دے دیا گیا؟"
 "آج تمہارا زمانہ نہیں بلکہ تمہاری بچی کا زمانہ ہے۔" اندر سے آواز آئی۔
 "تو....."

"تو پھر یہ کہ آج کے حساب سے جینا سیکھو۔ جو مسائل تمہارے زمانے میں تھے۔ وہ مسائل آج بھی ہیں مگر ان کا حل تبدیل ہو گیا ہے۔"
 "مگر..... میں بھلا کس طرح سے آج کے زمانے کا ساتھ دے سکتی ہوں۔"
 "آج کا زمانہ تمہارا منتظر ہے۔ بس قدم بڑھاؤ۔" ضمیر کی نگرار سے وہ جلد ہی نتیجے پر پہنچ گئی۔

☆.....☆.....☆

"اریہ! گڑیا اٹھ جاؤ پلینز" عندلیب نے اریہ کو اٹھایا تو وہ منہ بسور لی اٹھ گئی۔
 "آج سنڈے ہے امی آج سونے دیں نا۔"
 "ٹھیک ہے سونے دیتی ہوں مگر کتنی دیر تک....."
 عندلیب نے بٹی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو پھر سے غصے کے ذرات اُس کے بالوں میں آ گئے۔
 "اد کے امی! میں اٹھ گئی۔" وہ بستر پر دوڑا تو بیٹھ گئی۔

"گڈ مرننگ!" عندلیب نے بٹی کا ہاتھ چوما۔
 "امی چلیے میں آتی ہوں۔ میرا ناشتا آپ دادی کے کمرے میں لے آئیے۔"
 "ٹھیک ہے چننا! میں تمہارا ناشتا وہیں لے کر آتی ہوں۔"

کچھ ہی دیر میں وہ بٹی کا من پسند ناشتا لیے اُس کے کمرے میں تھی۔
 "ہاں آج آپ جیسے کہ آپ کا بیوٹا کو کیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہو۔ خواہش بارشوں کی طرح تھوڑی ہوتی ہے۔
 سحر اڑوں اور پہاڑوں دونوں کو جھل جھل کر دے۔
 ”چندا کیا ہو گیا ہے؟ یہ فلسفہ مجھے سخت زہر لگا ہے
 تمہارا۔ تم تو بہت پیاری بچی ہو، چلو اب ذرا نیوز چینل
 لگا دو۔ حالات حاضرہ سے بھی باخبر رہنا چاہیے۔“
 عندلیب نے مسکراتے ہوئے موضوع بدلاتا کہ بیٹی کی
 اداسی کسی طور ختم ہو۔

☆.....☆.....☆

”بہو! میری مانو تو تم فوراً ریپہ کے لیے لائف
 بوائے شیمپو لے آؤ۔“ دادی ماں نے بہرہ مشورہ دیا تھا۔
 ”ماں! اچھے سے اچھا شیمپو استعمال کر چکی ہوں۔
 سارے شیمپو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔“ عندلیب
 جھنجھلائی۔

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا بہو کہ آج کی
 ٹرینٹ کی ضرورت ہے۔ تم سب کچھ استعمال کر کے
 دیکھ چکیں تو بس یہ آخری شیمپو اور دیکھ لو۔ لائف بوائے
 نام ہی ضمانت کی ہے بہو۔ تم اسے ریپہ کے بالوں پر
 استعمال کر کے تو دیکھو۔“ دادی ماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے اماں! میں آج ہی ریپہ کے بال
 لائف بوائے شیمپو سے دھوئی ہوں۔“ عندلیب ساس
 کے ہاتھ سے لائف بوائے شیمپو لے کر ریپہ کے کمرے
 میں آگئی۔ ریپہ اپنے اچھے بالوں کو سناٹا رہی تھی۔

”ہیلو بیٹا.....“ عندلیب نے اس کی آنکھوں پر
 مسکراتے ہوئے کہا۔

”امی! دیکھیے نا پھر سے الجھ گئے سارے بال۔“
 ”ارے میری گڑیا..... یہ تو ان سارے مسائل کا
 علاج۔“ عندلیب نے اعتماد سے کہا۔

”علاج! کون سا علاج ای۔“
 ”یہ ہے تمہارے سارے بالوں کے مسائل کا
 حل۔“ عندلیب نے لائف بوائے شیمپو اس کے آگے
 کر دیا۔

”ای آپ اس سے پہلے بھی تو ایسے کئی
 علاج کر چکی ہیں میرے بالوں کے لیے۔“
 ”ہاں کر چکی ہوں مگر تم اس لائف بوائے شیمپو پر
 آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ

لائف بوائے شیمپو جو کہتا ہے وہ کڑکے بھی دکھاتا
 ہے۔ چلو شاباش..... اچھو اور پورے اعتماد کے ساتھ
 لائف بوائے شیمپو استعمال کرو۔“ عندلیب نے بیٹی کو
 ساتھ لگاتے ہوئے جیسے ہمت اور حوصلہ بھی پھونکا
 تھا۔

اریپہ فوراً ہی لائف بوائے شیمپو سے بال دھونے
 چل دی تھی۔

”مجھے سو فیصد ہی نہیں اب دو سو فیصد یقین ہے کہ
 میرا اور اماں کا اعتماد ضرور جیتے گا، انشاء اللہ۔“ عندلیب
 دل میں بولتی وہاں سے چل دی۔

☆.....☆.....☆

(اگلے برس)

آج بڑے زوروں سے بادلیاں گر رہے تھے۔
 مون سون شروع ہوا تو ہر طرف جل جھل تھی۔ سون
 کی بہاریں ہی الگ ہوتی ہیں۔ جیسے تپتے صحرا
 میں مون سون اپنے رنگ بھر کر اسے پانی پانی کر کے
 دھرتی ماں کی پیاس بجھاتا ہے اسی طرح مون سون
 دلوں میں امنگ جگاتا، نئے نئے محبت کے رنگ بھی
 برساتا ہے۔ آگے کے بڑے سارے صحن میں ایک
 طرف دادی ماں چار پائی پر بیٹھی بارش سے لطف لے
 رہی تھیں تو دوسری طرف اریپہ دل کھول کر بارش میں
 نہا رہی تھی۔ بتا خوف و جھنجھٹ کے..... عندلیب
 پکوان بنانے میں مگن کچن میں مصروف تھی۔ تھوڑی
 دیر میں وہ ٹرے میں گرم گرم آلو کے پرائٹھے، اچار
 اور حلوہ لیے برآمدے میں آگئی۔

”چندا آ جاؤ! پہلے کھالو اور پھر بعد میں نہاتی
 رہنا۔“ عندلیب نے اریپہ کو پکارا۔

”اماں جان! پلیز آپ بھی آ جائیں۔ سب ٹھنڈا
 ہو جائے گا۔“

”ارے امی جان پکوان تو پھر سے بن جائیں گے
 مگر یہ بارش! آف! کتنا مزہ آرہا ہے۔ پلیز آ جائیں اور
 دیکھیں کتنا انجوائے کر رہے ہیں میں اور دادی اماں!“
 اریپہ نے آخر عندلیب کو زبردستی بارش میں کھینچ ہی لیا۔
 ”اوفوہ! چلو ٹھیک ہے۔ واقعی بارش تو نعمت ہے۔
 اور کراچی والوں کے لیے تو بارش اب خواب ہو چکی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ یہ کہہتی ہو موسم کا لطف تو اٹھانا نہیں جاسکتا بعد میں مگر پکوان ضرور دوبارہ سے لطف دے سکتے ہیں۔

عندلیب بھی خوشی سے کہہ رہی تھی۔
”ارے..... رکو میں اس خوشی میں تمہیں خوشیاں دینے والے تمہارے سب سے اچھے ساتھی کو کیوں بھول گئی۔“ جیسے عندلیب کو کچھ یاد آیا۔

”کیا مطلب ای؟“
”مطلب یہ کہ..... ابھی بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر عندلیب بیٹھی ہوئی اندر گئی اور کچھ لمے کر واپس صحن میں آگئی۔

”اوہ میرا لائف بوائے شیمپو..... ای یو آر گرےٹ۔“ اریبہ نے ماں کو چوم لیا۔

”لو اور موسم کو کھل کر انجوائے کرو۔ یاد ہے نا پچھلے مون سون میں تمہارے بالوں کا کیا حشر تھا اور اب۔“ عندلیب نے اریبہ کے گھنے، دراز بالوں کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”اب یہ بال ہو گئے ہیں، بنگال کا جادو۔“ اریبہ نے قہقہہ لگایا۔

”نو..... بنگال کا نہیں، اب پاکستان کا جادو، لائف بوائے شیمپو..... بالوں کے سارے مسائل سے نجات دلائے۔ خشکی شکاری کا جڑ ہے خاتمہ کرے اور اپنی ملک پروشین کی طاقت سے بالوں میں نئی زندگی اور قدرتی چمک واپس لائے۔“

”ارے بہو! لائف بوائے پھر سے لائف بوائے شیمپو کی شکل میں جیت گیا۔ دیکھ لو آج بٹیا مون سون میں کیسے مزے سے بنا کسی ڈر کے نہا کر موسم انجوائے کر رہی ہے۔“ وادی ماں نے دور سے ہی بہو اور پوتی کی بلا میں لیں۔

”اماں جان لائف بوائے شیمپو کی جیت نہیں ہے یہ..... یہ تو یقین اور بھروسہ کی جیت ہے۔ یہی حقیقت ہے۔ سب دعوے کرتے ہیں مگر لائف بوائے شیمپو اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہتا ہے۔ یہ واحد شیمپو ہے جو مون سون کے اثرات سے بھی بالوں کی حفاظت کرتا ہے۔“

اب اریبہ بالوں کو لائف بوائے شیمپو سے تیرتی

بازش میں دھورنی تھی۔
ای۔۔۔ میرا سپنا، میری خواہش لائف بوائے شیمپو نے پوری کر دی۔ سچے حقیقت میں بدل دیے لائف بوائے شیمپو نے۔ میرے بال خوبصورت کر دیے لائف بوائے شیمپو نے۔“

اریبہ کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ کر عندلیب کو سرشار کر رہی تھی۔ عندلیب ساس کے پاس جا کر چار پائی پر بیٹھ گئی۔

”اماں لائف بوائے شیمپو کی جیت کا سہرا آپ کے سر جاتا ہے۔ آپ نے آج کے ٹریٹمنٹ کا کہہ کر لائف بوائے شیمپو ہی کو آخری حل کس طرح کہا تھا اماں!“

”بہو! کچھ چیزیں ٹریڈ مارک ہوتی ہیں۔ لائف بوائے بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔“

لائف بوائے کی مصنوعات نمبرون اپنے دیرپا اثر کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ جب میری گڑیا کے بالوں کا مسئلہ سامنے آیا تو میں تو بہت پہلے سے تم سے لائف بوائے شیمپو کا کہتی مگر میں نے اس لیے نہیں کہا کہ تم بازار میں ملنے والے وقتی چمک دکھ والے منگے شیمپو استعمال کر لو اگر بات نہ بنی تو پھر میں اپنے اعتماد کو آزمادوں گی۔

اور دیکھ لو..... نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔

لائف بوائے، انسانوں کا بھروسہ ہے اور یہ اعتماد بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ خدا کا شکر ہے لائف بوائے شیمپو پر بھروسہ کیا اور وہ بھروسے پر پورا اترتا۔“

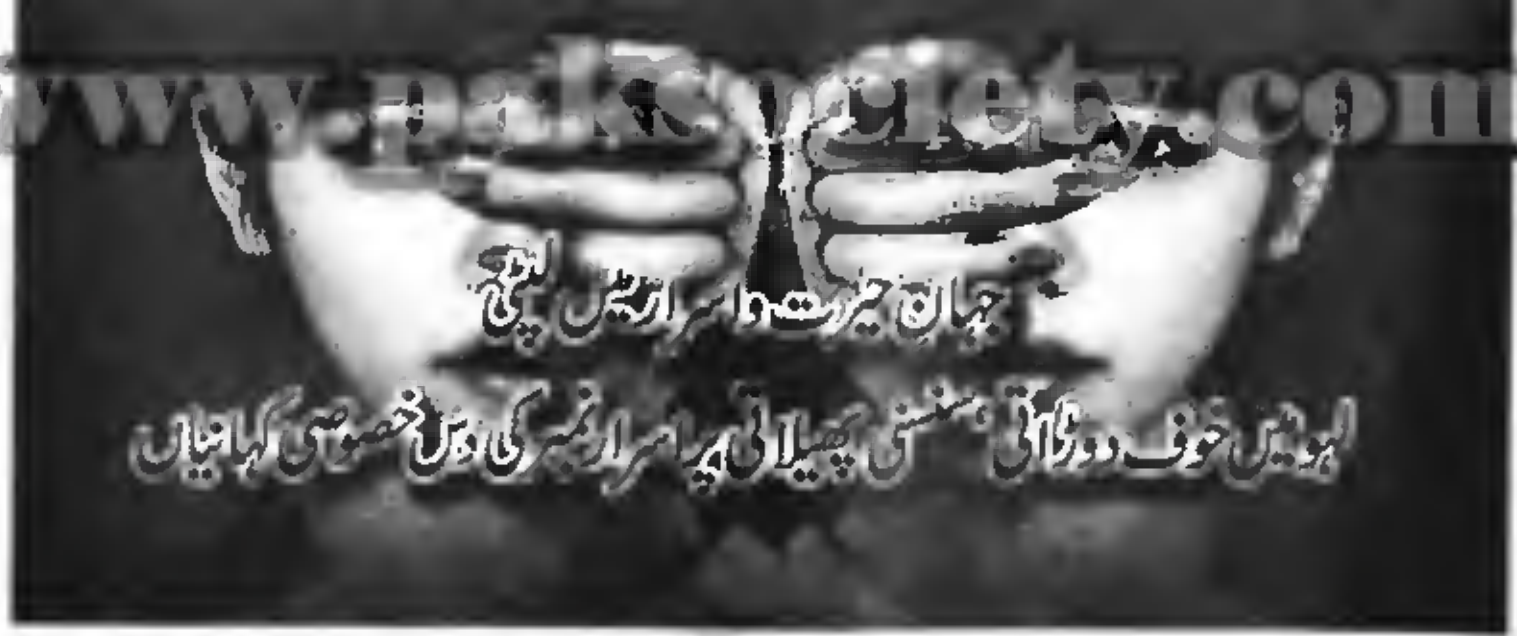
”ارے جس پر بھروسہ کیا وہی سب کچھ ہے اور جو تختہ مشق بنا وہ کچھ نہیں ہے۔“ اریبہ بھی وادی اور ماں کے قریب چلی آئی تھی۔

”جو تختہ مشق بنا وہی تو کامیاب بھی بٹھرا۔“ عندلیب نے اریبہ کی ناک پکڑ کر محبت سے دبائی۔

”تھینک یو لائف بوائے شیمپو۔ تم نے مون سون کو اصل میں مون سون بنا دیا۔ بغیر کسی ڈر کے۔“ اب تینوں مل کر برسات انجوائے کر رہی تھیں۔ بادل پھر زور سے گر جاتا تھا۔

جیسے لائف بوائے شیمپو کی کامیابی پر وہ بھی خوشی میں قہقہہ مار کر ہنسا ہو۔

☆.....☆☆



جہان حیرت داسرار میں لپیٹ

لہو میں خوف و ڈر آتی، سنسنی پھیلاتی پراسرار نمبر کی دہل خصوصی کہانیاں

فریب نظر



جاوید راہی

اُس انسپکٹر کی دہشت ناک داستان جو فریب نظر کا شکار ہو کر اپنی جان گنوا بیٹھا

ڈرائیور نے جیب روک دی اس سے آگے راستہ
بھی نہ تھا خود انسپکٹر زبیر شاہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اب جیب
بالکل آگے نہیں جاسکتی۔
’ٹھیک ہے۔‘ مادر خان تم جیب لیکر واپس جاؤ

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

جیسا کہ چلی گئی اور زیر شاہ سپاہیوں کے ساتھ آگے چل پڑا۔ اسے حویلی گول گلی تک جانا تھا جہاں سے قتل کی ایک واردات کی اطلاع ملی تھی اور اسے اس کی تفتیش کرنی تھی۔ موسم خوشگوار تھا پہاڑی راستوں کے اطراف ہریالی بھی تھی اور دور تک اونچی نیچی چٹانیں اور چھوٹے چھوٹے خشک ٹیلے بھی نظر آرہے تھے۔ کہیں گہری کھائیاں تھیں اور کہیں اونچی نیچی پہاڑیاں لمبے لمبے تناور درختوں سے چھپی ہوئی تھیں۔ زیر شاہ جوان تھا ابھی اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی مگر وہ شادی کے خواب ضرور دیکھتا تھا۔ پولیس کی ملازمت میں شادی کی فرصت نہیں مل رہی تھی اس لئے خیالی دوشیزاؤں سے دل بہلاتا تھا۔

اس وقت بھی اس کے ذہن میں کوئی قاتل نہیں تھا بلکہ وہ جس کی تلاش میں جا رہا تھا وہ کوئی حسین قاتلہ بھی جو اپنے گھر کی ولیمز پر اس کیلئے کنواری بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں آگے چلنے والے ایک سپاہی نے کان پر ہاتھ رکھ کر مایہاگنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز اسے پاس کی چٹانوں سے ٹکرا کر گونجنے لگی اور زیر شاہ کے دل میں اترنے لگی۔ مایہاگے دل میں زیر شاہ کی خیالی محبوبہ کو تڑپتے دیکھ رہا تھا۔ جب شام ہونے لگی اور چپکے چپکے تاریکی پھیلنے لگی تو وہ گانے والا سپاہی خاموش ہو گیا۔ وہ دریائے سندھ کے قریب پہنچ رہے تھے۔ ابھی وہ دریائے آدھے میل کے فاصلے پر تھے کہ زیر شاہ کو ایک طرف درختوں کے جھنڈ میں ایک پرانی حویلی نظر آئی زیر شاہ نے پوچھا۔

خان یہاں اس دیرانے میں کون رہتا ہے؟

سپاہی بابو خان نے جواب دیا کہ ہمارے باپ دادا کہتے ہیں کہ درپاکے اس پار حویلی گول گلی کی طرح یہاں بھی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ پتا نہیں یہ کیسے اجڑ گئی۔ کچھ مکانات سیلاب وغیرہ میں بہہ گئے۔ صرف وہ حویلی اب تک اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی ہے۔

زیر شاہ نے حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "روشنی نظر آرہی ہے۔ کیا اب بھی وہاں لوگ آباد ہیں؟"

اگر بوڑھی عورت تنہا رہ رہی ہوتی تو اس حویلی سے اتنی وچپسی کبھی نہ پیدا ہوتی اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی کا ذکر آیا تو زیر شاہ کا دل بے اختیار اس کی طرف کھینچنے لگا۔ کتنا رومینک ماحول تھا۔ ٹھنڈے سایہ دار درختوں کے ساتھ شام کی نیم تاریکی میں وہ حویلی شاخوں اور پتوں کے پیچھے سے جھلک رہی تھی اور ایک اونچی کھڑکی سے باہر آنے والی روشنی مدہم مدہم اشاروں کی طرح اپنی طرف بکھار رہی تھی۔ اس رومانی ماحول میں کہیں ایک جوان لڑکی بھی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہی اس کے خوابوں کی ولیمز ہو اور اس دیرانے میں اس کیلئے اب تک کنواری بیٹھی ہو۔ زیر شاہ نے سپاہیوں سے کہا۔

میں رات کو درپاکے نہیں کریں گے۔ میں اس حویلی میں رات گزارنی چاہیے۔ کل صبح گول گلی پہنچ کر قاتل کو تلاش کیا جائے گا۔

ایک سپاہی نے کہا۔ جناب انسپکٹر صاحب نے کہا تھا کہ ہمیں جلد سے جلد جائے وازوات پر پہنچنا چاہیے اگر ہم نے وقت ضائع کا تو قاتل بہت دور نکل جائے گا۔

زیر شاہ کو سپاہی کی بات بہت بُری لگی وہ بیچارہ سپاہی جوان انسپکٹر کے جذبات نہیں سمجھ رہا تھا صرف فرض کا احساس دلا رہا تھا۔ زیر شاہ نے ناگواری سے کہا۔

"اطلاع کے مطابق صبح چار بجے قتل ہوا تھا۔ ہم پندرہ گھنٹے بعد وہاں پہنچیں گے تو کیا قاتل ہمارے انتظار میں وہاں بیٹھا ہوگا؟ تم احمق ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے اپنے فرض کا احساس نہیں ہے اگر تم مجھ سے زیادہ تجربہ کار، چالاک اور ولیر ہو تو اپنے ساتھ ایک سپاہی کو لے کر جاؤ اور اپنے طور پر تفتیش کرو میں صبح وہاں آؤں گا تو مجھے مکمل رپورٹ پیش کرنا۔"

زیر شاہ نے یہ بات غصے میں کہی تھی پھر اس کے دماغ نے کہا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہی مناسب ہے کہ

جوان لڑکی کے متعلق سوچتے وقت اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ ایک مفروضہ قاتل ایسی ویران حویلی میں آکر پھب سکتا ہے۔ بوڑھی عورت کی بات سن کر اسے اپنے فرض کا احساس ہوا۔ اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔

”جی ہاں مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون کر رہی ہیں۔ میں اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں۔“

”میں نئے اور پرانے چہروں کو پہچانتی ہوں۔ میں نے اس علاقے میں آدھی صدی گزاری ہے۔ بوڑھے اسپیکر کی جگہ تمہیں دیکھ کر میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ نئے بھی ہو اور اناڑی بھی۔“

زیر شاہ نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں اناڑی ہوں؟“

وہ شمع دان اٹھائے بڑے بال کے نیچے فرش پر چلتی ہوئی بولی۔ ”میں ابھی آدھ ٹھٹھے پہلے گول گلی سے آئی ہوں۔ وہاں تم اور تمہارے سپاہی نہیں تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھے یہاں چلے آئے اور یہاں صرف سستانے اور آرام کرنے آئے ہو۔ مجرموں کی تلاش میں آنے والے سپاہیوں کے انداز ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اگر تم تلاش میں آتے تو پہلے کسی آدمی کو حویلی کے پچھلے دروازے پر بھیجتے اور یہاں اندر آتے ہی تلاشی شروع کر دیتے۔“

زیر شاہ اپنے ماتحتوں کے سامنے جھینپ کیا پھر بات بجاتے ہوئے بولا ”شاید آپ یہ بات نہیں جانتیں کہ ہم پولیس والے چہروں سے جرم کرنے والوں کو پہچان لیتے ہیں۔ آپ کا اطمینان بتا رہا ہے کہ آپ نے کسی مجرم کو چھپانے کا جرم نہیں کیا ہے پھر بھی میں فرض ادا کرنے کے طور پر تلاشی لوں گا۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ مجھے اس حویلی کا ایک ایک کمرہ دکھائیں۔“ زیر شاہ نے کہا۔ مقصد یہی سامنے تھا کہ شاید وہ جوان لڑکی کسی کمرے میں مل جائے۔

تین سپاہیوں نے تین شمعیں روشن کیں اور تین اطراف چلے گئے۔ زیر شاہ بوڑھی عورت کے ساتھ چلنے لگا پتا نہیں کہ بوڑھی عورت نے اس کے خیالات پر غور کیا تھا یا وہ محض اتفاق تھا کہ وہ سیدھی اسی

اگر سپاہی اس کے پہلے وہاں پہنچ کر اپنے طور پر تفتیش کرتے ہیں تو دوسرے دن اس کیلئے بہت سا کام آسان ہو جائے گا اور وہ خواہ مخواہ کی بھاگ دوڑ سے بچ جائیگا۔ اس منصوبے کا دوسرا پہلو بھی بہت خوبصورت نظر آیا۔ سپاہیوں کے جانے کے بعد وہ تنہا اس حویلی میں رات گزارتا تو اس بڑھیا کی جوان پوتی سے کھل کر گفتگو کرنے اور آزادی سے وقت گزارنے کا موقع مل جاتا۔ اس نے خوب اچھی طرح سوچ کر زری سے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ تم لوگ میرے ساتھ حویلی تک چلو اگر مجھے وہاں آرام سے رات گزارنے کا موقع ملا تو میں وہاں صبح تک جاؤں گا۔ تم تینوں ابھی سے گول گلی پہنچ کر اپنا کام شروع کر دینا۔“

پھر وہ لوگ حویلی کی طرف پیدل ہی چلنے لگے کیونکہ وہاں تک جیپ نہیں جاسکتی تھی۔

حویلی کے دروازے پر پہنچ کر ایک سپاہی نے دستک دی۔ دو چار سارے دروازہ اچھی طرح پٹینے کے بعد ویران حویلی کے اندر زندگی کے آثار نظر آئے۔ دور کسی عورت کے بڑبڑانے کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دروازہ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے کے پیچھے ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں شمع لئے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ چہرے پر اتنی جھریاں تھیں کہ گنتے گنتے صبح ہو جائے ان جھریوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ ساٹھ ستر برس کی ہوگی۔ ویسے بوڑھی ہونے کے باوجود اچھی خاصی صحت کی مالک تھی اس نے آنے والوں کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سن چکی ہوں کہ چائن کبار اپنی گھیر والی کو قتل کر کے فرار ہو گیا ہے۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ تم لوگ اسے تلاش کرنے کیلئے یہاں آؤ گے کیونکہ یہاں مجرموں کو آسانی سے چھپایا جاسکتا ہے۔ آؤ اندر آ جاؤ اور یہاں کا کونہ کونہ دیکھ لو۔ میں قانون کا ساتھ دینا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔“ بوڑھی عورت نے کہا۔

اس وقت زیر شاہ کے ذہن میں صرف ایک جوان دوشیزہ تھی، جوانی کے اندھے جذبے اس طرح بھٹکاتے ہیں کہ اصل راستہ گم ہو جاتا ہے۔ زیر شاہ نے ایک

مردی انہیں بٹھائی ہوئی تھی۔ زیر شاہ کمرے کے اندر پہنچتے ہی اسے دیکھ کر ہلک گیا۔ اس نے خیالوں میں جتنی دلیلوں کے چہرے بنائے تھے وہ ان سے بھی زیادہ حسین تھی۔ شمع کی روشنی میں اس کے حسن کی چاندنی نکھر رہی تھی۔ اس کے بدن پر ریشمی لباس تھا جس سے اس کے بدن کی شادابیاں جھلک رہی تھیں۔ وہ اس کا سراپا نہیں دیکھ سکا کیوں کہ وہ ایک میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی اس کے دونوں ہاتھ میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میز پر کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے مگر وہ کھانا کھانے کے بجائے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازے پر آہٹ سن کر اس نے اپنی گھٹی پلٹ کر اٹھایا تو اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں زیر شاہ کے ذہن میں پیوست ہو گئی تھیں۔ وہ ایسے سہمی ہوئی محسوس نظر آ رہی تھیں کہ انہیں دیکھتے ہی زیر شاہ کا دل بھڑکنے لگا تھا اور جسم میں دھیمادھیماسا سرور جاگ اٹھا تھا۔ اس کے دماغ نے کہا۔

”بس یہی منزل ہے۔ یہیں ٹھک کر بیٹھ جانا چاہیے۔ فرانس کی ادائیگی تو ہوئی ہی رہتی ہے۔ پروگرام کے مطابق تینوں سیاہیوں کو حویلی گول ملی بھیج دینا چاہیے۔ تینوں ایسا کام کرتے رہیں گے اور وہ یہاں تنہا اس دوشیزہ کے دل کی طرف اپنا راستہ بناتا رہے گا۔“

اس بوڑھی عورت نے آگے بڑھ کر اس شخص کو اس لڑکی کے قریب میز پر رکھ دیا۔ لڑکی کے چہرے کے نقوش اور زیادہ واضح ہو گئے۔ بڑھیا نے کن اکھیوں سے زیر شاہ کی طرف دیکھا اور لڑکی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”یہ میری پوتی چندیری ہے۔“
زیر شاہ نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کہا۔

”مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“
مگر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے ہاتھ نہیں اٹھائے تھے۔ شاید وہ توجہ نہ دینے کی وجہ سے خود بھی شرمندہ تھی کیونکہ اس کی آنکھیں ندامت سے جھک گئی تھیں۔ بڑھیا نے التجا جت سے کہا۔

”آپ کی پوتی بہت حسین ہے۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ اس کے ہاتھ کیسے منفلوج ہوئے؟“
”یہ پیدا ہوتی طور پر ہی ایسی ہے۔“

زیر شاہ نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔
”مجھے اس سے بے حد ہمدردی ہے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ اپنے اندر بہت سے دکھ سمیٹے بیٹھی ہو۔“
”انسپکٹر اس کے دکھوں کا حساب کرو گے تو قاتل ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جاؤ اور اپنا فرض ادا کرو۔“

”کسی کے دکھ اور مصیبت میں کام آنا بھی میرا فرض ہے۔ میرے سپاہی دوسرے فرض کی ادائیگی کیلئے ابھی حویلی گول ملی جا میں گے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں یہ رات یہیں گزار لوں۔“

بوڑھی عورت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔
”ہماری حویلی ایسی جگہ ہے کہ کتنے ہی بھولے بھٹکے مسافر یہاں آکر پناہ لیتے رہتے ہیں اور تم تو پولیس انسپکٹر ہو جان و مال کے محافظ ہو۔ تمہارے یہاں رہنے پر میں کیسے اعتراض کر سکتی ہوں۔“

انسپکٹر زیر شاہ نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولی، ”لیکن میں تمہیں فرض کا احساس بھی دلانا چاہتی ہوں وہ تینوں سپاہی صرف لائشیاں لے کر قاتل کی پیچھے جا رہے ہیں۔ تو وہ ہاتھ نہیں آسکے گا۔“

”آپ کی پوتی بہت حسین ہے۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ اس کے ہاتھ کیسے منفلوج ہوئے؟“
”یہ پیدا ہوتی طور پر ہی ایسی ہے۔“

زیر شاہ نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔
”مجھے اس سے بے حد ہمدردی ہے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ اپنے اندر بہت سے دکھ سمیٹے بیٹھی ہو۔“

”انسپکٹر اس کے دکھوں کا حساب کرو گے تو قاتل ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جاؤ اور اپنا فرض ادا کرو۔“

”کسی کے دکھ اور مصیبت میں کام آنا بھی میرا فرض ہے۔ میرے سپاہی دوسرے فرض کی ادائیگی کیلئے ابھی حویلی گول ملی جا میں گے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں یہ رات یہیں گزار لوں۔“

بوڑھی عورت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔
”ہماری حویلی ایسی جگہ ہے کہ کتنے ہی بھولے بھٹکے مسافر یہاں آکر پناہ لیتے رہتے ہیں اور تم تو پولیس انسپکٹر ہو جان و مال کے محافظ ہو۔ تمہارے یہاں رہنے پر میں کیسے اعتراض کر سکتی ہوں۔“

انسپکٹر زیر شاہ نے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ ہاتھ اٹھا کر بولی، ”لیکن میں تمہیں فرض کا احساس بھی دلانا چاہتی ہوں وہ تینوں سپاہی صرف لائشیاں لے کر قاتل کی پیچھے جا رہے ہیں۔ تو وہ ہاتھ نہیں آسکے گا۔“

”آپ یہاں رہتی ہیں تو قاتل کو بھی اچھی طرح جانتی ہوں گی۔ آپ مجھے اس کے متعلق بتائیں میں اسے گھیرنے کی تدبیر کروں گا۔“ یہ کہہ کر زبیر شاہ چندیری کے سامنے دالی کرسی پر بیٹھ گیا۔
بوڑھی عورت نے چندیری کو کھانا کھلاتے ہوئے کہا۔

”اس کا نام چائن کہہ رہے۔ وہ ایک قد آور جوان ہے تمہاری طرح صحت مند بھی ہے۔ وہ دلیر ہے مگر چالاک نہیں بستی والے کہتے ہیں کہ اس پر کسی چیز کا سایہ پڑ گیا ہے اس لئے اس نے اپنی خوبصورت بیوی کو قتل کر دیا ہے۔“

”قاتل کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے قانون یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ ایک چیز کیلئے یہ قتل کیا گیا ہے۔ کیا اس چیز کا کوئی وجود ہے؟“
”اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے لیکن چائن کہہ رہا خود لوگوں کو بتایا کرتا تھا کہ رات کو دریا کے کنارے ایک بہت ہی حسین عورت اس سے ملنے آتی ہے اور اسے اپنے ساتھ چلنے کیلئے کہتی ہے۔“

”مجرم یا ملزم کوئی ایسی من گھڑت باتیں کہہ کر سزا سے نہیں بچ سکتا۔“

”سزا تو اس وقت ہوگی جب وہ پکڑا جائے گا۔ تمہارے سپاہی صرف لاشیون سے ہانک کر اسے حوالات تک نہیں لے جاسکیں گے کیونکہ وہ چیزیل اس کی حفاظت کرتی ہے۔“

”ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ اس چیزیل کو کسی نے نہیں دیکھا ہے پھر چشم دید گواہ کیسے ملیں گے؟“

”بڑھیا نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر جواب دیا۔“ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جب چائن کہہ رہی اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد وہاں سے بھاگنے لگا تو بستی کے چار جوانوں نے اس کا پیچھا کیا اس وقت صبح کے چار بجے تھے اور رات کا دم توڑنا اندھیرا بھی باقی تھا۔ چائن کہہ رہا کہ پیچھا کرنے والے جوان اچانک ہی ٹھنک کر کھڑے ہو گئے۔ کھر آلود نیم تاریکی میں انہیں وہ سوکھے ہاتھ نظر آئے ان ہاتھوں نے سب سے آگے والے جوان کا ہلکا دھچکا لیا۔ یہ منظر دیکھ کر دو جوان

خوف سے بھاگ گئے تیسرا جوان دالیر تھا وہ آگے بڑھ کر ان سوکھے ہاتھوں سے اپنے ساتھی کی گردن چھڑانے لگا۔ اس کے ساتھی کی گردن چھوٹ گئی مگر دونوں کے منہ پر دونوں ہاتھوں کا تھپڑ پڑا۔ وہ دونوں لڑکھڑا کر نیچے گرے پھر جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن انہوں نے دوبارہ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اسی طرح فضا میں معلق تھے یوں لگتا تھا جیسے ان ہاتھوں کے پیچھے پورا جسم موجود ہے جو کہر کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ ہاتھ صرف کہنی سے پنجوں تک نظر آ رہے تھے یعنی نادیدہ جسم ساکت تھا اور دونوں ہاتھ متحرک تھے۔“

عورت کی باتیں سن کر زبیر شاہ کی نظریں بے اختیار چندیری کے ہاتھوں کی طرف گئی تھیں۔ وہاں اس کے برعکس تھا بڑھیا بھی اپنی پوتی کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھی پھر وہ حسرت سے بولی۔

”اب دیکھو نا میری پوتی کے بھی ہاتھ کام نہیں کرتے۔ میری بڑی تمنا ہے کہ کسی طرح اس کے ہاتھ ٹھیک ہو جائیں۔ کوئی چاہنے والا ایسے محبت سے پھول پیش کرے اور یہ شہرنا کر ہاتھ بڑھائی اور وہ پھول قبول کر لیتی۔“

اس کی بات ادھوری رہ گئی تینوں سپاہی حویلی کی تلاش لینے کے بعد اس کمرے میں آ گئے تھے۔ سپاہی بابو خان نے کہا۔

”جناب ہم نے حویلی کا کونہ کونہ چھان مارا ہے قاتل یہاں نہیں ہے اور حویلی کا پچھلا دروازہ بھی اندر سے بند ہے یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ پچھلے دروازے سے فرار ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں پہلے ہی ماں جی کا چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہاں قاتل کو غناو نہیں دی گئی ہے۔ تم تینوں حویلی گول گلی چلے جاؤ میں سچ وہاں پہنچ جاؤں گا۔“
”انسپکٹر اپنے سپاہیوں سے کہو کہ اگر چائن کہہ رہا کہیں نظر آئے تو اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں یہ لوگ وہاں پہنچیں گے تو بستی والے انہیں بھی ان ہاتھوں کی کہانی سنائیں گے بہتر ہے کہ یہ کسی نادیدہ قوت سے بڑھ کر انہیں صرف یہ معلوم کرائیں کہ چائن کہہ رہا

”چندیری کی خواب گاہ ہے“ انینگ ہال نہیں ہے۔ انسپکٹر نہیں بچن میں آکر کھانا کھانا چاہیے۔“ وہ اپنی بات کا جواب سنے بغیر باہر چلی گئی۔ زیر شاہ نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر گھوم کر چندیری سے بولا۔

”تمہاری دادی کو میرا یہاں بیٹھنا ناگوار گزر رہا ہے۔“ چندیری نے کوئی جواب نہیں دیا چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ زیر شاہ نے پوچھا۔

”کیا تمہیں بھی میری موجودگی ناگوار گزر رہی ہے؟“ چندیری نے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ خاموش جواب سن کر زیر شاہ کو خوشی ہوئی کہ اس حسینہ کو اس کی موجودگی گراں نہیں گزر رہی ہے۔

”چندیری۔۔۔ میں بہت دیر سے یہاں بیٹھا ہوں مگر ابھی تک تمہاری آواز نہیں سنی“ کیا تم قوت گویائی سے محروم ہو؟“ اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

”یعنی تم بول سکتی ہو؟“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تعب ہے؟ سو اسیر کا سر ہلا رہی ہو چھٹانک بھر کی زبان نہیں چلائی ہو؟“ اس کے راس بھرے ہونٹوں پر خوبصورت مسکراہٹ آگئی۔ زیر شاہ کے جی میں آیا کہ اس میٹھی زبان بھری مسکراہٹ کو چھالے لیکن چوری کی راہیں ابھی کھل رہی تھیں اس لئے وہ صبر کیے بیٹھا رہا وہ آہستہ سے بولی۔

”میں زیادہ نہیں بولوں گی دادی اماں آجائیں گی۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ رات یہاں نہ گزاریں۔“

”اگر تم مجھے بار خاطر سمجھتی ہو تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

چندیری نے اسے یوں نظریں اٹھا کر دیکھا جیسے اس کے جانے کے ذکر سے اسے صدمہ پہنچا ہو۔

”آپ بار خاطر نہیں ہیں۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ میں یہاں تنہا زندگی گزارتی ہوں مجھے بھی

پتہ کہاں پناہ کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے دن کی روشنی میں گھیرا جائے تو شاید وہ ہاتھ اس کی مدد نہیں کر سکیں گے۔“

چندیری کی دادی کا مشورہ مناسب تھا۔ زیر شاہ نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ اس کے مشورے پر عمل کریں۔ اگر کہیں چائن کمبار نظر آجائے تو اس کی لاعلمی میں اس کا پیچھا کریں اور اس کی جائے پناہ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

وہ افسرانہ انداز میں سپاہیوں کو حکم دے رہا تھا اس دوران اس نے محسوس کیا کہ چندیری اسے متاثر ہونے کے انداز میں دیکھ رہی ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو وہ اس کی وردی اور صحت مند جسم کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ زیر شاہ کا سینہ فخر سے تن گیا وہ سپاہیوں کے سامنے کچھ اور زیادہ افسرانہ اور تحکمانہ انداز اختیار کرنے لگا تاکہ وہ حسینہ اس سے مرعوب ہوئی رہے۔

مذہب کھڑے ہوئے سپاہی اس کا حکم سنتے رہے پھر ایڑیاں بجا کر سیلوٹ کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔

زیر شاہ نے گردن اٹھا کر افسرانہ شان سے چندیری کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے نظریں چرانے لگی۔ اس کی دادی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر میں تمہارے رات گزارنے کیلئے کمرہ نکھیک کرتی ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو وہیں کھانا وغیرہ بھی کھا لینا۔“

زیر شاہ نے چندیری کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں یہاں بیٹھ کر بھی کھانا کھا سکتا ہوں اگر آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو تو یہیں کھانا لے آئیے۔“

بوڑھی عورت نے اسے ذرا ناگواری سے دیکھا پھر اپنی پوتی کو دیکھنے لگی۔ چندیری نے اپنی دادی کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں سے کہہ رہی ہو۔

”تم چلی جاؤ اور انسپکٹر کو سہیں رہنے دو۔“

بوڑھیا ایک جھٹکے سے گھوم کر باہر جانے لگی۔ پھر دروازے کے پاس جا کر رک گئی اس نے پلٹ کر دونوں کو میز کے اطراف میں آنے سے سامنے بیٹھے دیکھا پھر انسپکٹر کی غماخت کرتی ہوئی بولی۔

کیا ان بکروں؟ میری سمجھ میں نہیں آیا اگر آپ بیٹیاں رہنے پر بضد ہیں تو کم از کم میرے ایک مشورے پر عمل کریں جس کمرے میں آپ رات گزاریں اس کا دروازہ اندر سے بند رکھیں اور صبح سے پہلے داوی اماں کا سامنا نہ کریں۔“

”آخر بات کیا ہے؟ کیا مجھے تجارتی داوی امال سے کوئی خطرہ ہے۔“

”ہاں۔۔۔ میں ابھی آپ کو نہیں بتا سکتی کہ وہ کتنی

خطرناک ہیں۔ آؤھی رات کے بعد ان کا مزاج
چہرہ اور ان کی شخصیت بدل جاتی ہے۔“

یقین نہیں دلا سکتی 'وہ ٹھیک تین بجے اپنے کمرے میں جا کر سو جاتی ہیں' جب وہ سو جائیں تو آپ تین بجے کے

یقین نہیں دلا سکتی 'وہ ٹھیک تین بجے اپنے کمرے میں جا کر سو جاتی ہیں' جب وہ سو جا میں تو آپ تین بجے گئے

بعد میرے کمرے میں آئیں، میں نے ان کے مشغلق ہونے کو دیکھا۔ اس وقت اس کا ثبوت پیش کر دوں گی۔

ابھی یہاں سے کچن میں چلے جائیں وہ کچن میں آپ کا

آپ کے ساتھ میری بھی شامت آجائے گی۔“

ہوئے بولا۔ ”اچھی بات ہے میں جا رہا ہوں مگر ٹھیک

زمین سب کے بعد یہاں آؤں گا لیا تم میرے سے
جاگتی رہو گی؟“

ایک ساتھی کی لمبی محسوس ہوتی ہے جیسا کہ خدیش پہلی رات
انسان ہوں میں دل سے چاہتی ہوں کہ آپ یہاں
سے کبھی نہ جائیں مگر یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ پر کوئی
آنچ نہ آئے، آپ یہ رات یہاں گزاریں گے تو پھر
آپ اس رات کی صبح نہیں دیکھ سکیں گے۔“ اس کی
آواز خوف سے لرز رہی تھی۔ زیر شاہ ذرا سنبھل کر بیٹھ
گیا۔ پہلے اس نے محتاط نظروں سے دروازے کی
طرف دیکھا پھر پلٹ کر پوچھا۔

”دستِ سہمی ہوئی ہو مجھے بتاؤ کیا بات ہے میں تمہاری مدد کروں گا۔“

آپ میری مدد نہیں کر سکیں گے اگر میرے دونوں
اتھ مفلج ہو جائیں تو میں آپ کو یہاں سے جانے کیلئے

بہت سی باتیں کہی گئیں۔ یہ سب سن کر آپ نے کہا:

”میں نے اس شخص کو دیکھا ہے، وہ ایک بڑا آدمی ہے۔“

زیرِ پیرِ شاہ کا۔ بیس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سوتیلی بہن کے
 پر اسرار بنتی جا رہی تھی۔ اسے بچپن کی سنی ہوئی کہانی یاد

آلی جس میں ایک دیو نے ایک سین پھراوی کو لے جا کر ایک قلعے میں قید کر دیا تھا۔ ایک شہزادے نے آکر

اس شہزادی کو دیو کے چنگل سے پھرایا تھا۔ زبیر شاہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

تمہاری بد نصیبی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ تمہارا

دونوں ہاتھ بیکار ہیں مگر میزے و دونوں ہاتھ فولاؤ کی طرح مضبوط ہیں۔ تم مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ بے خوف

”میں صرف آپ کیلئے خوف زدہ ہوں۔ آپ

بڑی سی دیوار کھڑی دیں گا کھینچ جائے گی۔ بڑے ہی پرانے طرز کی گھڑی تھی جو اب نایاب ہو گئی تھی۔ بہر حال اس ویران حویلی میں ٹن ٹن کی آواز بڑی اعصاب شکن تھی۔ جب آواز گونجتے گونجتے فضا میں تحلیل ہو گئی تو وہ بوڑھی ٹھکے ہوئے انداز میں بولی۔

”ابھی تو دس ہی بجے ہیں“

”کیا تم بارہ بجانا چاہتی ہو؟“

”میں چاہتی ہوں کہ اس حویلی میں تمہارے بارہ نہ بجیں یا تو تم بارہ بجے سے پہلے اس حویلی کو چھوڑ کر چلے جاؤ یا پھر جو کمرہ میں تمہیں رات گزارنے کیلئے دوں اس کا دروازہ اندر سے بند کر لینا اور صبح سے پہلے باہر نہ نکلنا۔“

زیر شاہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے بوڑھی عورت کو دیکھنے لگا۔ یہی بات اس سے چندیری نے بھی کہی تھی۔ اس نے کہا۔

”تم اپنی باتوں سے مجھے الجھا رہی ہو۔ صاف صاف کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟“

بوڑھی عورت نے کمری کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ”یہ بات میں تمہیں بہت پہلے بتا دینا چاہتی تھی مگر چندیری کے سامنے نہ کہہ سکی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح تمہیں اس خوبصورت چیز سے دور رکھوں۔“

زیر شاہ نے ناگواری سے کہا ”تمہیں اپنی معصوم اور اپناج پوتی کے بارے میں ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہیے ہیں۔“

”وہ میری پوتی نہیں ہے۔“

”پھر کون ہے۔۔۔۔۔؟ کیا تمہارا اس سے خونی

رشتہ نہیں ہے؟“

”ہاں خونی ہے مگر میں بتا نہیں سکتی کہ وہ کیا رشتہ

ہے۔ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو بتائے

نہیں جاسکتے۔ یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے میں اس سلسلے

میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔“

”تم یہ نہیں بتا سکتیں مگر یہ بتا رہی ہو کہ وہ اپناج

لڑکی چڑل ہے۔ کہو وہ تمہارے گھر کی اور تمہارے

خاندان کی ایک فرد نہیں ہے؟“

نکلانی کپڑوں کو چھڑا نہیں سکو گے۔“

زیر شاہ کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک نادیدہ استخوانی ہاتھ نے اس کی کلائی پکڑ لی ہو وہ خیالی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس نے چونک کر وحشت زدہ نظروں سے اس بوڑھی خبیثہ کو دیکھا جو دوسری طرف منہ کیے کیتلی میں چائے اٹھیل رہی تھی۔ زیر شاہ نے سر جھکا کر اپنی کمر سے لگے ہوئے لستر کو دیکھا جس میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ ریوالور کی موجودگی سے وہ مطمئن ہو کر مسکراتے لگا۔ بوڑھی عورت چائے کا کپ اور کیتلی ٹرے پر رکھ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔

”میرے ساتھ آؤ کھانے کے بعد تمہیں ایسی چائے پلاؤں گی کہ تمام رات خوابوں میں جنت کی سیر کرتے رہو گے۔“

زیر شاہ نے روٹی اور سالن کی پلیٹیں اٹھا کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا تھا کہ میں چائے نہیں پیتا۔“

بڑھیا نے چونک کر اسے دیکھا پھر اس سے نظریں ٹکراتے ہی سنبھل کر بولی ”عجب ہے آج کل کے نوجوان چائے بڑے شوق سے پیتے ہیں اور تم اس سے پرہیز کرتے ہو۔ اگر تم کہو تو میں دودھ گرم کر کے لے آؤں۔“

زیر شاہ نے پلیٹیں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے سامنے جو کھانا ہے میں صرف وہی کھاؤں گا دودھ بچے پیتے ہیں ہم پولیس والوں کو صرف دشمنوں کا لہوا چھالتے ہوئے مزد آتا ہے۔“

وہ میز کے دوسری طرف رکھی ہوئی کمری پر بیٹھتے ہوئے ناگواری سے بولی ”تم بہت زیادہ ہی ڈنکیں مارتے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اناڑی ہو مگر میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی یہ کیسی نادانی اور ناتجربے کاری ہے کہ بغیر سوچے سمجھے اس حویلی میں رات گزارنے کیلئے تیار ہو گئے ہو۔“

زیر شاہ نے لقمہ چباتے ہوئے انجان بن کر پوچھا ”کیوں اس حویلی میں ایسی کیا بات ہے؟“

کیا یہاں رات گزارنے والے مسافروں کو تم لوٹ لیا کرتی ہو؟“ اس کے جواب دہیتے سے پہلے ہی ایک

دیکھتے ہی وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی پھر جبرا مسکراتی ہوئی بولی۔

”میں قانون کا احترام کرتی ہوں۔ تمہیں شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی۔“

دو فوراً ہی گرم ہو جاتی تھی اور فوراً ہی نرم پڑ جاتی تھی۔ ریوالور کو دیکھتے ہی اس کے جبراً مسکرانے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بہت مکار ہے۔ زیر شاہ نے ریوالور کو اپنے سامنے میز پر رکھ کر بیٹھے ہوئے کہا۔

”اگر تم قانون کا احترام کرتی ہو تو اس بات کا ثبوت پیش کرو کہ چندیری وہ نہیں ہے جو نظر آتی ہے۔ میں کسی ثبوت کے بغیر تمہاری بات تسلیم نہیں کروں گا۔“ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ”میں کیسے ثبوت پیش کروں۔ آدھی رات کے بعد وہ جس بھیاں تک دریا میں آتی ہے اسے تم دیکھ نہیں سکو گے اور اگر دیکھنے کیلئے اس کا سامنا کرو گے تو پھر یہ حویلی تمہارا دفن بن جائے گی۔ آج تک کوئی چشم دید گواہ اس حویلی سے باہر نہیں جاسکا۔“

”میں ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔“ ”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں تمہیں خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی۔ تمہیں چندیری کے اصل روپ کو سمجھنے کیلئے ذرا عقل سے کام لینا چاہیے۔ کیا تم نے چندیری کے دونوں ہاتھوں کو نہیں دیکھا۔ تم شاید میری بات کا یقین نہیں کر دو گے مگر یہی دونوں ہاتھ چانکھار کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ ہاتھ ابھی اس لئے مفلوج ہیں کہ حویلی سے باہر جا کر اس قاتل نوجوان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ آدھی رات کے بعد جب وہ اپنے اصلی روپ میں آنے لگی تو وہ دو ہاتھ اسے واپس مل جائیں گے۔“ زیر شاہ بڑی گہری نظروں سے بوڑھی عورت کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے یہ باتیں کہہ رہی تھی۔ زیر شاہ نے کہا۔

”تم کہتی ہو کہ مجھے ذرا عقل سے کام لینا چاہیے مگر عقل ایسی باتیں تسلیم نہیں کرتی پھر میں کیسے تسلیم کر لوں کہ وہ مفلوج ہاتھوں والی ایسی ظالم ہے جیسا کہ تم لفظوں میں پیش کر رہی ہو۔“

بوڑھی اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی ”ہاں تم میری

چندیری میرے خاندان کی ایک فرد ضرور ہے۔ میں اس سے بہت زیادہ محبت بھی کرتی ہوں مگر تم انسان کے جان و مال کے محافظ ہو اس لئے میں تمہاری حفاظت بھی کرنا چاہتی ہوں میری بات مان لینے میں کیا حرج ہے۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم صبح تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلو۔“

زیر شاہ نے پھر اُلجھتے ہوئے کہا ”اگر میں تمہاری بات مان لوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چندیری کو ایک مجرمہ تسلیم کر رہا ہوں۔ تم بھی قانون کی زد میں آؤ گی کیونکہ تم نے بقول تمہارے ایک چڑیل کو پناہ دے رکھی ہے۔“

”بے شک وہ انسانی لہو کی پیاسی ہے اور میں نے اسے پناہ دے رکھی ہے۔ ہم دونوں قانون کی زد میں آتے ہیں لیکن تم ثابت کیسے کرو گے کہ ہم دونوں مجرم ہیں۔ کیا تم نے کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو خلاف قانون ہو۔ یہ بات تو میں نے صراحت تمہاری بھلائی کیلئے کہی ہے۔“

زیر شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی وہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ اس حویلی میں آدھی رات کے بعد خونی ڈرامہ کھیلا جاتا ہے۔ اس نے بوڑھی عورت سے کہا ”میں آج تمام رات جاگتا رہوں گا اور یہ دیکھوں گا کہ تم دونوں میں سے چڑیل کون ہے؟“

”کیا؟“ بڑھیا نے چیخ کر کہا ”تم۔۔۔ تم مجھے چڑیل کہہ رہے ہو۔ کیا چندیری نے تم سے کہا ہے کہ میں چڑیل ہوں۔ وہ جھوٹی ہے میں اس کا گلا دبا دوں گی۔“ زیر شاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اسے ایسی کوئی بات نہیں کہنی چاہیے تھی جس سے چندیری پر الزام آتا ہو۔ اس نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔

”میں نے یہ کب کہا ہے کہ چندیری تمہیں چڑیل کہتی ہے۔ یہ تو میں خود اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تو تم بھی چڑیل ہی نظر آتی ہو۔“

وہ غصے سے جھلا کر ایک جھٹکے سے اس طرح اٹھی جیسے ابھی اس کی گردن دبوچ لے گی۔ زیر شاہ بھی بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اتنی ہی پھرتی سے اس نے ریوالور نکال کر اسے نشانے پر رکھ لیا۔ ریوالور

بات کا اعلان نہیں کرو گے۔ ایک حسین جوان عورت کے سامنے بوڑھی کھنڈر نما عورت کی باتیں بے وزن ہوتی ہیں۔“

☆☆☆

زیر شاہ کمرے میں آکر پہلے چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا۔ کمرے کے کھڑکی اور دروازے اندر سے بند تھے۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ سونے سے پہلے وہ کمرے کے در و دیوار اچھی طرح چیک کرے گا مگر نیندا بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ابھی وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ دادی اور پوتی کی باتوں نے اسے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ان کی باتوں کی روشنی میں یہ سمجھنا اور پرکھنا ضروری تھا کہ دونوں میں کون سچی اور کون جھوٹی ہے؟

اس نے سگریٹ کیس اور لائٹر جیب سے نکال کر ایک تپائی پر رکھا اور قریب ہی ایک ایزی چیئر پر نیم دراز ہو گیا۔ پہلے اس نے چندیری کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ اس کے متعلق سوچتے ہی وہ تصور میں اپنے مفلوج ہاتھ لئے اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اس کی شہزادہ پٹکانے والی ریشمی آوازا اس کی معصومیت آنکھوں کو چکاچوند کرنے والا حسن اور جاذب نظر بدن سب کچھ ایسا تھا کہ اسے کسی پہلو سے بدھیت اور بد شکل چڑیل نہیں کہا جاسکتا تھا۔ پھر بچپن میں سنی ہوئی باتیں یاد آئیں کہ چڑیلیں خوبصورت عورت کے روپ میں آتی ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ ٹخنوں کی طرف سے ان کے نیچے پیچھے کی طرف مڑے ہوتے ہیں اور چندیری کے دونوں ہاتھ مفلوج تھے اس طرح وہ پیچھے کی طرف بھی مڑ سکتے تھے۔ اس نے چشم تصور میں اس کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کی طرف مڑے ہوئے دیکھا۔ اس کے باوجود وہ ایک ذرا سی بد صورت یا قابل نفرت نظر نہیں آئی بلکہ بہت محبوب، معصوم اور ہمدردی کے قابل نظر آئی تھی۔

زیر شاہ کو اس کی مخالفت میں صرف ایک پوائنٹ ملا وہ یہ کہ چڑیلیں حسین عورت کے روپ میں سامنے آتی ہیں اس نے اس پوائنٹ کو محفوظ رکھا پھر سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر اس بوڑھی عورت کے متعلق سوچنے لگا۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ لائٹر تپائی پر رکھا ہوا تھا اور وہ بوڑھی خالوں میں

زیر شاہ کھانا ختم کر چکا تھا۔ اپنے ریوالور کو تھام کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ زیر شاہ کو اس کمرے کی طرف لے جانا چاہتی تھی جو اس کیلئے مخصوص تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بوڑھی عورت نے کہا۔

”تمہارا کمرہ بہت محفوظ ہے۔ کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند ہو جاتی ہیں۔ کیا میں یقین کروں کہ تم میری بات پر عمل کرو گے؟“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چندیری کے متعلق ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو جبکہ تم اس سے بے حد محبت کرتی ہو۔ کیا تمہیں اس بات کا ذرا نہیں ہے کہ میں کسی طرح بھی قانون ہیرا پھیری سے اسے گرفتار کر سکتا ہوں اور اسے اذیتیں پہنچا کر اس کی اصلیت معلوم کر سکتا ہوں۔“

وہ ایک کمرے کے دروازے پر آکر رُک گئی پھر اسے دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی ”اسے اذیتیں پہنچانا تو بہت دور کی بات ہے۔ وہ اتنی حسین اور نازک ہے کہ تم اسے صرف ایک پھول کی طرح سمجھنا چاہو گے۔ یہ تمہارا کمرہ ہے جاؤ آرام سے بستر رلیٹ کر اپنے دل کو ٹٹو لو کہ تم کسی حال میں بھی اس پر ظلم کرو گے یا اسے اپنی آغوش میں لینے کی تمنا کرو گے؟“

زیر شاہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ”تم بھی یہاں سے جا کر اپنے دل کو ٹٹو لو اور اپنے جسموت اور سچ کو سمجھو۔ ویسے میں سمجھ گیا ہوں کہ تم محض اپنی حسین پوتی کو مجھ سے دور رکھنے کیلئے اسے ایک ہسٹلنگ روپ میں پیش کر رہی ہو۔ میں اناری نہیں ہوں جیسا کہ اب تک تم مجھے کہتی آئی ہو۔“

یہ کہہ کر زیر شاہ نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ بوڑھی عورت بند دروازے کو گھورنے لگی پھر وہ بہت آہستگی سے زریب بڑبڑانے لگی۔

”چراغ بجھنے سے پہلے بہت زیادہ بھڑکتا ہے اس انارٹی کی زبان بھی بند ہونے سے پہلے فنی کی طرح تیز کی سے چل رہی ہے۔ بہت جلد ہی یہ زبان کی پیچی کند

اس کے چاہنے والی تھی۔ اسے تصور میں دیکھتے ہی اس کی بہت سی باتیں یاد آئیں۔ اسے یاد آیا کہ جب تک وہ چندیری کے سامنے تھی اور اسے کھانا کھلا رہی تھی اس وقت وہ چندیری کی حمایت اور ہمدردی میں باتیں کر رہی تھی اور اس سے دور ہوتے ہی بوڑھی نے چندیری کو چڑیل بنا دیا تھا۔ ایسی دورخی باتیں تو کوئی چڑیل ہی کر سکتی ہے۔ اس طرح اس نے بوڑھی عورت کی مخالفت میں ایک پوائنٹ نوٹ کر لیا۔

پھر اس کے دماغ میں دوسرا خیال یہ آیا کہ چندیری حویلی کی چار دیواری میں محدود زندگی گزار رہی ہے۔ اس حویلی سے باہر کیا ہو رہا ہے وہ نہیں جانتی۔ وہ دوپرا سرار ہاتھ باہر جو کچھ کر رہے تھے ان کی کہانی بوڑھی عورت نے ہی سنائی تھی۔ ایسا سوچتے وقت خیالوں میں بیٹھی ہوئی بڑھیا کے وہ ہاتھ نظر آئے۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبایا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ نے آگے بڑھ کر لائٹر اٹھایا اور سگریٹ کا سلگا دیا۔ سگریٹ سلگانے کے بعد اس ہاتھ نے لائٹر کو تپائی پر رکھ دیا۔ وہ سوچ میں اس قدر غم ہو گیا تھا کہ سگریٹ کے کش لگاتے وقت سوچنے میں اور لطف آ رہا تھا۔

اس نے بڑھیا کے خلاف دوسرا پوائنٹ نوٹ کیا کہ پراسرار ہاتھوں کے بارے میں صرف بوڑھی ہی جانتی ہے اور ایک نوجوان مرد کو اپنی حسین پوتی سے دور رکھنے کیلئے ان پراسرار ہاتھوں کو اس کے مطلوب ہاتھوں سے وابستہ کر رہی ہے۔ بڑھیا ایسی باتیں کہہ کر صرف بارہ بجے تک اپنی پوتی سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ کیونکہ بارہ بجے تک وہ محض ایک بوڑھی اور کمزور عورت ہے۔ بارہ بجے کے بعد اپنا روپ بدلے گی۔ اچانک ہی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ دیوار گیر گھڑی نے گیارہ بجائے تھے۔ رات دو حصوں میں تقسیم ہونے کیلئے ایک گھنٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ رات کے دوسرے حصے میں کیا ہوئی والا ہے؟ اس کے متعلق وہ زیادہ سوچ نہ سکا۔ اچانک ہی اسے خیال آیا کہ وہ سگریٹ کے کش لگا رہا ہے۔ اس نے چونک کر لائٹر کی طرف دیکھا جو تپائی پر رکھا ہوا تھا پھر سگریٹ کو انگلیوں میں لے کر دیکھنے لگا۔

میں نے سگریٹ کب سلگایا؟ مجھے یاد نہیں آ رہا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

استخوانی ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا وہ اس سے مدد کی توقع کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ کچھ دیر تک رُکے رہے پھر ایک ہاتھ نے آگے بڑھ کر زبیر شاہ کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔ چائن کمہار کو شبہ ملی تو وہ پھر اس پر حملہ کرنے لگا۔ زبیر شاہ نے پہلے دو چار گھونٹے کھاتے ہوئے استخوانی ہاتھ کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ واپس چلا گیا تھا۔ جیسے ہی وہ دور ہوا اس نے پھر چائن کمہار کی پٹائی شروع کر دی۔

چائن کمہار کی آنکھوں کے سامنے پھر تارے ناچنے لگے۔ اس کی ناک اور باجھوں سے خون رسنے لگا۔ وہ چکرا کر فرش پر گرنے والا تھا کہ اسی وقت استخوانی ہاتھ نے ریوالور کے دتے سے زبیر شاہ کے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ زبیر شاہ کے حلق سے ایک گراہ نکلی پھر وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے آخری بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے دشمنوں کو دیکھنے کی کوشش کی وہ ایسی حالت میں بھی دشمن سے مقابلے پر کمزور نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن اس کی قوت برواشت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس کے پیانغ میں کھٹ کھٹ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس نے سر کو جھٹک کر اس آواز کو سمجھنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ کوئی دروازے کو پیٹ رہا ہے۔ اس نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسی کمرے میں تھا جہاں اس نے چو دروازہ دریافت کیا تھا۔ اس وقت وہ بستر سے اٹھنے لگا تو سر کے پچھلے حصے سے ٹیمپیں اٹھنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ دروازے کو اب تک کوئی پیٹ رہا تھا۔ اس نے دروازے کی جانب دیکھا اسے کھولنے کا خیال آیا تو سب سے پہلے ریوالور کا بھی خیال آیا پھر یہ دیکھ کر اس کی حیرت نہ رہی کہ ریوالور اس کے ہولسٹر میں موجود تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیسی دشمنی کی گئی ہے۔ وہ استخوانی ہاتھ اس کی جان بھی لے سکتا تھا لیکن اس ہاتھ نے اس کی جان لینے کی بجائے اس کا ریوالور واپس کر دیا تھا

”میں وہی قاتل ہوں جسے تم گرفتار کرنے آئے ہو۔“ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو تمہارا ہی نام چائن کمہار ہے؟“

”ہاں۔ میرا نام چائن کمہار ہے یہ ریوالور جیب میں رکھ لو کیونکہ میری حفاظت ایک ایسی نادیدہ قوت کر رہی کہ اس کے سامنے تمہارا یہ ریوالور کسی کام نہیں آئے گا۔“

”میں کسی نادیدہ قوت سے نہیں ڈرتا ہوں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ تم خود کو قانون کے حوالے کر دو ورنہ میں تمہاری لاش کو یہاں سے گھسیٹے ہوئے لے جاؤں گا۔“ زبیر شاہ نے سخت لہجے میں کہا۔

اس کی بات سن کر چائن کمہار قہقہے لگانے لگا۔ زبیر شاہ نے گرجتے ہوئے کہا۔

”میں تین تک گنتا ہوں کتنی ختم ہوتے ہی میں تمہاری ٹانگوں پر گولی چلا دوں گا پھر تم بھاگنے کے قابل نہیں رہو گے۔ ایک۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ تین۔۔۔۔۔“

اس کے بعد زبیر شاہ نے گولی چلا دی مگر اس کا نشانہ بہک گیا کیونکہ اچانک ہی اس کے ریوالور والے ہاتھ کی کلانی پر استخوانی ہاتھ نے نیچے میں آگئی تھی۔ اگر کوئی مقابلے پر آ کر اس کی کلانی پکڑتا تو وہ یقیناً اس پر جوازی حملہ کرتا مگر جس استخوانی ہاتھ کو وہ محض قہقہے کہانی کی بات سمجھ رہا تھا سچ محض خود کو اس کی گرفت میں دیکھتے ہی اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ اس استخوانی ہاتھ نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ صرف اس ریوالور کو فرش سے اٹھا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ زبیر شاہ بوکھلا کر اس ہاتھ کو دیکھ رہا تھا لیکن اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ آگے بڑھ کر اس ریوالور کو چھین لیتا۔ اسی وقت چائن کمہار نے اس پر چھلانگ لگائی اور اس پر گھونٹے برساتا ہوا ایک طرف لے گیا۔

تھوڑی دیر تک تو زبیر شاہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ متواتر گھونٹے کھانے کے بعد ہوش آیا کہ اس کے مقابلے پر ایک زندہ انسان ہے پھر تو چائن کمہار کی شامت آگئی۔ جب اس کے منہ اور ناک پر گھونٹے بڑھنے لگے تو وہ لار بار لار کھرا کر

اور اپنے بھی کمرے میں واپس پہنچا دیا گیا تھا۔ ساتھ باتیں کرتا ہوا کمرے کے اندر آتا۔ چندیری پلنگ کے سرے پر بیٹھ کر واقعہ سن رہی تھی جو زبیر شاہ پر گزر چکا تھا۔ اس کے دونوں مفلوج ہاتھ اس کے زانوؤں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ ایسی سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ حادثہ زبیر شاہ کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے ساتھ پیش آیا ہو۔ زبیر شاہ نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکے تو آگے بڑھ کر ان لرزتے ہوئے موتیوں کو اپنے رومال میں جذب کر لے۔ اس طرح سے چھونے کا بہانہ مل جاتا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا اسے کسی بہانے چندیری کو چھونے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ پھول کی نازک پتی کو یا ریشم کی چکنائٹ کو بے اختیار ہاتھ بڑھا کر چھونے کیلئے دل مچلتا ہے لیکن چندیری کی شخصیت میں کچھ عجیب سی بات تھی۔

اس کا سامنا لیتا ہوا بدن اسے پکارتا ضرور تھا مگر اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ کسی عہد و بیان کے بغیر یا اس کی رضا مندی کے بغیر اسے چھونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی نظر آئیں زبیر شاہ کی خواہش پوری کرنے کیلئے آنکھوں سے ایک قطرہ بھی باہر نہ آیا۔ وہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں کتنی مجبور اور بے بسی ہوں کہ تمہارے سر پر چوٹ آئی ہے اور میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری مرہم پٹی تک نہیں کر سکتی۔“

”ہم پولیس والے آئے دن ایسے زخم کھاتے ہیں۔ آج پہلی بار تمہاری جیسی حسین لڑکی نے میرے زخم پر مرہم رکھنے کی بات کی ہے۔ واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ تم ہاتھ بڑھا کر مجھے چھو نہیں سکتی لیکن میری خواہش ہے کہ میں آگے بڑھ کر تمہیں چھو لوں، تمہیں اپنے سینے سے لگا کر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سکون پہنچاؤں۔“ زبیر شاہ نے محبت سے کہا اور وہ شرم سے دوہری ہو گئی پھر آہستگی سے التجا آمیز لہجے میں بولی۔

”زبیر صاحب! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ یہاں ایک سنگ کتنے ہی نوجوان مسافر آ رہے ہیں لیکن

اسی کے جواب میں ”اوں۔۔۔ اوں۔۔۔“ کی آواز سنائی دی۔ اس نے آواز کی نزاکت سے اندازہ لگا لیا کہ دروازے کے دوسری طرف چندیری ہے۔ اس کی اوں اوں سے پتا چل رہا تھا کہ کسی نے اس کے منہ کو دبا رکھا ہے۔ شاید وہ اتنی دیر سے زبیر شاہ کو مدد کیلئے پکار رہی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آیا پھر فوراً ہی اس نے کندی کھول کر دروازہ کو دھکیلا۔ وہ خطرہ پاتے ہی گولی چلانے کیلئے تیار تھا مگر باہر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کھلے ہوئے دروازے کے سامنے چندیری تباہ کھڑی تھی۔ اس کے دونوں مفلوج ہاتھ بدن کے اطراف جھول رہے تھے اور وہ دووہ سے بھرا ہوا جگ دانٹوں سے پکڑے ہوئے تھی اور شاید پاؤں کی ٹھوکر سے دروازے پر ہتک دے رہی تھی۔ زبیر شاہ نے دووہ سے بھرا جگ اپنے ہاتھ میں لے لیا تب وہ پریشان ہو کر بولی۔

”صبح ہو چکی ہے۔ میں تین بجے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ جب تم وعدے کے مطابق نہیں آئے تو میں پریشان ہو گئی۔ پہلے میں دادی اماں کے کمرے کی طرف گئی ان کا کمرہ اندر سے بند ہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ سو رہی ہیں پھر میں کچن میں جا کر تمہارے لئے یہ دووہ لے کر آئی ہوں۔“

زبیر شاہ نے بہت سے محبوبانہ اداؤں کے متعلق پڑھا اور سنا تھا لیکن دانٹوں سے دووہ کا جگ پکڑ کر لانے والی محبوبانہ ادا پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ اس کے

بھی مسافر رات گزارنے کیلئے آیا ہے۔ وہ اس کے سامنے مجھے چیل کہتی ہیں۔ تم سے بھی یہی کہا کیا تم نے یقین کر لیا؟“

تمہیں دیکھ کر کوئی بھی ان کی بات پر یقین نہیں کر سکتا البتہ ایک ملکا سا مجس پیدا ہوتا ہے کہ ایک دادی اپنی پوتی کے متعلق ایسی باتیں کیوں کرتی ہے؟“

”در اصل وہ لوگوں کو اس اُبھرنے میں مبتلا کر کے رکھتی ہے۔ ایک تو وہ خود چیل نظر آتی ہے لوگ اس کے متعلق بھی سوچتے ہیں اور میرے بارے میں اُبھرنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ میری خوبصورتی کو چارہ بنا کر پیش کرتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ نوجوان ضدی اور جذباتی ہوتے ہیں۔ مجھ جیسے حسین مجسمے کو حاصل کرنے کیلئے وہ ایک دو راہیں یہاں گزاریں گے اور اس کی خوراک بن جائیں گے۔“

”پھر تو وہ میرے لئے بھی یہی چاہے گی کہ میں ایک دو راتیں یہاں گزاروں۔ اس کیلئے وہ تم سے شادی کرانے کا جھوٹا وعدہ بھی کر سکتی ہے۔“

”نہیں۔ جب شادی کی بات آئے گی تو وہ تم سے فریب نہیں کرے گی اور نہ ہی تمہیں نقصان پہنچائے گی کیونکہ تم اس کے ہو یا نہ ہو لے وا دے گے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو مجھ سے پہلے بھی یہاں ٹھہرنے والے نوجوان مسافروں نے بڑھیا کے سامنے تم سے شادی کی درخواست کی ہوگی پھر اس نے انہیں داماد کیوں نہیں بنایا؟“

”اس لئے کہ اس سے پہلے میں خود شادی سے انکار کرتی رہی ہوں اور تمہاری شریک حیات بننے سے پہلے بھی میں ایک شرط پیش کروں گی۔“

”وہ کیا شرط ہے؟“

چندیری کچھ لمحوں تک شرماتی رہی پھر ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ”شادی کے بعد میں کسی بچے کی ماں نہیں بنوں گی۔“

”یعنی ہم شادی کی پہلی رات سے ہی خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کریں گے۔“

”ہاں میں بھی چاہتی ہوں۔“

میں نے کسی اوقات موقع نہیں دیا کہ وہ مجھے ہاتھ مل سکے۔ میں نے اپنے آپ کو صرف اس ہستی کیلئے سنبھال کر رکھا ہے جو میرا شوہر ہوگا اور میرے جسم و جان کا مالک ہوگا۔“

زیر شاہ نے کہا۔ ”تمہارے یہ پاکیزہ خیالات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے بھی ایک ایسی ہی شریف زادی کے انتظار میں اب تک شادی نہیں کی ہے۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی ”میں برسوں سے یہ خواب دیکھتی آرہی ہوں مگر اب تک اس خواب کی تعبیر نہیں ملی۔“

”تم یقین کرو میں تمہارے خوابوں کی تعبیر بن کر آیا ہوں۔ میں تمہیں یہاں سے اپنی دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔“

”جب تک واوی اماں زندہ ہیں یہ ممکن نہیں ہے۔“ اس نے افسردگی سے کہا اور زیر شاہ اس کی یہ بات سن کر طیش سے بولا۔

”میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔“

”وہ تمہارے ہاتھ نہیں آئیں گی۔“

”کیسے ہاتھ نہیں آئیں گی۔ ابھی وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ کیا میں وہاں پہنچ کر اس کا کام ختم نہیں کر سکتا؟“

”نہیں اس کمرے میں کھڑکیاں اور دروازے بہت مضبوط ہیں۔ تم انہیں توڑنے کی کوشش کرو گے تو وہ نیند سے بیدار ہو جائیں گی۔“

”پھر تم بتاؤ کہ ہم کس طرح اسے راستے سے ہٹا سکتے ہیں؟“

”تم ان سے نفرت کرنے کی بجائے محبت سے پیش آ کر انہیں ختم کر سکتے ہو۔ جب وہ سو کر اٹھیں تو ان سے ہنس کر بول کر باتیں کرو اور ان سے درخواست کرو کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے میرے سامنے تمہیں چیل کہا ہے۔ پھر وہ کس طرح مجھے تم سے شادی کرنے کی اجازت دے گی۔“

”تم ان کی چال بازیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ یہاں جو

ایک حسین آلہ کار مل جائے گا۔ کچھ دیر مزید سوچتے رہنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
 ”چندیری میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ صرف تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں اولاد کی خواہش نہیں کروں گا اور تمہیں اس ویران حویلی سے دلہن بنا کر لے جاؤں گا مگر تمہیں دلہن بنانے سے پہلے کچھ اور معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”میں جو کچھ جانتی ہوں تمہیں ضرور بتاؤں گی تم کیا پوچھنا چاہتے ہو مجھ سے؟“

”شادی کرنے کیلئے ایک دوسرے کے خاندانی حالات سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو کیا بتاؤں گا کہ میری دلہن کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔“
 ”دو سال پہلے ایک ملازمہ رکھی گئی۔ وہ میری دوست بن گئی تھی۔ اس دوست کی مدد سے میں اس حویلی میں موجود لائبریری سے کتابیں وغیرہ منگوا کر پڑھتی تھی۔ پھر ایک دن میری دوست نے مجھے ایک ڈائری دکھائی جو دادا جان کی تھی۔ میں نے اپنی اس دوست کی مدد سے وہ ڈائری بھی پڑھ لی لیکن دادا جان ماں کو میری اس سے دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی چنانچہ ایک دن دادا جان نے اسے اس طرح ڈرایا کہ وہ اس کے بعد سے آج تک حویلی میں آئی نہ ہی اس کے بعد کوئی ملازم یہاں رکھا گیا۔“

”بڑی خطرناک ہے وہ بوڑھی چڑیل لیکن تم یہ بتاؤ کہ کیا میں وہ ڈائری پڑھ سکتا ہوں؟“ زبیر شاہ نے کہا

”چلو“ چندیری نے کہا اور زبیر شاہ چندیری کی رہنمائی میں چل پڑا۔ چندیری اسے ایک کمرے میں لے گئی اور ایک الماری کی وراز کھولنے کیلئے کہا جس میں ایک ڈائری پڑی ہوئی تھی۔ چندیری کے اشارے پر زبیر شاہ نے وہ ڈائری اس جگہ سے نکال لی پھر دونوں واپس اسی کمرے میں آ گئے تھے۔ چندیری نے کہا۔

”تم آرام سے یہ پڑھو میں کچھ دیر تک آتی ہوں۔“

”ہاں۔ دادی اماں کہتی ہیں کہ میرے بطن سے جو پہلی لڑکی پیدا ہوگی وہ میں ان کے حوالے کر دوں۔“
 ”کیا وہ میری بیٹی سے دشمنی کرے گی؟“

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔ وہ میری طرح میری بیٹی کی بھی بہت محبت سے پرورش کریں گی۔ وہ جتنی جی کہ میری طرح میری بیٹی بھی بے حد حسین ہوگی پھر وہ مسافروں کو پھانسنے کیلئے میری بیٹی کے حسن و شباب کو چارہ بنا میں گی اسی لئے میں چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد ہماری کوئی اولاد نہ ہو۔“

”ایسا کب تک ہوگا۔ کیا ہم تمام عمر بے اولاد رہیں گے؟“

”مجھ پر یہ ہے۔ دادی اماں کو بڑی آسانی سے اور سہولت سے ختم کرنے کیلئے ہمیں یہی کرنا ہوگا۔ وہ باہر سے کسی لڑکی کو اٹھا کر اپنا آلہ کار بنانے کیلئے نہیں لائیں گی بلکہ صرف اپنے خون پر اعتماد ہے۔ ان کا یہ اعتقاد درست ہے کیونکہ میں خولی رشتے کے تحت اب تک خاموش رہی ہوں۔ یہاں کتنے ہی نوجوان آئے اور مجھے پردل و جان سے عاشق ہوتے رہے لیکن میں نے صرف تمہارے سامنے دادی اماں کی اصلیت بیان کی ہے۔ اگر تمہیں اولاد کی خواہش ہے تو میرا خیال چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ اور یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم کسی بھی طرح دادی اماں کو نقصان پہنچا سکو گے یا انہیں قانونی گرفت میں لے آؤ گے۔ تمہیں ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔“ چندیری نے کہا اور پھر وہ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئی۔

زبیر شاہ کچھ سوچنے لگا سوچنے اور غور کرنے کیلئے بہت سی باتیں تھیں۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس بوڑھی چڑیل کو قانونی گرفت میں لانے کیلئے کوئی ثبوت نہیں حاصل کر سکے گا۔ فی الحال یہی دانش مندی نظر آرہی تھی کہ وہ چندیری کو اس بوڑھی چڑیل کی گرفت سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے اور پھر اس سے شادی کر لے اور اس بڑھیا کو حسین آلہ کار سے محروم کر دے۔ وہ اسی انتظار میں اپنا بڑھیا گزار رہے گی کہ چندیری کی بیٹی ہوگی تو اسے مزید بڑھتا دیکھنے کیلئے

”ٹھیک ہے“ زبیر شاہ نے کہا پھر چندیری چلی گئی اور وہ ایک آرام گزری پر دروازہ ہو گیا۔ اس نے ڈائری کھول لی۔

پہلے صفحے پر نواب شیر زمان کا نام لکھا تھا۔ اندر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی۔ شیر زمان نے جنگ آزادی کے وقت انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لئے فرنگی آقاؤں نے خوش ہو کر سندیلی کے کنارے ایک بہت بڑی جاگیر انعام کے طور پر نواب شیر کو دی تھی۔ اس وقت اس جاگیر میں ایک حویلی تعمیر کی گئی تھی۔ حویلی تعمیر کرانے کے بعد نواب شیر زمان ایک بہت ہی خوبصورت دہن بیاہ کر لائے جس کا نام سنگیتا تھا۔ سنگیتا کے حسن کا چرچا دور دور تک تھا۔ نواب صاحب اسے سات پروں میں چھپا کر رکھتے تھے کہ کہیں کسی کی میلی نگاہ اس پر نہ پڑ جائے پھر شادی کے دو سال بعد سنگیتا نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام اکبر زمان رکھا گیا۔

ڈائری میں آگے نواب صاحب نے لکھا تھا کہ ان کا بیٹا بڑا ہوا تو انہوں نے اچھی تعلیم کے حصول کیلئے اسے بورڈنگ اسکول میں داخل کروادیا۔ پھر ایک دن انہیں اپنی بیوی پر شک ہو گیا اور انہوں نے مختلف طریقوں سے اس کی نگرانی کی تو پتا چلا کہ وہ حویلی کے ایک خوبرو ملازم کے عشق میں مبتلا ہے۔ نواب صاحب نے ملازم کو بڑی ہوشیاری سے غائب کروادیا اور بیوی کو قید کروادیا اور لوگوں میں شہور کرادیا کہ ان کی بیوی بے وفائی کر کے ایک ملازم کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ انہوں نے شدید غصے کے عالم میں اپنی بیوی کے دونوں ہاتھ تیزاب میں ڈال کر ضائع کر دیئے۔ پھر سنگیتا جانبر نہ ہو سکی اور قید خانے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی۔

زبیر شاہ ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ورق کے ساتھ ساتھ وقت بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ نواب شیر زمان کا بیٹا اکبر زمان جوان ہو چکا تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی پھر نواب صاحب کی بہو نے ایک خوبصورت بیٹی کو جنم دیا۔ ان کی ننھی سی پوتی کا حسن ہر اعتراف سے کھل تھا لیکن ان کے دونوں ہاتھ کھنکھانے لگے۔

”کراٹھوں تک مفلوج تھے۔“ اپنی پوتی کے دونوں ہاتھوں کو دیکھ کر نواب صاحب کو سنگیتا کے ہاتھ یاد آئے۔ ان کی بہو نے جب اپنی بیٹی کے مفلوج ہاتھوں کو دیکھا تو صد سے صد روئے گئی۔ اس نے روتے روتے بتایا کہ جب وہ حاملہ تھی تو اسے اکثر وہ ہاتھ نظر آتے تھے اور کسی عورت کی آواز سنائی دیتی تھی وہ کہتی تھی کہ میرے ہاتھ تیرے بڑوں کی زیادتی کی وجہ سے جاتے رہے اگر تیری بیٹی ہوئی تو اس کے بھی ہاتھ مفلوج ہوں گے اور تیری بیٹی کو میں اپنے پاس رکھوں گی۔ نواب صاحب نے خود کو ان دونوں کا مجرم گردانتے ہوئے اپنے بیٹے کو ساری حقیقت بتادی۔

اس کے بعد ڈائری ختم ہو گئی تھی۔ زبیر شاہ نے اخذ کیا کہ بیٹے نے ضرور باپ سے بدلہ لیا ہو گا۔ پھر اکبر زمان اور اس کی بیوی کا کیا ہوا؟ لیکن اس ڈائری سے یہ تصدیق ہوئی تھی کہ بوزی دادی جڑیل سے ہے اور یہ اس کی پوتی چندیری ہے جو نواب شیر زمان کی اصلی وارث ہے۔

زبیر شاہ کو ایک اور حقیقت پتا چلی کہ چندیری تو بہت بڑی جائیداد کی مالک ہے۔ بہر حال زبیر شاہ ڈائری بند کر کے سگریٹ سلگانے لگا۔ اسی دوران چندیری آگئی اور زبیر شاہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”تم نے ڈائری پڑھ لی ہوگی۔ اس کے بعد کے واقعات مجھ سے سن لو۔ میرے باپ نے میرے دادا کو اپنے ہاتھوں سے مار دیا تھا لیکن پھر میرے والد میرے غم میں کھل کھل کر مر گئے۔ پھر جب میں دس سال کی تھی تو میری زندگی میں ایک زبردست تبدیلی آئی۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“ زبیر شاہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”ایک دن حویلی میں ایک نہات ہی حسین عورت آئی۔ وہ ای کے سامنے اپنا دیکڑا رونے لگی کہ وہ بیوہ ہے اور دنیا والے اس کے حسن اور جوانی کو ہوس کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں کہیں بھی عورت ڈاکڑوں سے زبردانی گزارنے کو جگ نہیں ہے۔“

نے اس پر ترس اٹھا کر ایسے خوں میں بٹھا دے گی۔ وہ عورت میرا بڑا خیال رکھنے لگی۔ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی اور کپڑے پہناتی تھی۔ اس عورت کے آنے کے بعد ایک دن مجھے محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ حرکت کر رہے ہیں۔ پہلے تو میں نے اسے وہم سمجھا لیکن پھر میں نے باقاعدہ محسوس کیا کہ کبھی میرے دونوں ہاتھوں میں جان آ جاتی ہے اور کبھی یہ پہلے جیسے ہو جاتے ہیں۔ میں نے ای سے کہا تو انہوں نے بھی مختلف وقتوں میں میرا جائزہ لیا اور حیران رہ گئیں۔ لیکن میرے ہاتھوں کی حرکت کا مستقل علاج دریافت نہ ہو سکا۔

وقت گزرتا رہا اور میں پندرہ سال کی ہو گئی پھر ایک اور انکشاف ہوا۔ ایک رات ای نے مجھے سوتے سے جگایا اور مجھ سے کہا کہ وہا کی شیشی نہیں مل رہی میں نے دوا ڈھونڈ کر انہیں کھلا دی۔ ای نے ملازمہ کو آواز دی لیکن وہ سو رہی تھی۔ ای اٹھ کر اس کے پاس گئیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت تھا۔ ای اس کے قریب گئیں اور ہاتھ چھو کر دیکھا اس وقت بوڑھی کا ہاتھ مردہ تھا۔ امی پھر میرے پاس اور میرے ہاتھوں کو ہلا جلا کر دیکھا وہ بالکل حرکت میں تھے۔ ای نے مجھے وہیں چھوڑا اور ایک خنجر لے کر ملازمہ کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ میں ان کے پیچھے چل دی۔ میں نے دیکھا کہ امی نے اس عورت کو مارنے کیلئے خنجر بلند کیا ہے لیکن اسی وقت میرے ہاتھ نے حرکت کی اور ای کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ممی! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ اسے کیوں ہلاک کرنا چاہتی ہیں؟“

”چندیری! یہ کوئی پراسرار روح ہے۔ اگر یہ مرگئی تو شاید تیرے ہاتھ واپس آ جائیں۔ میں نے ابھی ابھی محسوس کیا ہے کہ اس کے ہاتھ بے حرکت ہیں۔ یہی عورت شاید تمہارے باپ کے خواب میں آئی تھی اور کہتی تھی کہ تیری بیٹی میری اس کے ہاتھ بھی میرے۔ میں اس عورت کو مار دوں گی تو تیرے ہاتھ واپس آ جائیں گے۔ چھوڑ دے بیٹا میرا ہاتھ۔“

اور زبیر شاہ میرے ہاتھ پکڑ رہے تھے

”گئے۔ اتنی دیر میں وہ عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے ای کو دیکھتے ہوئے کہا۔“

”تیرے سر نے میرے ہاتھ تیزاب سے گلا دیئے تھے۔ مگر میں نے اپنی پوتی کے ہاتھ اپنال لئے ہیں۔ میں جب چاہتی ہوں اس کے ہاتھوں کو استعمال کر لی ہوں پھر سوتے وقت یہ ہاتھ اسے واپس کر دیتی ہوں۔ اس طرح یہ ہاتھ واوی کے بھی ہیں اور پوتی کے بھی۔ چندیری کے یہ ہاتھ جس طرح اس کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح میری بھی حفاظت کرتے ہیں کیونکہ یہ میرے بھی ہاتھ ہیں۔“

اس دن مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ وہ میری واوی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ ”تم میری واوی نہیں۔ ڈائن ہو۔ تم میرے ہاتھ مجھے واپس کرو تو میں تمہارا گلا گھونٹ دوں۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتی۔“ بوڑھی عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خنوئی رشتے ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ میں نے اب تک اپنے بیٹے، بہو یا پوتی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ ہاتھ جو میرے پاس ہیں یہ تمہارے ہی ہیں۔ تمہیں واپس مل جائیں گے تو تب بھی تم مجھے نقصان نہیں پہنچا سکو گی۔ یہ لوہیں واپس کر لی ہوں تم انہیں آزما لو۔“

یہ کہہ کر اس نے زانوؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ اسی وقت میرے دونوں ہاتھوں میں جان آ گئی۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس عورت کا گلا دانا چاہا لیکن وہ آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ بوڑھی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بیٹی چندیری۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ ہاتھ صرف تمہارے ہی نہیں میرے بھی ہیں اور جب یہ میرے ہیں تو یہ میرا گلا کیسے گھونٹ سکتے ہیں؟“

اس دوران میں ہر ممکن کوشش کرتی رہی کہ میرے ہاتھ کسی طرح دادی اماں کے گلے تک پہنچ جائیں لیکن میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ بہر حال اس رات میں اور میری امی واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ دادی اماں نے

نے ایک بہت ہی عمدہ ترکیب سوچ لی تھی۔ دوسری رات جب دادی اماں اپنے کمرے میں سونے کیلئے گئیں تو امی نے میرے بے حس ہاتھوں کو پشت کی طرف ایک مضبوط رسی سے باندھ دیا تاکہ جب دادی اماں گہری نیند سو جائیں اور مجھے میرے ہاتھ واپس مل جائیں تو وہ بدستور رسی سے بندھے رہیں اور جب وہ دادی اماں کو ہلاک کرنے جائیں تو یہ ہاتھ ان کی حفاظت نہ کر سکیں۔ ان کے منصوبے کے مطابق میرے دونوں ہاتھ بندھے رہے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب میں نے امی کو بتایا کہ میرے ہاتھوں میں جان آگئی ہے تو اس سے ظاہر ہو گیا کہ دادی اماں گہری نیند سو گئی ہیں۔ میں اور امی دادی اماں کے کمرے میں گئے وہاں دادی اماں سو رہی تھیں۔ امی نے خنجر کا بھرپور وار دادی اماں پر کیا مگر یوں لگا جیسے وہ گوشت پوست کے بجائے صرف ہڈیوں سے ٹکرایا ہو۔ امی نے خوش کر کے خنجر نکالا اور دوبارہ وار کیا لیکن ان کی چیخ نکل گئی۔ وہ ایک دم سے زکھرا کر فرش پر گر گئیں۔ ان کے منہ سے بڑی مشکل سے نکلا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔“
ای گھور کر دادی اماں کو دیکھنے لگیں۔ دادی اماں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ پھر وہ مخنی سے مسکرائیں۔
”میں تم دونوں کو بدبخت زدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔“
اب تم دیکھ ہی چکی ہو تو یہ سن لو کہ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوں۔ یہ گوشت پوست کا بدن محض فریب نظر ہے مجھے مرے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے۔ مرنے کے بعد انسان کی ہر چیز قل جاتی ہے صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔“
میرے دونوں ہاتھ بڑی طرح مچل رہے تھے۔
دادی اماں کہنے لگیں۔

”چندیری میں تمہاری دادی ہوں۔ تمہیں اور مجھے ہلاک نہیں کر سکتیں۔ مجھے زندہ رہنے کیلئے ہر رات انسانی لہو مل جاتا ہے۔ جب تک میں لہہ پیتی رہوں گی اس وقت تک اس حالت میں زندہ رہوں گی۔“
”شادی ہو یا نہ ہو لیکن میں ہر حال میں تمہاری ہوں۔ تم سے پہلے چائن کبار بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“
زبیر شاہ کو اچانک یاد آیا کہ چائن کبار بھی تو اس حویلی کے تہہ خانے میں موجود ہے اگر میں اسے قانون کے حوالے کر دوں تو میری ترقی ہو جائے گی۔ حالانکہ چندیری کے پاس اتنی دولت تھی کہ اب تو نوکری کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ لیکن ایک عام شہر کی حیثیت سے بھی تو وہ قانون کا ساتھ دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔
”تم نے خوب یاد دلایا قاتل تہہ خانے میں موجود ہے اور میرے ہاتھوں بڑی طرح زخمی بھی ہو چکا ہے۔ میں ابھی جا کر اسے اٹھکڑی لگاؤں گا۔“
”یہ پچھلی رات کی بات ہے۔ تم نے اسے پچھلی رات تہہ خانے میں دیکھا تھا۔ تمہیں شاید وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا ہو۔ بہر حال میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ قاتل پچھلی رات دادی اماں کا شکار تھا۔ اس کی لاش حویلی سے دور ایک چٹان کے

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔“
ای گھور کر دادی اماں کو دیکھنے لگیں۔ دادی اماں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ پھر وہ مخنی سے مسکرائیں۔
”میں تم دونوں کو بدبخت زدہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔“
اب تم دیکھ ہی چکی ہو تو یہ سن لو کہ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوں۔ یہ گوشت پوست کا بدن محض فریب نظر ہے مجھے مرے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے۔ مرنے کے بعد انسان کی ہر چیز قل جاتی ہے صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔“
میرے دونوں ہاتھ بڑی طرح مچل رہے تھے۔
دادی اماں کہنے لگیں۔

”چندیری میں تمہاری دادی ہوں۔ تمہیں اور مجھے ہلاک نہیں کر سکتیں۔ مجھے زندہ رہنے کیلئے ہر رات انسانی لہو مل جاتا ہے۔ جب تک میں لہہ پیتی رہوں گی اس وقت تک اس حالت میں زندہ رہوں گی۔“
”شادی ہو یا نہ ہو لیکن میں ہر حال میں تمہاری ہوں۔ تم سے پہلے چائن کبار بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“
زبیر شاہ کو اچانک یاد آیا کہ چائن کبار بھی تو اس حویلی کے تہہ خانے میں موجود ہے اگر میں اسے قانون کے حوالے کر دوں تو میری ترقی ہو جائے گی۔ حالانکہ چندیری کے پاس اتنی دولت تھی کہ اب تو نوکری کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ لیکن ایک عام شہر کی حیثیت سے بھی تو وہ قانون کا ساتھ دے سکتا تھا۔ اس نے کہا۔
”تم نے خوب یاد دلایا قاتل تہہ خانے میں موجود ہے اور میرے ہاتھوں بڑی طرح زخمی بھی ہو چکا ہے۔ میں ابھی جا کر اسے اٹھکڑی لگاؤں گا۔“
”یہ پچھلی رات کی بات ہے۔ تم نے اسے پچھلی رات تہہ خانے میں دیکھا تھا۔ تمہیں شاید وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا ہو۔ بہر حال میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ قاتل پچھلی رات دادی اماں کا شکار تھا۔ اس کی لاش حویلی سے دور ایک چٹان کے

پچھنے پر اچھے اور اب اس کے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ داوی اماں نے لبو سے خالی لاش کو گھسیٹ کر دباں پہنچا دیا ہے۔“

زیر شاہ نے چندیری کی جانب دیکھا وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ لیٹنے کا انداز ایسا تھا کہ بدن کی شاواہیاں جگہ جگہ سے اُجاگر ہو رہی تھیں۔ تنہائی ہو اور جوان عورت ساتھ ہواہ اپنے لیٹنے کے انداز سے قیامت جگا رہی ہو تو کچھ بھی یا نہیں رہتا صرف دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ اس نے جذبات کی ہلچل میں کہا۔

”اس وقت مجھے جا کر قاتل کی لاش کو اپنے قبضے میں کرنا چاہیے۔ لیکن تمہارے پاس سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک طرف فرض ہے اور دوسری طرف محبت۔“

چندیری نے جواب میں نظریں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر بھی جذبات کی دھوپ چھاؤں تھی۔ اس کی شرمیلی اداسی میں بتا رہی تھیں کہ وہ بھی زیر شاہ کو خود سے دور جاتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

زیر شاہ نے کہا ”تم نے جواب نہیں دیا کہ میں تمہارے پاس آؤں یا فرض پورا کرنے جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ چٹان کے پیچھے چائن کھار کی لاش محفوظ ہوگی میں بعد میں بھی وہاں جا سکتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چندیری کی طرف بڑھا۔

خواب گاہ کے باہر حویلی کے ایک بڑے حال میں ایک بڑی میز پر ایک شمع دان رکھا ہوا تھا جس میں چار سو شمعیں روشن تھیں۔ روشنی کے اس طرف ایک ایزی چیئر پر بوڑھی سنگیتا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کے اطراف جھول رہے تھے۔ کبھی وہ بہت ہی حسین اور جوان تھی۔ اب کتنی بوڑھی نظر آ رہی تھی۔ زیر شاہ اگر اسے دیکھتا تو اپنی معلومات کے مطابق یہی سوچتا کہ بڈیوں کا ایک ڈھانچہ ایزی چیئر پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بوڑھی رات کی خاموشی میں زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

”چندیری بہت معصوم ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ مانگتے مانگتے اپنی عمر کا بہت سا حصہ گزار دیا ہے۔ اس نے اب تک اس لئے شادی نہیں کی کہ وہ قتل عورت

نہیں تھی۔ وہ محبت سے اپنے شوہر کے ہنگامے میں بائیں نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ایک بیوی یا ماں کے فرائض پورے نہیں کر سکتی تھی پھر وہ کس سے او ر کس لئے شادی کرتی۔“

اس کی آواز اس کبھی کی طرح بھنبنارہی تھی جو مکڑی کے جال میں پھنس گئی ہو۔ چندیری کا وجود ایک چمکتے ہوئے جال کی طرح بستر پر بجھا تھا۔ بستر کے سرہانے پر ایک شمع روشن تھی۔ زیر شاہ اس کی طرف بڑھا۔ چندیری نے شرما کر ایک پھونک ماری اور شمع بجھا دی۔ خواب گاہ میں گہری تاریکی چھا گئی۔ زیر شاہ بستر کے قریب جا کر اس پر جھکا تو جوان سانسوں کی سرسراہٹ کے ساتھ اسے چندیری کی آواز سنائی دی۔ ”تمہیں پچھلی رات دیکھتے ہی میرا دل تم سے محبت کرنے کیلئے پھل گیا تھا۔ لیکن میرا پیٹ ٹھیک تھا کیونکہ پچھلی رات چائن کھار میرا شکار تھا۔ محبت کیلئے نہیں دوسری رات کیلئے روکنا ضروری تھا۔ آؤ اب میری بائیںوں میں آ جاؤ۔“

بات ختم ہوتے ہی دو بائیں زیر شاہ کی گردن کا ہار بن گئیں مگر وہ استخوانی بائیں تھیں۔ زیر شاہ ہڑبڑا کر اس کے بدن سے ٹکرا گیا اس کا بدن بھی بڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ خواب گاہ کے باہر بوڑھی عورت کے رونے کی آواز آرہی تھی وہ رونی ہوئی کہہ رہی تھی۔

”داوی اماں تم آخر کب تک مجھ پر ظلم کرو گی؟ کب تک میرے ہاتھ مجھے واپس نہیں کرو گی؟ میں بھی بہت ضدی ہوں میں موقع پا کر مسافروں کو بتا دیتی ہوں کہ تم ایک حسین بلا ہو۔ میں نے تہہ خانے میں چائن کھار کو بھی سمجھایا۔ انسپکٹر کو بھی تمہارے شیطانی ارادوں سے آگاہ کیا مگر تمہارے حسن چکا چوند کے آگے میری کوئی سنتا ہی نہیں اور تمہارے شکنجے میں چلا جاتا ہے۔ آہ تم مردہ ہو کر بھی زندہ ہو اور میں زندہ ہو کر بھی ہاتھوں کے بغیر مردہ ہوں۔“

وہ معصوم اور مظلوم بوڑھی آواز اندھیرے میں سسک رہی تھی۔

Downloaded From
Paksociety.com

پہلے لکھی گئی دوسری خاص کہانی

وہ پھر سے زندہ ہو گئی



محمد سلیم اختر

اُس ہندو ویشیزہ کی داستانِ عجیب جو مر کر پھر سے زندہ ہو گئی

جماعت تک پڑھ لینا بہت ہے۔ مجھے اپنے باپ کے
ساتھ دکان پر بیٹھنا پڑا۔ چار پانچ سال کے مختصر عرصے
میں بھگوان کی مہربان اور ہماری محنت سے ہمارا

میرے باپ کی گاؤں کے بازار میں کپڑے کی
دکان تھی۔ میں جو ان ہوا تو میرے باپ نے مجھے
اسکول سے اٹھا لیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آٹھویں

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کاروبار چکے اٹھا۔ پھر میں نے نزدیکی قصبہ کے تین بازار میں دکان کھول لی۔ گاؤں والی دکان پر پتا جی بیٹھے تھے اور قصبہ والی دکان میں نے سنبھال لی تھی۔ اب میرے والدین میری شادی کی فکر کرنے لگے مگر میں شادی کے بارے میں سنجیدہ نہ تھا۔ سچ پوچھیں تو میں نے اپنے آپ کو کاروبار میں اتنا الجھا رکھا تھا کہ سوائے روپیہ کمانے کے مجھے کوئی اور سوچ ہی نہ تھی۔ میری ماں میرے سر پر سہرا سجانا چاہتی تھی۔ لیکن میں شادی سے دامن بچا کر اپنے کاروبار کو بڑھانے اور پھیلانے کے چکر میں تھا۔ یہی میری ضد تھی۔ جس کے آگے میرے والدین بے بس تھے۔

ایک دن ایک لڑکی اپنی نوکرانی کے ہمراہ میری دکان پر آئی۔ میرا واسطہ ہر طرح کے گاہکوں سے رہتا تھا۔ مگر میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس کا رنگ بھی سانولا تھا مگر اس کی آنکھوں میں ایسی کشش تھی جن میں جا بوجھ کا سا اثر تھا۔ میں اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ لڑکی نہیں کوئی دیوی ہے۔ اس کی آنکھوں کی کشش مجھے مسحور کر رہی تھی۔ شاید تین ہفتے لگ رہا تھا۔ وہ مسکرا دی اور بولی۔

”آپ کے پاس پیرس ہوگی؟“
آپ کو معلوم ہوگا کہ ہماری نو جوانی کے زمانے میں ”پیرس“ بہت ہنگامہ اور مشہور چیز بن چکا تھا۔ میں نے فوراً پیرس کے تھان بنکا لے اور اس کے آگے ڈھیر کر دیئے۔ اس نے دو سوٹ خریدے اور وہ تو چلی گئی تھی مگر مجھے لگا کہ میرا سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی ہو۔ میں آج تک حیران ہوں کہ مجھ جیسے مکمل کاروباری شخص پر اس کے عشق کا بھوت کیسے سوار ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا جادو تھا۔ جس نے میرے اندر کے نو جوان و کرم کو جگا دیا تھا۔ اب تو مجھے کسی پہلو چھین نہ تھا۔ اس کو پھر سے دیکھنے کی خواہش من میں مچنے لگی۔ مگر اس کا حصول کیسے ممکن ہو؟ اس سوال کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ گھر گیا تو طبیعت بوجھل بوجھل سی تھی۔ وہ رات میں صبح طریقے سے سو نہ سکا۔ صبح نہانے گیا پھر مندر بھی گیا۔ بھگوان سے اس کے ملن کی دعا کی اور یہ امید لیے دکان پر آیا کہ شاید وہ جلد پھر آ جائے مگر یہ

تو ممکن نہ تھا۔ ابھی تو وہ کل گیارہ بجے آگئی تھی۔ کئی دنوں کے مسلسل انتظار کے بعد میری دکان کے بھاگ جا گئے۔ اس دفعہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ آئی میں نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے۔ میرے چہرے پر ایک انجانی سی مسرت آگئی۔ ایسے لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ خود ہی بولی۔

”اس دن آپ نے غلطی سے کپڑا بہت سستا دے دیا تھا مجھے تو شاید پتا بھی نہ چلتا۔ میری اس سہیلی پونم کو جب میں نے سوٹ دکھائے اور قیمت بتائی تو یہ حیران رہ گئی۔ اس نے یہی کپڑا چند دن گزرے خرید لیا تھا۔ آج پھر ہم نے بازار سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ اس کپڑے کا ریٹ واقعی زیادہ تھا۔ لگتا ہے تم سے بھول ہو گئی ہے۔“ وہ یہ ساری باتیں ایک ساتھ کہہ گئی۔

”دیوی جی! آپ نے اور کپڑا لینا ہے تو لے جائیں۔ اس سے بھی آدھے ریٹ پر دوں گا۔“
میری بات سن کر وہ پیش میں آگئی اور پھٹ پڑی۔ کہنے لگی۔

”مجھ کو اس بند کرو۔ تم نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ جو کپڑے کے ٹکڑے پر بک جاتی ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا پرس کھولا۔ باتی رقم میرے منہ پر ماری اور کتنی جھکتی منہ میں پیر چنتی دکان سے چلی گئی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا اور میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں کھڑا سوچتا رہا کہ میں نے آخر کون سی خطا کی ہے۔ میں غلط کردار کا آدمی نہ تھا۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں بھگی گئیں۔

☆☆☆

منوج میرا جگری یار تھا۔ اکثر شام کو میری دکان پر آتا تھا۔ وہ حسب معمول اسی شام کو آیا تو میں نے اسے پوری کہانی سنا دی۔ وہ جگت استاذا تھا۔ کہنے لگا۔
”وکر م! تم اپنا کاروبار آرام سے کرو۔ لڑکیوں کے چکر میں نہ پڑو۔ اپنا کاروبار بھی برباد کرو گے اور بدنامی مفت میں ملے گی۔“

مگر میری حالت پھر سے قابو سے باہر تھی۔ میں بے منوج کی بہت سست سست جانتا تھا۔ اس نے میری مدد

جوگی نے اپنا کشتول آگے کر کے دھائے پیچھے کر لیا۔ اور نگاہیں ساریکا کے چہرے پر مرکوز کر لیں۔ اتنے میں میری ماں بولی۔

”جوگی بادشاہ! غنی دلہن ہے۔ اس کو دعا دو۔“

جوگی بولی۔ ”دعا رحم کی یا قبر کی؟“

میری ماں اُرتی گئی اور کہا۔ ”مہاراج! رحم کی دعا کرو۔ رحم کی۔“

میں محن میں بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جوگی نے اپنے کشتول سے گندم کے چند دانے اٹھا کر ساریکا کے چہرے پر مارے۔ اور بغیر کچھ کیے چلا گیا۔ میری ماں گھبرا گئی۔ میں نے اُٹھ کر باں کو تلی دی مگر وہ کہہ رہی تھی کہ ایسے لگتا ہے۔

”جوگی بادشاہ ہم سے ناراض ہو گیا ہے۔“

جوگی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ساریکا کے پیٹ میں بائیں جانب درد شروع ہو گیا۔ میں دوڑ کر گیا اور ایک مسلمان حکیم کو بلا لایا۔ حکیم صاحب بہت ہی ہمدرد اور نیک انسان تھے۔ وہ فوراً میرے ہمراہ آہنگے ساریکا درد سے تڑپ رہی تھی۔ حکیم صاحب نے ایک سنوف پانی میں گھول کر ساریکا کے منہ میں ڈالا۔ جس سے درد کی شدید میں کمی آگئی۔ مگر وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ مجھے پتا نہیں۔ حکیم صاحب کی دوائی کا اثر تھا یا وہ درد کو برداشت کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ حکیم صاحب نے مجھے کہا کہ تم اپنی بیوی کو شہر لے جاؤ وہاں ہسپتال میں ایک انگریز ڈاکٹر ہے۔ جو بہت مشہور ہے۔ اس سے بیوی کا علاج کراؤ۔

☆☆☆

میں نے فوراً ایک ٹیل گاڑی کا انتظام کیا۔ ساریکا کو اس میں ڈالا اور شہر روانہ ہوئے۔ ابھی شہر کافی دور تھا کہ ساریکا نے آنکھیں کھولیں۔ ایک نظر بھر کر دیکھا اور پھر آنکھیں موندھ لیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سانسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہیں سے ٹیل گاڑی واپس مڑی۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ بہر حال ایک حقیقت ہے۔ ساریکا کو میں نے بڑی چاہت سے حاصل کیا تھا۔ محبت کی جتنی بولی تھی میں ان جلدی بار جاؤں

کر نے کا وعدہ کیا۔ شاید وہ بھی اس معاملے کی سنگینی کو سمجھ گیا تھا۔ اس کی دکان پر ایک بڑھیا آیا لڑتی تھی۔ جس کی لڑکیاں دست کاری میں مہارت رکھتی تھیں۔ وہ ان کے کاڑھے ہوئے کپڑے منوج کی دکان پر لاتی تھی اُس کے کئی گھر دس میں آنا جانا تھا۔ منوج نے اس سے رازداری کا وعدہ لے کر میری بات کی۔

وہ بڑھیا بڑی تیز نکلی۔ اس نے لڑکی کا مکمل پتا معلوم کر لیا۔ وہ لڑکی سیٹھ بھگوان داس کی سب سے بڑی بیٹی ساریکا تھی۔ ساریکا سے چھوٹی تین بہنیں اور تھیں۔ بھائی کوئی نہ تھا۔ بڑھیا کے بقول ساریکا پاکیزہ اور نیک لڑکی تھی۔ میں نے بڑھیا کو اس کی توقع سے بڑھ کر انعام سے نوازا۔ بڑھیا کی خواہش تھی کہ وہ میرے اور ساریکا کے درمیان تعلق پیدا کر دے گی۔ مگر ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑھیا کو اس کام سے روک دیا۔

اور ایک دن میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ میں سیٹھ بھگوان داس کی بڑی بیٹی ساریکا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا تو میں ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔“

☆☆☆

شادی کا سن کر میری ماں بہت خوش ہوئی۔ اور اگلے ہی دن میرے ماں باپ سیٹھ بھگوان داس کی حویلی میرے رشتے کے لیے چلے گئے۔ میں اس کام کو بہت دشوار سمجھ رہا تھا۔ مگر سیٹھ بھگوان داس میرے باپ کا پرانا جاننے والا نکلا اور پلک جھپکتے میں میری شادی ساریکا سے ہو گئی۔ شادی سے پہلے اسے میرے متعلق کچھ علم نہ تھا شادی کے بعد جب اسے پوری کہانی کا علم ہوا تو وہ میری محبت کی قائل ہو گئی۔

ہماری شادی کو چند ہی ماہ گزرے تھے۔ پوہ کا مہینہ تھا۔ شدید سردی تھی۔ اس دن میں گھر پہنچا تھا کہ باہر دروازے پر ایک جوگی نے صدا لگائی۔ دردناک کھلا تھا اور جوگی کشتول لیے کھڑا تھا۔ میری ماں نے ساریکا سے کہا۔

”جاؤ بیٹی! جوگی بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے کچھ دے آؤ۔ ساریکا نے کچھ پیسے لیے اور جوگی کو دیے گئی۔“

گا۔ اس کا میں کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

میں نے اپنی نگاہیں اس سارے پر مرکوز کر دیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میری حالت یہ تھی کہ اگر میں اپنی جگہ سے معمولی سی حرکت کرنا بھی چاہتا تو نہ کر سکتا تھا۔ وہ سایہ آہستہ آہستہ چتا کی جانب بڑھنے لگا۔ جوں ہی وہ چتا کے قریب پہنچا تو میں نے چتا کی آگ کی روشنی میں اسے دیکھا تو ایسے لگا کہ جیسے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ وہی جوگی تھا۔ جو دن کو ہمارے گھر آیا تھا۔ اور اس نے ساریکا کے چہرے پر گندم کے دانے مارے تھے۔ وہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

جوگی نے ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر وحشی آواز میں کوئی منتر پڑھنا شروع کیا۔ کچھ دیر منتر پڑھنے کے بعد اس نے چتا کے گرد آہستہ آہستہ چکر لگانے شروع کر دیے۔ اس کے کھنکھول میں کچھ مٹکتے تھے جن کو وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چتا پر پھینکتا جا رہا تھا۔ چتا کی آگ پہلے بھی صحیح طریقے سے نہیں جل رہی تھی۔ اب جوگی بادشاہ کے منتر نے رہی کسری پوری کر دی۔ اب تو آگ مکمل طور پر بجھ چکی تھی۔ جوگی کے منہ سے غیر مبہم سی آوازیں مسلسل نکل رہی تھیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ میرے دل میں خوف کی شدت میں بھی کمی آرہی تھی۔

جب آگ اچھی طرح بجھ گئی تو جوگی نے اپنا کھنکھول زمین پر رکھ دیا اور چتا کی لکڑیوں کو ہٹانا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ساریکا کی لاش تک آگ پہنچ گئی یا نہیں۔ کیونکہ اندھیرے میں نظر نہ آتا تھا۔ جوگی نے ساریکا کی لاش کو اٹھا کر چتا کے ساتھ زمین پر رکھ دیا اور خود لاش کے سر کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر وہی غیر مبہم سی آوازیں اس کے منہ سے نکلتی گئیں۔ نہ جانے کتنی دیر ایسی طرح گزر گئی۔ پھر جوگی نے اٹھ کر پانی کی طرح کا کوئی مائع ساریکا کی لاش پر پھینکا شروع کر دیا۔ پھر میں نے وہ منظر دیکھا کہ جس کو میں مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں گا۔ میرے سامنے پڑی ہوئی ساریکا کی لاش نے حرکت کی پھر جوگی نے اسے ایسے اٹھایا جیسے کوئی کسی کو سوتے میں جگاتا ہے۔ ساریکا اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے یہ بالکل کہ جیسے میرے جسم میں خون جم گیا ہو۔

اس شام کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب ساریکا اترتی شمشان بھوی لے جاتی جا رہی تھی۔ پھر میری ساریکا کو بہت ساری خشک لکڑیوں میں دفن کر دیا گیا۔ کئی کنستریسی لکڑیوں پر انڈیل دیا گیا۔ شام گہری ہو گئی۔ سردی زیادہ تھی اور آسمان گہرے کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میرے باپ نے مجھے چتا کو آگ لگانے کے لیے کہا۔ ایک مذہبی فرض کی بجائے آوری کی خاطر میں نے اپنی محبوب بیٹی کی چتا کو آگ لگا دی۔ اب ساریکا کی چتا بڑے دھیمے انداز میں جل رہی تھی۔ حالانکہ اس پر خاصی مقدار میں دیسی گھی ڈالا گیا تھا۔ سردی اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ چتا کی آگ نے تھوڑی سی جگہ کو روشن کر رکھا تھا۔ ورنہ ہر جگہ اندھیرا تھا۔ آہستہ آہستہ سارے رشتے دار کھٹکے لگے۔ باپ نے مجھے کہا کہ تم بھی چلو۔ صبح آ کر پھول پھن لیں گے ہم ہندو لوگ مردے کی جلی ہولی پڑیوں کو پھول کہتے ہیں۔ میرا دل وہاں جانے کو نہ چاہ رہا تھا۔ میں نے باپ سے کہا کہ آپ لوگ چلیں میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ وہ چلے گئے اور میں تنہا اس بہت ناک مقام پر موجود رہا۔ میرے سامنے ساریکا کی چتا جل رہی تھی۔ نہ جانے کتنی چتا میں اس جگہ جلی ہوں گی۔ میں نے اپنی زندگی میں کئی چتاں جلتی دیکھی تھیں مگر میری بیوی کی چتا اس طرح نہیں جل رہی تھی۔ ایسی لگ رہا تھا جیسے آگ میری بیوی کو جلا نا نہیں چاہتی تھی۔ شمشان بھوی میں خود رو جھاڑیاں تھیں۔ جنھوں نے اندھیری رات میں اس منظر کو اور بھی بھیا تک بنا دیا تھا۔ تیز ہوا سے جھاڑیوں میں جو سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ اس سے خوف آتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے گرد و نواح میں بہت ساری روہیں بے چین پھر رہی ہوں۔ میرا جسم سردی سے سن ہو رہا تھا۔ میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا رو رہا تھا۔ شدید سردی کے علاوہ جو دوسری پریشانی مجھے لاحق تھی وہ یہ کہ چتا کی آگ ہوا کے جھونکوں سے بھڑکنے کے بجائے بجتی جا رہی تھی۔

میں واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سامنے کی جھاڑیوں میں مجھے ایک ہیولہ سا دکھائی دیا۔

ایسے موجود تھے جن کے سامنے ساری کامیابی اور
انہوں نے اس کی آخری رسومات میں شرکت کی تھی۔

قارئین! آپ یہ سن کر اور بھی زیادہ حیران ہوں
گے کہ ساریکا نے اس کہانی پر بالکل یقین نہ کیا۔ وہ کہنے
لگی کہ اسے اتنا ہی یاد ہے کہ جوگی ہمارے دروازے پر
آیا تو وہ اس کے پاس گئی۔ جوگی نے اپنی نگاہیں اس پر گاز
دیں تو ساریکا کو اپنے اندر بجلیاں سی کودتی ہوئی محسوس
ہوئیں۔ پھر جوگی نے گندم کے چند دانے کھول سے اٹھا
کر ساریکا کے منہ پر مارے۔ اور وہ چلا گیا۔ اس کے بعد
ساریکا کے پیٹ میں ورد اٹھا جو بڑھتا ہی گیا۔ ساریکا نے
کہا کہ اسے یہ بھی یاد ہے کہ حکیم صاحب نے اسے دوائی
دی تھی اور پھر وہ سو گئی۔ بابے ہوش ہو گئی تھی۔ ساریکا نے
کہا کہ اسے ہوش آیا تو وہ گھر میں اپنی چار پائی پر لیٹی ہوئی
تھی۔ اس کے علاوہ اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

☆☆☆

میں اور ساریکا اس کے بعد چالیس برس تک
رہے۔ اس کے بطن سے میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا
ہوا۔ ان چالیس برسوں میں۔ میں نے کئی بار اس سے اس
واقعہ کے بارے میں پوچھا۔ مگر ہر بار اس کا یہی جواب
تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مرنے سے تین چار دن قبل اس
کو ٹھنڈ لگ گئی اور ساتھ تیز بخار ہو گیا۔ اور یہی بخار اس کی
موت کا سبب بن گیا۔ اس کی آخری رسومات میں شرکت
کرنے والے کئی لوگ ایسے بھی تھے جو چالیس برس پہلے
بھی ساریکا کی ان رسومات میں شرکت کر چکے تھے۔ اس
بار بھی چتا کو میں نے ہی آگ لگائی۔ اور اب کوئی غیر
معمولی واقعہ نہ ہوا۔ آگ نے ساریکا کو جلا کر رکھ کر ڈالا۔
ساریکا کی خواہش تھی کہ اس کے پھول ہر دوارے جا کر گنگا
میں بہائے جائیں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اس کے پھول
لے کر ہر دوارے گیا اور گنگا میں بہا دیے اس واقعہ کے کئی
یعنی گواہ ابھی زندہ ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ساریکا کو
چالیس سال قبل سکتہ ہو گیا تھا۔ لوگ سمجھتے کہ وہ مر گئی ہے۔
اس کی چتا کو آگ تو لگا دی گئی۔ پھر جوگی نے منتر پڑھا تو
ہوش میں آ گئی۔ مگر مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ اسے
سکتہ ہو گیا تھا۔ نہ جانے حقیقت کیا تھی۔

☆☆☆

میرے منہ سے جھنجھکتے نکلتے رہ گئی۔ میرا دماغ ناؤ فٹ
ہو چکا تھا۔ اس شخص و شخص تھا کہ یہ کیا ہے کہ جوگی
ایک طرف چل پڑا۔ اور ساریکا اس کے پیچھے پیچھے اس
طرح چلتی گئی جیسے کوئی سدھایا ہوا جانور اپنے مالک کے
پیچھے چلتا ہے۔ کچھ دیر تو میں وہاں شمشان بھوی میں بیٹھا
رہا۔ میرے ہوش ٹھکانے آئے تو میں ان کے پیچھے چل
پڑا۔ شمشان بھوی سے تھوڑی دور راستے کے ساتھ چند
مسلمان کسانوں کے گھر تھے۔ ان لوگوں کو میں اچھی
طرح جانتا تھا۔ راستے کے ساتھ والا گھر گلستان خان کا
تھا۔ جب جوگی ان مسلمان کسانوں کے گھروں کے
پاس سے گزرنے لگا تو میری نگاہ ایک کسان پڑی۔ جو
اس بلا کی سردی میں لالین لے کر مویشیوں کے بازے
خانے میں نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرا حوصلہ
بڑھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے اندر کوئی قوت پیدا ہو گئی
ہو۔ میں نے پورے زور سے چیخا شروع کر دیا۔ جتنا
شروع مچا سکتا تھا چلایا اور ساتھ ہی جست لگا کر ساریکا کو
پکڑ لیا۔ جوں ہی میں نے ساریکا کو چھوا وہ ایک بے جان
مجسمے کی طرح زمین پر گر پڑا۔ چند کسان لائٹیاں لے کر
دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ گلستان خان آگے
آگے تھا۔ اس کے بعد میں بھی ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔
اور جب ہوش یا تو میں اپنے گھر چار پائی پر پڑا تھا اور حکیم
صاحب میرے سر ہانے بیٹھے تھے۔ کچھ رشتہ دار ہمارے
گھر جمع تھے۔ سب سے پہلے میں نے ساریکا کے متعلق
پوچھا۔ پتا چلا کہ وہ گھر میں ہے اور ہوش میں آ چکی ہے۔

☆☆☆

شمشان بھوی کے باہر جب میں چیخے چیخے بے
ہوش ہو گیا تھا تو گلستان خان اور اس کے ساتھیوں نے
مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ مجھے اور ساریکا کو اٹھا کر ہمارے گھر
لے آئے تھے۔ جہاں میں اور ساریکا کچھ گھنٹے بے
ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آ گئے تھے۔ اس جوگی کا
کسی کو پتا نہ چلا کہ کدھر غائب ہو گیا تھا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے گھر
والوں کو تمام حالات تفصیل سے بتائے۔ وہ سب حیران
رہ گئے اگر وہ میری کہانی پر یقین نہ کرتے تو
کیا کرتے۔ کیونکہ ان میں سے بہت سارے لوگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلا سرائے کی شہری خاص کہانی

وہ فرشتہ ✓

حنابشری

اس مہربان دوست کی کہانی جو ہمیشہ فرشتہ بن کر اپنے دوست کی مدد کرتا رہا مگر.....



کرنے پر مجھے کچھ شرمندگی سی ہوئی ہم تو شاید نام کے مسلمان ہیں، میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ میں نے نماز فجر ادا کی کچھ وظائف ادا کیے جو مجھے مسجد کے امام صاحب نے بتائے تھے۔ میں نوکری کے لیے بہت پریشان تھا۔ دعا مانگ کر میرے دل کو سکون ملا۔

☆.....☆

گھر آیا تو امی نے ناشتا تیار کیا ہوا تھا۔ میں ناشتا کر کے تیار ہوا اور امی سے ڈھیروں دعائیں لیں۔ میرا آج انٹرویو تھا۔ میں آفس پہنچا جہاں انٹرویو کے لیے بلا یا گیا تھا۔ انٹرویو بہت اچھا ہوا تھا۔ مجھے بہت امید تھی کہ یہاں ضرور جاب مل جائے گی۔ ایک ہفتہ گزر گیا مگر جاب کے حوالے سے کوئی خوش خبری نہ ملی۔ امی بہت پریشان تھیں۔ ”علی بیٹا نوکری کے حوالے سے کوئی خبر نہیں آئی؟“ ای فکر مندی سے پوچھ رہی تھیں۔ ”آجائے گی امی آپ بالکل فکر نہ کریں۔“ میں

”نماز نیند سے بہتر ہے۔ جلدی جلدی اٹھیے اور نماز فجر ادا کریں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں یہ الفاظ ادا کرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یہ اس شخص کا معمول تھا کہ فجر کی اذان ہوتی اس کے پاؤں یا دس منٹ بعد آ جاتا۔ موسم کی شدت سے بے پروا اپنی ڈیوٹی دینے پر مجبور تھا۔ شاید کسی مذہبی جماعت سے تعلق تھا۔ میں وضو کرتے ہوئے اسی نکتے پر غور کر رہا تھا، بھیجی بہت باہمت انسان ہے، میں دل ہی دل میں اس سے متاثر بھی ہو رہا تھا۔

دھند نے پوری گلی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ عام انسان تو فجر کے لیے وضو کرنے کے لیے سو دفعہ ارادہ باندھتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر لحاف سے نکلنے کی ہمت ہوتی ہے۔ میں نے وضو کیا اور باہر نکل آیا۔ وہ ابھی گلی میں ہی تھا اور اپنی مخصوص صدا لگا رہا تھا۔ میں پاس سے سے گزرا تو اس نے میری طرف دیکھا، سلام کیا اور آگے بڑھ گیا۔ سردی کی وجہ سے اس نے اپنا چہرہ چادر سے چھپا رکھا تھا۔ اس کے سلام میں پہلے

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

Downloaded From Paksociety.com

بجھر کی اذان ہو رہی تھی۔ آج میرا نماز پڑھنے اور وظائف پڑھنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ شاید مایوسی طاری ہو رہی تھی کہ اتنے دن سے تو پڑھ رہا ہوں ابھی تک نوکری نہیں مل رہی۔ مایوسی نے میرا گھیراؤ کیا ہوا تھا میں کان لپیٹ کر پڑا ہوا تھا کہ اسی اجنبی شخص کی آواز آئی۔

”قبر میں پہلا سوال نماز کا ہوگا۔“ آج اس نے ایک نئے جملے کا اضافہ کیا تھا۔ میرے دل پر اس جملے کا ایسا اثر ہوا کہ میں فوراً بستر سے نکل آیا۔ وضو کیا اور باہر آ گیا۔ وہ ابھی گلی میں ہی تھا میں نے جلدی سے سلام میں پہل کی۔ آنکھوں کے علاوہ اس کا باقی چہرہ چادر سے چھپا ہوا تھا۔ میرے سلام کرنے پر اس کی

نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے نارمل انداز میں کہا۔
”انشاء اللہ سب خیر ہی ہوگا۔“ امی میری تسلی پر مطمئن ہوتے ہوئے بولیں۔

میں اپنی کمزوری امی کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر میں ہی پریشانی دکھاتا تو وہ بے چاری اس عمر میں کیسے حوصلہ کرتیں۔ میں روز کہیں نہ کہیں انٹرویو کے لیے نکل جاتا مگر کہیں سے مثبت جواب نہ ملتا۔ تعلیمی قابلیت ہونے کے باوجود میں دھکے کھا رہا تھا صرف اس لیے کہ میرے پاس سفارش نہیں تھی، کسی بڑی شخصیت سے میرے تعلقات نہ تھے۔

آکھیں مجھے مسکراتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ بہت شفقت سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میرے سلام کا جواب دے کر وہ چلا گیا تھا۔

اب روز ہی میری اس شخص سے ملاقات ہونے لگی۔ وہ بہت اچھی گفتگو کرتا تھا۔ لمبا قد، سفید شلوار قمیض اور سیاہ چادر کے ساتھ وہ مجھے بہت متاثر کرتا۔ آج باتوں کے دوران اس نے چہرے پر سے چادر ہٹا دی۔ وہ عمر سے 35 سال کا لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ انتہائی نورانی اور لبوں پر بے حد مہربان مسکراہٹ تھی۔

”کیا آپ کا تعلق کسی مذہبی جماعت سے ہے؟“ میں ایک دم سوال کر بیٹھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تو آپ کو اس کام کا کوئی معاوضہ ملتا ہے، میرا مطلب ہے اجرت وغیرہ؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں میرا تعلق نہ تو کسی مذہبی جماعت سے ہے اور نہ ہی میں کسی ادارے کا تنخواہ دار ملازم ہوں۔ میں تو سرورِ کون و مکاں کا بس ادنیٰ سا غلام ہوں۔ میری اس کوشش سے اگر ایک مسلمان بھی نمازی بن جاتا ہے تو یہی میری اجرت ہے۔ ہاں میرے بڑوں نے مجھے یہ کام سونپا ہے جب تک ان کا حکم ہوگا ادا کرتا رہوں گا۔“ اس نے بڑی تفصیل سے بتایا۔

”اگر آپ کو برا نہ لگے تو آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ میں نے گھبراتے ہوئے ایک اور سوال کر ڈالا۔

”نعمان۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟“ میں ساری باتیں آج ہی پوچھنا چاہ رہا تھا۔

”جماعت کھڑی ہونے والی ہے اس کا جواب پھر سہی۔“ وہ کہہ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مسجد میں داخل ہو گیا۔ وہ اس قدر توجہ سے نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے اپنی نماز کا سوچ کر شرمندگی ہونے لگی جو

صرف گریں لگ رہی تھیں۔ ایک بات میں نے ہمیشہ نوٹ کی تھی کہ نعمان مسجد میں تو میرے ساتھ ہی آتا تھا مگر لکھتے وقت کبھی نظر نہیں آتا تھا۔ پتا نہیں اتنی تیزی سے وہ کہاں چلا جاتا تھا۔

ایک دن میں نے جلدی جلدی نماز ادا کی اور نماز کے بعد نعمان پر نظر رکھنے کے لیے مسجد کے باہر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اتنی دیر میں ای کا فون آگیا میں اس میں ایسا الجھا کہ نعمان میرے ذہن سے ہی نکل گیا۔

”آپ نماز کے بعد دعا نہیں مانگتے؟“ میں نے نعمان سے سوال کیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے لگا تھا۔ مجھے لگا کہ اس سوال کے درپردہ جو اصل بات پوچھنے کا مقصد تھا وہ نعمان جان گیا تھا۔ مجھے کچھ شرمندگی ہی محسوس ہوئی۔ نعمان خاموش رہا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے بھی ارادہ کیا دل ہی دل میں کہ نعمان سے اس کی ذات کے بارے میں ایسے فضول سوال نہیں کروں گا۔

☆.....☆

اب میں جلدی اٹھ جاتا، پہلے ہی وضو کر لیتا تاکہ ناظم بچ جائے اور میں زیادہ سے زیادہ نعمان سے باتیں کر سکوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس سے باتیں کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔ کوئی نہ کوئی اچھی بات سیکھنے کو مل جاتی تھی۔

آج اس کے پاس سے اس قدر اچھی خوشبو آرہی تھی جیسے کوئی بہت عمدہ عطر لگایا ہو۔ ابھی میں خوشبو کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی عطر کی بوتل نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ ”یہ لو۔“ نعمان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”نہیں یہ میں نہیں لے سکتا۔“ میں ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”ارے انکار مت کرو۔ دوستی کا پہلا تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں کے ساتھ آٹکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

”دوستی؟“ اس لفظ کو میں اپنے لیے اعزاز سمجھ رہا

تھا۔ میں نے شکر یہ کہہ کر اس کا تھکا ہوا ہاتھ لیا۔ میں ابھی اپنی سوچوں میں مگن تھا کہ نعمان بولا۔

”اللہ بڑا کریم ہے ہم مطلب کے لیے اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ ہمیں نوازتا ہے۔“ نعمان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں گھبرا گیا۔ مجھے لگا کہ وہ میرا نماز پڑھنے کا اصل مقصد جان گیا ہو میں نے نظریں چرا لیں۔

میں اپنی کزن ہما کو پسند کرتا تھا۔ وہ میری خالہ زاونتی۔ میں نے گریجویشن کر لی مگر ابھی تک جاب کی کوئی صورت نہیں بنی تھی۔ تو میں نے اپنا مسئلہ مسجد کے امام صاحب کو بتایا انہوں نے کہا کہ باجماعت نماز ادا کرو اور کچھ وظائف پڑھنے کو بتائے۔

آج جب نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو مجھے نعمان کی بات یاد آگئی، مجھے اپنا آپ اللہ کے سامنے بڑا مطلبی سا لگ رہا تھا۔

ہم انسان بھی کتنے خود غرض ہوتے ہیں۔ کبھی شکر نہیں ادا کرتے ہمیشہ مانگتے ہیں اور وہ ہمیں نوازتا رہتا ہے۔ وہ ہم سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے مگر ہماری زندگی میں تو اتنا وقت ہی نہیں کہ ہم اس کی عبادت کے لیے ٹائم نکالیں۔ محبت تو بہت دور کی بات ہے اور کچھ نہ ملنے پر فوراً شکوہ کرتے ہیں کہ اتنی دیر سے نماز پڑھ رہا ہوں۔ میرا فلاں کام نہیں ہوا یا اتنی دیر سے دعا مانگ رہا ہوں۔ میری فلاں حاجت پوری نہیں ہوئی۔ واقعی وہ بہت کریم و رحیم ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نعمان یہ ایک اور بات سکھائی تھی مجھے۔ صبح میری نعمان سے ملاقات ہوئی تو میں خلاف معمول خاموش سا تھا۔

”کیا ہوا پریشان ہو؟“ نعمان نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔“ میں مختصر بولا۔

”مجھے بتاؤ شاید میں کوئی مدد کر سکوں۔“ وہ ہمدردانہ لہجہ میں بولا۔

”میں اپنی خالہ زاد سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر بے روزگاری آڑے آرہی ہے۔“ میں نے اپنا مسئلہ اسے بتایا۔ بہت توجہ سے وہ میری بات سن رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کمرے کے بعد اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور مجھے دکھایا۔

”علی تم جب انٹرویو کے لیے جاؤ تو جو شخص تمہارا انٹرویو لے رہا ہو اس کی میز کے نچلے حصے پر یہ نظر بچا کر چپکا دینا۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔“ نعمان سنجیدگی سے بولا۔ میں نے مزید کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ جماعت نکل نہ جائے۔“

پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ آج مجھے ضرور نوکری مل جائے گی۔ میں نے ای سے دعائیں لیں اور گھر سے نکل آیا۔ آفس پہنچا تو دیکھا صرف دو سیٹیں اور امیدوار لاتعداد..... میرا تو حوصلہ ہی ٹوٹ گیا۔ میری باری آئی میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ شخص فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے وہ کاغذ جو نعمان نے مجھے دیا تھا وہ میز کے نچلے حصے پر چپکا دیا۔ کیونکہ اس نے فون کرتے ہوئے مجھے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا تھا جو میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوا تھا اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔ اس افسر نے میرے کاغذات بنے دلی سے دیکھے اور بغیر انٹرویو لیے مجھے کہا۔

”سوری آپ کی تعلیم اس سیٹ کے لئے ناکافی ہے آپ جاسکتے ہیں۔“ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے مایوسی سے اپنے کاغذات اٹھائے اور مردہ قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ فون کی بیل بجی اسی شخص نے کسی سے بات کی اور فون بند کرتے ہی مجھے آواز دی۔

”مسٹر علی۔“ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ شخص مجھے ہی بلارہا تھا۔

”مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ آپ کے پیچھے اتنی بڑی سفارش ہے۔“ وہ شخص مجھے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یعنی مجھے جاب مل گئی تھی۔

میں خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ ای کو خوش خبری سنائی وہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔ ظن ہما کو بھی بتایا مگر اصل بے چینی تو نعمان کو بتانے کی تھی۔ میں نے پتا نہیں کیسے اسے گزاردی۔ آج اذان سے پہلے ہی اٹھ

حمید۔ وضو کیا اور نعتیں پڑھ کر انتظار میں بیٹھ گیا۔
شروع کر دیا۔ نعتیں کی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی
دی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں خوشی سے دوڑتا ہوا اس
کے قریب پہنچ گیا۔

”گلتا ہے نوکری مل گئی ہے۔“ نعمان نے مسکراتی
نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟“ میں نے حیرانگی
سے پوچھا۔

”دوست اپنے دوستوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اس
لیے دوست کا غم یا خوشی بنانا پتا چل جاتی ہے۔“
نعمان گہرے انداز میں بولا۔

”تو پھر دوستی کی؟“ میں نے جوش سے ہاتھ
آگے کر دیا۔

”سوچ لو برداشت کر لو گے؟“ نعمان مجھے
جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ میں ناہی سے بولا۔
”مطلب یہ کہ دوستی برداشت کرنے کی ہمت
ہے؟“ نعمان پر اسرار لہجہ میں بولا۔

”ایک تو آپ باتیں بہت عجیب کرتے ہیں۔“
میں نے مصنوعی ناراضگی دکھائی۔

”اچھا ہاتھ تو ملا میں۔“ میں نے اصرار کیا۔
نعمان نے چادر سے ہاتھ نکالا اور میرا ہاتھ

تھام لیا۔ نعمان سے ہاتھ ملائے ہوئے میری چیخ
نکل گئی۔ میرا ہاتھ بالکل سرخ ہو گیا جیسے آگ لگ

گئی ہو۔ میں درد سے وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ درد کی
شدت سے میں نماز بھی پڑھنے نہ جاسکا۔ گھر آیا تو

ای نے مجھے دیکھا بہت سے ٹوکے کیے مگر جلن ختم
ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میڈیکل اسٹور کھلنے

میں کافی دیر تھی۔ میں کافی دیر تک برف لگا تا رہا۔
دقی سکون کے بعد پھر وہی درد شروع ہو جاتا۔ ایک

پل سکون نہیں آ رہا تھا۔ درد کی سارا دن شدت ہی
اتنی رہی کہ میں نعمان کو بھولی سا ہی گیا۔

رات کو نیند نہیں آرہی تھی۔ جلن کی وجہ سے میں
بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا کہ اچانک نعمان سے

ہاتھ ملانے کا واقعہ یاد آ گیا۔ چنانچہ میں نے نعمان

سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے ایک بات سوچ کر
انتہائی حیرت ہوئی کہ جب میں جلن سے بے حال
ہو رہا تھا۔ نعمان اس وقت ایک دم کہاں چلا گیا تھا۔

رات کو پتا نہیں کب آنکھ لگی، دیر سے سونے کی وجہ سے
صبح اذان کے وقت آنکھ نہ کھل سکی۔ دروازے پر

دستک ہوئی۔ ای نے آکر بتایا کہ کوئی نہیں ہے۔
دوبارہ دستک ہونے پر میں اٹھا اور دروازہ کھول کر

باہر نکلا دیکھا تو نعمان کھڑا مسکرا رہا تھا۔
”کیسے ہو دوست؟“ نعمان نے پوچھا۔

”میں.....“ آج مجھے نعمان سے خوف محسوس
ہو رہا تھا میں کچھ بول ہی نہیں پایا تھا۔

”ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ جیسے میری
ایک ایک سوچ پڑھ رہا تھا۔ اس کے کہنے پر میں حیرانگی

سے اسے دیکھنے لگا تھا۔
”حیران ہو؟“ نعمان مزید بولا۔

”ہاں۔“ میرے منہ سے اچانک نکلا تھا۔
”تم ہی ہاتھ ملانے کی ضد کر رہے تھے۔ میں نے

تو پہلے ہی پوچھا تھا کہ برداشت کر لو گے؟“ نعمان
پر اسرار انداز میں بولا۔ مجھے اس کی بات بے حد عجیب

لگی تھی مگر چپ رہا۔
”یہ لو۔“ نعمان کے ہاتھ میں چھوٹی سی ڈبیہ تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے ڈبیہ پر تے ہوئے
حیرت سے پوچھا۔

”یہ مرہم ہے۔ تم اسے اپنے ہاتھ پر لگا لو آرام
آجائے گا۔“ نعمان مہربان آواز میں بولا۔ میں نے

فوراً مرہم اپنے ہاتھ پر لگایا۔ جلن ایسے غائب ہو گئی
جیسے تھی ہی نہیں۔ میں نے شکر گزار نظروں سے نعمان کو

دیکھا تھا۔
”مقصد پورا ہوا اور فوراً نماز بھول گئے یہ ناشکری

نہیں تو اور کیا ہے؟“ نعمان ملامت بھرے لہجہ میں
بولتا مجھے شرمندہ کر گیا۔

”وہ اصل میں دودن سے جلن کی وجہ سے.....“
ان کی بات پر میں بوکھلاتے ہوئے بولا۔

”اتنی معمولی سی جلن برداشت نہیں کر سکے۔ کل
دودن کی آگت کیسے برداشت کر گئے، میرے

اس نے صحیح انداز سے پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم کل جلدی آفس چلے جانا اور اس شخص کی الماری کی تلاشی لینا۔“ نعمان نے مجھے ہدایت کی تھی۔

اگلے دن میں جلدی آفس پہنچا، ابھی صرف چڑا اسی آیا ہوا تھا۔ میں نے فیاض کی الماری کی تلاشی لی مگر کچھ نہ ملا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ 9 بجنے والے تھے۔ یعنی اسٹاف آنے والا تھا۔ میں وہیں مایوس ہو کر بیٹھ گیا نوکری ہاتھ سے جانے کا خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا کہ اچانک کوئی چیز میرے سر پر گری۔ میں نے سنبھل کر اسے پکڑ لیا۔ دیکھا تو حیرت کا جھٹکا لگا کہ وہ وہی قائل تھی۔ میں نے وہ قائل اپنے افسر کے حوالے کر دی مگر نعمان کے کہنے کے مطابق فیاض سے اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔

☆.....☆

”تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ وہ شخص فیاض ہی تھا؟“ میرے لبوں پر سوال آئی گیا۔
”تمہارا یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے۔“ نعمان مسکرایا۔

”فیاض نے ایسا کیوں کیا؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

”دیکھو علی اس نے جس مقصد کے لیے بھی کیا ہو اس بات کی بجائے تم یہ غور کرو کہ لوگوں کو کیسے پرکھنا ہے۔ بہت سے لوگ حاسد طبیعت کے ہوتے ہیں۔ یہ تمہارا کام ہے کہ ان سے کیسے ہوشیار رہنا ہے۔ ہر ایک پر اندھا اعتماد کر لینا عقل مندی نہیں۔“ نعمان ناصحانہ انداز میں بولا۔ ”یہ دنیا ہے اور یہاں ہر طرح کے لوگ ملیں گے۔ سچ کر نکلتا ہی کمال کی بات ہے۔ دوسروں کو نقصان پہنچانا اچھی بات نہیں مگر یہ بھی ٹھیک نہیں کہ لوگوں کے ہاتھوں نقصان اٹھاؤ۔“ وہ مزید بولا۔

آج نعمان کی باتوں نے مجھے زندگی کا ایک نیا رخ دکھایا تھا کیونکہ سچ ہے کہ ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا۔

میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
”میں وعدہ کرتا ہوں اب کبھی نماز نہیں ترک کروں گا۔“ میں ندامت سے بولا۔ میں نعمان کے ساتھ چلتا ہوا مسجد میں پہنچا۔ اس دوران میں نے نوٹ کیا کہ نعمان کی چال کسی قدر تیز تھی۔ بظاہر لگتا تھا کہ چل رہا ہے مگر ساتھ چلنے سے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اڑ رہا ہو۔ میرا سانس پھولنا شروع ہو جاتا اس کے ساتھ چلتے ہوئے۔

☆.....☆

میرے افسر مجھ سے بہت خوش تھے۔ وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے تھے۔ میں بھی اپنی ذمہ داری ایمانداری سے نبھاتا تھا۔ انہوں نے ایک ضروری قائل مجھے دی کہ میں حفاظت سے اپنے پاس رکھوں۔ یہ بات صرف میرا کوئی فیاض جانتا تھا۔ انہوں نے کچھ دنوں بعد وہ قائل منگوائی تو وہ ملی نہیں میں نے ہر جگہ تلاش کی مگر نہ ملی۔ اسی سے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ صبح نعمان سے ملاقات ہوئی۔ میری خاموشی اور پریشانی وہ جان چکا تھا۔ مجھے تو جیسے عادت سی ہو گئی تھی نعمان کو ہر بات بتانے کی۔ میں نے اسے تمام صورت حال بتائی تو اس نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی۔

”علی تمہاری قائل گم نہیں ہوئی چوری ہوئی ہے۔“ نعمان ٹھوس لہجے میں بولتا مجھے حیران کر گیا۔
”کیا! چوری..... نعمان یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بھلا میری قائل کیوں کوئی چوری کرے گا۔“ میں بے یقین لہجے میں بولا۔ میری حیرت پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”نعمان میرے علاوہ تو اور کوئی جانتا ہی نہیں پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں ابھی بھی حیران پریشان تھا۔
”ایک اور بھی شخص ہے جو جانتا ہے۔“ نعمان حیران پر حیران کیے جا رہا تھا۔

”ہاں مجھے یاد آیا، فیاض.....! فیاض ہی دوسرا فرد ہے جو اس بات سے واقف تھا۔“ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔

اس کے انتظار میں باہر نکل آیا۔ انتظار کرتے کرتے کانی نام ہو گیا۔ نعمان نہیں آیا میں جلدی سے مسجد کی طرف بھاگا۔ شاید کہ وہاں ملاقات ہو جائے مگر وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ جماعت کھڑی ہو گئی مگر نعمان نہ آیا۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا، کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گیا یا کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو، اندیشے مجھے ڈرا رہے تھے۔ میں سارا دن نعمان کا ہی سوچتا رہا۔

مجھے نعمان کا انتظار کرتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا مگر وہ نہیں آیا۔ مجھے سخت تشویش ہو رہی تھی۔ نہ مجھے اس کے گھر کا پتا معلوم تھا نہ رابطے کا کوئی نمبر۔ مجھے اپنی بے وقوفی پر شدید غصہ آیا کہ میں نے کبھی اس سے اس کا اتنا پتا نہیں پوچھا۔

☆.....☆

میری غلطی ہمارے شادی ہو گئی۔ بہت خوشگوار زندگی گزر رہی تھی۔ ای بھی بے حد خوش تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ گھر کا ماحول بدلتی سا ہوتا چلا گیا۔ ای ذرا مذہبی مزاج کی عورت تھیں۔ ایک سادہ گھریلو مشین پر وہ دار عورت، وہ اپنی بہو سے بھی ایسی ہی توقع کر رہی تھیں۔ وہ غل ہمارے کچھ سمجھاتی تو اس کا موڈ آف ہو جاتا۔ میں اسے سمجھاتا تو وہ مجھ سے بھی ناراض ہو جاتی۔ آئے روز اپنے گھر چلی جاتی۔ ایک دن میں اسے منانے اس کے گھر چلا گیا۔

”غل ہمارے کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی خوشیوں کو قربان کر رہی ہو؟“ میں اسے حسب معمول سمجھا رہا تھا۔

”یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ خالہ جان کی ہر وقت کی روک ٹوک سے میرا دم گھٹنے لگ گیا ہے۔“ غل ہمارے اپنی ضد پر قائم تھی۔

”امی کچھ غلط نہیں کہتیں۔ وہ تجربہ کار ہیں ہم نا سمجھ اور نادان ہیں۔ وہ ہماری بھلائی چاہتی ہیں۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ غل ہمارا خاموش رہی تھی مگر چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ قائل ہونے کے موڈ میں نہیں ہے۔

”علی تم اسے الگ گھر لے دو۔“ خالہ جان نے

اپنا ہاتھ آکر مجھے حیران کر دیا۔

ای خالہ کے گھر میری اور غل جھگڑا کی مکھی کی بات کرنے لگیں۔ میں بہت خوش تھا مجھے اپنی بچپن کی محبت ملنے والی تھی۔ میں صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ نعمان کو بتائے بغیر میرا کھانا کہاں ہضم ہونا تھا۔ صبح اس کی آواز سن کر میں جلدی سے باہر نکلا۔ اسے مکھی کی خوش خبری سنائی اس کے چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہو گئے۔

”کیا ہوا، تم خوش نہیں ہوئے؟“ میں نے اسے دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولا۔

”تمہارا اور اس کا مزاج نہیں ملتا۔“ نعمان سنجیدگی سے بولا۔

”ارے یہ کیسی بات کی تم نے۔ تم اس سے کہاں ملے ہو جو اس کا مزاج جانتے ہو۔“ میں اس کی بات پر الیکٹرم ہنسا تھا۔

”جاننے کے لیے ملاقات شرط تو نہیں۔“ نعمان اپنے مخصوص انداز سے بولا۔

”میں نہیں جانتا کہ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو مگر میں اور غل ہمارا بچپن سے ساتھ کھیلے اور پڑھے ہیں۔ میں تو اس کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر یہ بھی دیکھو کہ اس کی محبت کی طاقت کہ اس نے مجھے باجماعت نماز پڑھنے پر مجبور کر دیا۔“ میرے لہجے میں اپنی محبت پر فخر نمایاں تھا۔

”دیکھو غل میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں مگر کبھی کبھی انسان جو چاہ رہا ہوتا ہے وہ اس کے لیے بہتر نہیں ہوتا مگر انسان ضد کرتا رہتا ہے اور پھر وہ اپنی چاہت حاصل بھی کر لے تو اس میں برکت نہیں رہتی اور پھر انسان چاہ کر بھی خوش نہیں رہتا۔ تم اور وہ دو الگ مزاج کے لوگ ہو۔ اس فیصلے میں سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔“ نعمان مایوسی سے بولتا چلا گیا تھا۔

☆.....☆

میری اور غل ہمارے مکھی کی محبت خوش تھا۔ اپنی خوشی میں بالکل بھول ہی گیا تھا کہ نعمان نے غل کے بارے میں کوئی مثبت پہلو نہیں بتایا تھا۔ میں نے مٹھائی خریدی اور نعمان کے لیے رکھ لی۔ صبح جلدی

سمجھوتے کی نذر ہو رہی تھی۔

☆.....☆

امی سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ نوکری ملنے کے بعد آپ کو عمرے کی ادائیگی کے لیے لے جاؤں گا۔ میری اولاد کی خوش خبری سن کر امی نے کہا کہ میں شکرانہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ ہمارا ویزا لگ چکا تھا۔ ظل ہما کو میں نے خالہ کی طرف چھوڑا اور امی کے ساتھ ایئر پورٹ آ گیا۔ میری فلائٹ رات کو ایک بجے تھی۔ ہم انتظار میں بیٹھے تھے کہ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ تمام ضروری کاغذات چیک کر لوں۔ میں نے بیگ کھولا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ تمام ضروری کاغذات اور ٹکٹوں والا بیگ موجود نہیں تھا۔ میں نے امی سے پوچھا تو ان کے پاس بھی نہیں تھا۔ میری پریشانی دیکھ کر وہ رونے لگیں۔ میرے گھر سے ایئر پورٹ تک کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔ یعنی آنے جانے میں فلائٹ نکل سکتی تھی میں پریشانی سے بوکھلا رہا تھا مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کروں امی کو میں نے وہیں سامان کے پاس بٹھایا اور خود رکشہ ڈھونڈنے لگا۔

کوئی رکشہ بھی نہیں مل رہا تھا۔

”یا اللہ میری مدد فرما۔“ مجھے اپنے حبیب کا واسطہ ہے۔“ میرے لبوں پر دعا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ اتنی دیر میں امی کو دور سے آتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ میں بھاگتا ہوا ان تک پہنچا۔

”یہ لو علی یہی بیگ تھا نا۔“ امی نے میرے ہاتھ میں بیگ پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

”جی امی یہی تھا مگر آپ کو کہاں سے ملا۔“ میری حیرت ختم نہیں ہو رہی تھی۔ پھر امی نے جو بات بتائی وہ مجھے حیرت میں ڈال گئی۔ ایک آدمی آیا تھا جس نے سفید شلوار قمیض اور سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی۔ دراز قد تھا، اس نے یہ بیگ مجھے دیا اور کہا کہ یہ علی کو دے دیں اور اسے کہیں کہ اللہ کے گھر میں میرے لیے بھی ضرور دعا کرنا۔ یہ کہہ کر امی خاموش ہو گئیں۔ وہ کون تھا جو میرا نام جانتا تھا۔ میں اس کا کیا نام

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں خالہ جان۔“ میں ہنوز حیران تھا۔

”کیوں ایسا کیا غلط کہہ دیا میں نے، جو تم یوں حیران ہو رہے ہو؟“ خالہ امی ناراضگی سے بولیں۔

”خالہ جان آپ اسے سمجھانے کی بجائے مجھے مشورہ دے رہی ہیں کہ میں اس عمر میں اپنی ماں کو اکیلا چھوڑ دوں۔“ میں افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ ”ظل ہما مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس قدر جذباتی اور کم عقل ہوگی۔“ میں نے ظل ہما کو کڑے تیوروں سے گھورا۔

”کان کھول کر سن لو میں کسی صورت میں الگ گھر نہیں لون گا اور نہ ہی اپنی ماں کو اکیلا چھوڑوں گا۔ میں باہر صرف پانچ منٹ تمہارا انتظار کروں گا۔ آنا ہو تو آ جاؤ۔“ میں اس لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔

ان دونوں کو اندازہ نہیں تھا کہ میں اس طرح کا رد عمل کروں گا۔ ظل ہما میرے ساتھ واپس آ گئی تھی۔ ظل ہما سے محبت بھی ایک حقیقت تھی مگر میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ میری ماں میرے لیے دنیا میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

☆.....☆

میں آفس سے گھر آیا تو امی نے مجھے دادی بننے کی نوید سنائی تھی۔ میں بے حد خوش ہوا اپنے گھر سے۔ میں آیا تو ظل ہما کا موڈ بہت خراب تھا۔

”کیا ہوا تم خوش نہیں ہو؟“ میں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“ ظل ہما جواب میں پھنکاری تھی۔

”کیوں ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟“ میں حیران ہوا۔

”میں ابھی اولاد نہیں چاہتی۔“ ظل ہما کی اپنی منطق تھی۔

”مگر ظل ہما یہ تو خدا کی رحمت ہے کہ وہ ہمیں اولاد سے نوازا رہا ہے۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ پھر میرے اور امی کے سمجھانے پر وہ مان تو گئی مگر خوش نہیں تھی۔ ظل ہما سے شادی کے بعد مجھے بارہا نعمان کی باتیں یاد آئیں۔ کتنا عجیب تھا اس نے کہ ہم دونوں کا مزاج نہیں ملتا مگر اب یہ زندگی

جلا ہوا ہاتھ دیکھ رہا تھا جو مجھے نعمان کی پر خلوص دوستی کی یاد دل رہا تھا۔

”نعمان کہاں ہو تم، میں بہت پریشان ہوں تم تو بنیر کہے میری مشکل جان لیتے تھے۔ مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے دوست۔ ایک دفعہ آ جاؤ میں تمہاری ہر بات مانوں گا۔ کل ہمارے شادی کرنے میں تمہارا مشورہ نہیں مانا تھا شاید تم ناراض ہو گئے تھے۔“ میں اپنے جلے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر نہ جانے کب تک خود کلامی کرتا رہا اور میری آنکھ لگ گئی۔

”خواب میں دیکھا کہ ایک بہت خوب صورت جگہ ہے جو نہ زمین لگ رہی تھی نہ آسمان۔ عجیب نور بھرا ماحول تھا۔ لگتا تھا کسی جشن یا دعوت کا انتظام ہو رہا تھا۔

بہت سے دراز قد مرد اور نقاب پوش عورتیں پھر رہی تھیں۔ بچے، بادل، ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ میری نظر

نعمان پر پڑی جو مسکراتا ہوا میری جانب آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

”نعمان تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں کتنی مشکل میں ہوں تم تو ایک دفعہ بھی لوٹ کر نہیں آئے۔“

میرے لبوں پر شکوہ اٹھ آیا۔ میرے رونے پر وہ محبت سے مسکراتے ہوئے میرے گلے لگ گیا۔

”میں کچھ مجبوریوں کی وجہ سے نہیں آ سکا مگر دیکھو میں نے تمہیں تو اسے پاس بلا لیا۔“ نعمان کے خوب صورت چہرے پر مسکراہٹ تھی میں ہنوز غم زدہ تھا۔

میری خاموشی پر وہ اچانک بولا۔

”آج کل تم جس مسئلے کی وجہ سے پریشان ہو اس کا کچھ حل نہیں نکلتا، تم کل ہمارا آزاد کرو۔ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا۔“ نعمان مخلصانہ لہجے میں بولا۔

”میری آنکھ کھل گئی۔ اذان ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا کہ میں نے خواب نہیں دیکھا۔

یہاں ایک نعمان کی دلفریب خوشبو میرے ارد گرد پھیل سی گئی۔ میں نے کئی میں دیکھا کوئی نہیں تھا۔ مسجد میں بھی

نظر نہ آیا۔ میری نلا قارت تو نہ ہو سکتی مگر کسی نہ کسی طریقے سے وہ مشکل کا حل بنا لیا تھا۔ میں نے کل ہمارا آزاد

کر دیا تھا کیونکہ میں اسے زبردستی ساتھ رکھنے کا قائل

نہ کر دعا کروں میں انہی سوچوں میں غم تھا کہ نعمان کی خوشبو میرے ارد گرد پھیل سی گئی۔ مجھے خوشگوار حیرت ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرے دل کو یقین سا ہونے لگا تھا کہ وہ شخص اور کوئی نہیں نعمان ہی تھا۔

☆.....☆

میرا بیٹا ہوا تھا۔ میں تو خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ ای بھی بے حد خوش تھیں دادی بن کر انہیں ایک کھلوٹا جو مل گیا تھا جس سے وہ کھیلتیں۔ میں ان کی خوشی میں خوش تھا کہ ظل ہمارے پھر سے پرسکون جھیل میں پتھر مار کر مجھے بے سکون کر دیا تھا۔ میں دفتر سے گھر آیا تو ای پریشان تھیں اور میرے بیٹے کو سنبھال کر ہلکان ہو رہی تھیں۔

”ای کل ہمارا کہاں ہے؟“ میں نے بچے کو گود میں لیتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹا وہ اپنی ماں کے گھر چلی گئی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ مجھے بچے پالنے کا کوئی شوق نہیں۔ آپ کو شوق

تھا آپ ہی پالیں۔“ ای کے لہجے میں دکھ تھا۔ میں بے حد غم زدہ ہوا تھا کہ کسی ماں ہے جسے اپنے بچے پر بھی رحم نہیں آیا۔

میں اس کے گھر گیا تھا وہ یوں مطمئن تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”ظل ہمارا یہ کیا حرکت ہے؟“ میں دکھ اور افسوس سے بولا۔

”علیٰ میں تمہارے ساتھ مزید زندگی نہیں گزار سکتی۔ تمہارے گھر کی پابندیاں میری برداشت سے

باہر ہیں۔ بچہ تمہاری خواہش تھا میری نہیں اس لیے یہ تمہارے پاس ہی رہے گا اور خلع کے پیر تمہیں جلد مل جائیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ بے رحمی سے اندر چلی گئی۔

ایک بل میں سب ختم ہو گیا تھا۔ ظل ہمارے محبت کا ماں بھی نہیں رکھا تھا۔ میں گھر آ گیا مجھے ہر طرف

اندھیرا ہی اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے نعمان کی شدت سے یاد آ رہی تھی۔ مجھے اس کا کہا ہوا ایک ایک

لفظ یاد آ رہا تھا کہ تم اور ظل ہمارا الگ مزاج کے لوگ ہو۔ ضد سے ملاصل کی گئی چیز میں حرکت ختم ہو جاتی

ہے۔“ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں اپنا

اس نہیں آتے۔ اس لیے یہ بیمار رہتا ہے۔“ اس نے بالٹی میں سے ایک انڈا نکالا اور میرے بیٹے کو پکڑا دیا وہ ایسے کھانے لگا جیسے کافی دنوں کا بھوکا ہو۔ وہ شخص جانے لگا تو میں نے پکارا۔

”بھائی پیسے تو لیتے جاؤ۔“ اس نے مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

”دوستوں سے پیسے نہیں لیے جاتے۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے گلی سے نکل گیا۔ میرا دل چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ یہ نعمان تھا۔

میں تیزی سے گلی کے کونے پر گیا مگر اس شخص کا کہیں پتا نہ تھا اتنی جلدی وہ کہاں چلا گیا تھا۔ میرا بیٹا بہت دنوں بعد پرسکون نیند سو رہا تھا۔ اس شخص کے الفاظ میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ اس نے مجھے دوست کیوں کہا؟ اس کو کیسے پتا چلا کہ میرے بیٹے کا نام شن ہے۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ مہربان اجنبی کوئی اور نہیں نعمان ہی تھا۔ آج پھر ایک دفعہ وہ میری مشکل میں کام آیا تھا۔

☆ ☆ ☆
میرا بیٹا نعمان پانچ سال کا ہو گیا ہے جی ہاں میں نے اس کا نام بدل دیا ہے اور نعمان سے محبت کا یہ انداز ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کا نام اپنے عزیز دوست کے نام پر رکھ دیا ہے۔ آج بھی جب سرد راتوں میں کوئی آواز لگتا ہے مگر مگر مگر یا نماز فجر کے وقت کوئی پکارتا ہے جلدی جلدی اٹھیے اور نماز فجر ادا کریں تو میں باہر گلی میں نکل آتا ہوں۔ مجھے آج بھی اس فرشتے جیسے مہربان دوست کی تلاش ہے۔

اسے یاد کرتے ہوئے میری آنکھیں بھر آتی ہیں۔ نہ جانے وہ مجھے یاد کرتا ہوگا یا نہیں۔ ابھی بھی نعمان کی خوشبو مجھے اپنے ارد گرد سے آنے لگی ہے۔ جیسے وہ میرے قریب ہی بیٹھا ہو مگر ایسی کون سی پابندی ہے جو اسے میرے سامنے نہیں آنے دیتی۔ اس سوال کا جواب شاید میں کبھی بھی نہیں دے پا سکوں گا۔

☆ ☆ ☆

نہیں تھا۔ جب اسے میری محبت اور اپنے بچے کا خیال نہیں تھا تو پھر کیا بات اسے روک سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں نے اپنے بیٹے کا نام شرجیل رکھا تھا۔ میں آفس سے گھر آتا اور اپنے بچے کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ اسی مجھے دیکھ کر دکھی تو ہوتی تھیں۔ مگر شرجیل نے انہیں بھی بہلا دیا تھا۔ سارا سارا دن اس کے کاموں میں گمن رہتیں۔ اکثر میرے دل میں خواہش آتی کہ کاش نعمان آتا میں اسے اپنے بیٹے سے ملواتا۔ میں سوچتا اور خود ہی مسکرا دیتا۔

سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ میرا بیٹا بہت بیمار رہنے لگا تھا۔ بہت ٹیسٹ کروائے۔ دوائیاں لے کر دیں مگر افاقہ نہ ہو۔ میں اس کی وجہ سے آفس سے جلدی آ جاتا وہ بے تحاشا روتا رہتا۔ ایک دن تو وہ اتنا بے چین تھا کہ ایک پل کے لیے بھی چپ نہیں ہو رہا تھا۔ اسی بے چاری ہلکان ہو رہی تھیں اسے سنبھال کر۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور گلی میں ٹھہلنا شروع کر دیا حالانکہ خاصی سردی تھی۔ میں اسے لے کر گلی میں ٹھہل رہا تھا کہ آواز آئی۔

”گرم انڈے۔“ میں نے سنا مگر شرجیل کو چپ کروانے کی وجہ سے میں نے ایک پل کے لیے بھی اسے نہ دیکھا میں دوبارہ چکر لگانے لگا دیکھا ایک دروازہ قد شخص میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انڈوں کی بالٹی تھی۔

”لگتا ہے آپ کا بیٹا بیمار ہے۔“ وہ اجنبی آواز میرے قریب سے ابھری۔

”جی اس کو سردی لگ گئی ہے۔“ میں نے بغیر دیکھے جواب دیا۔

اس آدمی نے اپنا ہاتھ چادر سے نکالا اور میرے بیٹے کے سویٹر میں ڈال کر سینے پر رکھ دیا۔ میرا بیٹا جو ایک منٹ کے لیے بھی چپ نہیں ہو رہا تھا۔ اب یوں پرسکون تھا جیسے بیمار ہی نہ ہو۔ میرا بیٹا اس شخص کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ بلکہ بار بار ہاتھ اس کی طرف بڑھاتا کہ جیسے اس کی گود میں جانا چاہتا ہو۔

”اس کا نام بدل دو۔ لفظ شن کے نام ہر کسی کو



پراسرار سر کی چوٹی خاص کہانی

یاد اور آف لو



ضرغام محمود

اس شخص کی کہانی جو بیوی کے قاتل سے انتقام لینے کے لیے مرکز بھی نہ مرا تھا

کی کوشش کر رہا تھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ پھر میں نے ایک جگہ رک کر جہاں تھوڑی روشنی تھی میں نے اپنے ہاتھ میں پہنی گھڑی میں وقت دیکھا رات کے دس بج رہے تھے۔

میں۔۔۔ میں شام کو پانچ بجے اپنے شوروم سے گھر جانے کے لیے نکلا تھا۔۔۔ ہاں یاد آیا۔۔۔ میں اپنی گاڑی میں شوروم سے گھر جانے کے لیے نکلا تھا۔۔۔ تو پھر۔۔۔ یہاں۔۔۔ شادمان روڈ کیسے پہنچا۔۔۔ میں ایک بار پھر سوچوں میں گم ہو گیا۔ میری سوچ کی سوئی بار بار اس بات پر اٹک رہی تھی کہ میں رات کے دس بجے شادمان روڈ پر کیا کر رہا ہوں۔ یہ سڑک عموماً سنسان رہتی ہے اور اس سڑک پر لوگ شام کے بعد سفر کرنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس سڑک کے اطراف میں اکثر جرائم پیشہ افراد گھومتے رہتے ہیں جو موقع ملنے پر کسی کو بھی لوٹ لیتے ہیں۔ اس سڑک پر کئی ڈکیتی کی وارداتیں ہو چکی ہیں جس میں لوگ قتل تک ہو چکے ہیں لہذا کوئی بھی شریف آدمی شام کے بعد اس سڑک پر سفر نہیں کرتا اور۔۔۔ اور میں رات کے دس

بیس اندھیرے میں چپ چاپ کھڑا اپنی سوچوں میں گم تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں اور مجھے یہ کمزوری کیوں محسوس ہو رہی ہے میرے سر میں درد کے دھماکے کیوں ہو رہے ہیں میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر سر پر پھیرنا چاہا تو میرا ہاتھ میرے سر پر رکھی گرم ٹوپی سے ٹکرایا موسم چونکہ بے حد سرد تھا لہذا میں نے نہ صرف گرم کوٹ پہنا ہوا تھا بلکہ سر پر گرم ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔ میں نے ٹوپی کے اوپر ہاتھ رکھ کر اپنے درد سے پھٹتے سر کو سہلانا چاہا جیسے ہی میں نے ہاتھ ٹوپی پر رکھا میرے سر میں اچھتی تیسیں مزید تیز ہو گئیں۔ میں نے جلدی سے اپنے سر پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک مار کر انہیں گرم کرنے لگا پھر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ میں ابھی تک اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ مجھے تو گھر جانا تھا میری بیوی نے مجھے فون کر کے فوراً گھر پہنچنے کا کہا تھا مگر میں یہاں کیوں آ گیا۔

میں مسلسل سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا اور یاد کرنے

شہنشاہ یا سر ہے۔ وہ ملک کی کافی مشہور صحافی اور ایڈیٹر پرسن ہے۔ خاص طور پر انوسٹی گیشن صحافت اس کی خاص پہچان ہے۔ شہنشاہ نے بڑے بڑے حکومتی گھپلوں کو بے نقاب کیا اس کا نام ملک کے انتہائی معتبر صحافیوں میں ہوتا ہے۔ شہنشاہی اور میری لو میرج تھی ہماری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں۔ میں ایک بڑے الیکٹرونکس شوروم کا مالک ہوں۔ میرا کاروبار کافی بڑا

بجے اس سنان سڑک پر کیا کر رہا ہوں۔
میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ سوچنے سے میری سرک
درد مزید بڑھ گیا تھا ”آخر میرے ساتھ کیا واقعہ پیش
آیا۔۔“

”ہاں مجھے یاد آیا شام کو پانچ بجے جب میں اپنے
شوروم پر مصروف تھا تو میری بیوی شہنشاہی کا فون آیا
شہنشاہی میری بیوی کا پیار کا نام ہے اس کا اصل نام



دیکھا پوری سڑک سنسان تھی۔ ہم دونوں کے علاوہ وہاں کوئی اور نہیں تھا جو ان فقیرنی اپنے بچے کو سینے سے لگائے مجھے خوفزدہ نظروں سے تک رہی تھی، اس کے منہ سے مسلسل چیخیں نکل رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پریشان نظروں سے فقیرنی کو گھورتے ہوئے پوچھا اور دو قدم آگے کی جانب بڑھا میرے اس طرح آگے بڑھنے سے وہ فقیرنی اور تیزی کے ساتھ چیخنے لگی وہ مجھے ایسی نظروں سے گھور رہی تھی جیسے میں انسان نہیں کوئی بھوت ہو۔

”کیا ہو گیا۔۔۔ کیوں اس طرح چلا رہی ہو۔۔۔؟“ میں فقیرنی کے مقابل کھڑا ہوا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”اوئے۔۔۔ اکیلا دیکھ کر جو ان لڑکی کو چھڑتا ہے۔۔۔“ نہ جانے کہاں سے ایک کیم کیم کالا سا آدمی غراتا ہوا میری جانب بڑھا۔ میں اس آدمی کی جانب متوجہ ہوا تو وہ فقیرنی اپنے بچے کو سینے سے لگائے سڑک پر سیدھی بھاگ لگی۔

”میں نے اسے نہیں چھڑا۔۔۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا وہ بلا وجہ ہی چیخنے لگی۔۔۔“ میں نے اس آدمی کو وضاحت دی۔

”وہ بلا وجہ چیخنے لگی یا تو نے اس سے دست درازی کی کوشش کی۔۔۔“ موٹا آدمی میرے قریب آتے ہوئے بولا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا میں تو۔۔۔“ میں اپنی صفائی دینا چاہتا تھا مگر وہ موٹا آدمی کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھا اس نے مزید آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے زور کا جھٹکا دیا جسکے کی وجہ سے میرے سر پر بھی ٹوپی زمین پر گر پڑی۔

”چھوڑو میرا گریبان۔۔۔“ میں نے اس آدمی سے اپنا گریبان چھڑانا چاہا۔ میں اس موٹے کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ موٹا آدمی میری بات سمجھ جائے کیونکہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور تھا اگر بات مار کٹائی تک آجاتی تو وہ موٹا میرا بھر کس بنا سکتا تھا۔

”میرا گریبان چھوڑو۔۔۔“ میں نے ایک بار پھر اس موٹے سے اپنا گریبان چھڑانا چاہا تو اس

ہے لہذا ہمیں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے اور ہم دونوں انتہائی خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔

”ہاں یاد آیا۔۔۔“ شہنائی پچھلے کچھ دنوں سے کافی پریشان ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی مگر وہ ہر بار بڑی خوبصورتی سے میری بات ٹال جاتی اور۔۔۔ اور آج شام پانچ بجے شہنائی کا فون میرے شوروم پر آیا وہ کافی گھبرائی ہوئی تھی اس نے مجھے فوراً گھر پہنچنے کا کہا۔ شہنائی کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر میں پریشان ہو گیا اور شوروم اپنے ایک قابل اعتماد ملازم کے حوالے کر کے میں اپنی گاڑی میں آندھی طوفان کی طرح گھر کی جانب روانہ ہوا۔ جب میں اس بلڈنگ کے سامنے پہنچا جہاں پر ہمارا اپارٹمنٹ تھا تو میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

”اف۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔ مجھے تو اپنے گھر پر شہنائی کا یاس ہونا چاہیے تھا پھر۔۔۔ پھر میں اپنے گھر کے بجائے شادمان روڈ پر کیا کر رہا ہوں۔۔۔ ساڑھے پانچ بجے سے رات دس بجے تک میں کہاں رہا۔ میرے ساتھ کیا ہوا۔۔۔ یہ مجھے اتنی کمزوری کیوں محسوس ہو رہی ہے۔۔۔ میرے سر میں کیوں اتنا شدید درد ہو رہا ہے۔۔۔“

میری۔۔۔ میری گاڑی کہاں ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ شادمان روڈ پر کیا کر رہا ہوں، مسلسل سوچنے سے میرے سر میں ہونے والے درد میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”اللہ کے نام پر۔۔۔ کچھ دے دو صاحب۔۔۔ میرا بچہ دو دن سے بھوکا ہے۔۔۔“ میں چلتے چلتے ایک کھبے کے پاس پہنچا کھبے پر لگے بلب کی ملگجی روشنی سڑک پر پھیل رہی تھی اسی کھبے کے پاس کھڑی ایک جوان فقیرنی جس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا میرے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگنے لگی۔

فقیرنی کی آواز سن کر میں اپنی سوچوں سے باہر آیا اور میں نے نظر اٹھا کر فقیرنی کی جانب دیکھا میری نظروں میں الجھن ہی الجھن تھی۔ میں غیر ارادی طور پر فقیرنی کو گھور رہا تھا اچانک فقیرنی زور زور سے چیخنے لگی۔۔۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہی تھی فقیرنی کے اس طرح چیخنے پر میں نے پریشان ہو کر چاروں طرف

موٹے نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔۔۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔

”میں اپنے شوروم سے گھر جانے کے لیے نکلا تھا تو۔۔۔ تو یہاں کیسے پہنچ گیا۔۔۔ شوروم پر میری بیوی شہنائی کا فون آیا تھا وہ۔۔۔ وہ کافی خوفزدہ تھی حالانکہ شہنائی ایک بہادر اور دلیر عورت ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر اس نے انتہائی خوفزدہ آواز میں مجھے فوراً گھر پہنچنے کا کہا۔۔۔ میں۔۔۔ میں اپنی گاڑی میں اپنے گھر جانے کے لیے نکلا تھا تو۔۔۔ تو پھر میری گاڑی کہاں ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور میں یہاں شادمان روڈ پر پیدل کیوں چل رہا ہوں۔۔۔ میں۔۔۔ میں یہاں پہنچا کیسے۔۔۔؟“

مسلسل یہ تمام سوالات مجھے پریشان کر رہے تھے یہی سب سوچتے ہوئے میں سڑک کنارے کھڑے رکتے کی جانب بڑھا۔

”بھائی۔۔۔ گرین اسٹریٹ چلو گے۔۔۔“ میں نے رکتے کے پاس پہنچ کر رکتے والے کو مخاطب کیا رکتے والا اپنے رکتے کی پچھلی سیٹ پر آرام سے سو رہا تھا میں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا اور اپنا اندعا بیان کیا۔

”ضرور چلیں گے صاحب۔۔۔“ رکتے ڈرائیور نے آنکھیں کھولیں اور رکتے سے اتر کر سڑک پر کھڑا ہو گیا وہ اپنی آنکھیں مسلسل مسسل رہا تھا شاید اس طرح وہ اپنی غنڈ بھگتا رہا تھا۔

”گرین اسٹریٹ پر کہاں جانا ہے۔۔۔“ رکتے والے نے اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے پوچھا۔

”گرین اسٹریٹ پر جو بڑا قبرستان ہے وہاں تک جانا ہے۔۔۔“ میں نے رکتے والے سے کہا کیونکہ گرین اسٹریٹ پر بنے بڑے قبرستان کے پاس ہی وہ بلڈنگ تھی جس کے ساتویں فلور پر میرا پارٹمنٹ تھا۔

”بڑا قبرستان۔۔۔“ رکتے والے نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا تو۔۔۔ تو اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکلنے لگیں وہ۔۔۔ وہ شدید خوفزدہ نظر آنے لگا۔

”کیا ہوا بھائی کیا میرے سر پر سینگ آگئے ہیں۔۔۔“ میں نے رکتے والے کو مخاطب کیا تو رکتے والا چونک بڑا اور پھر وہ بھی اس فقیرنی اور اس موٹے

میرا گریبان چھوڑتے ہوئے اس موٹے کا ہاتھ بری طرح کپکپانے لگا اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں ہو گئے اس کے نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اس کی آنکھوں میں خوف صاف نظر آ رہا تھا وہ میرا گریبان چھوڑ کر وہ قدم پیچھے ہٹ گیا اور خوفزدہ نظروں سے مجھے ہٹنے لگا۔

”کیا بات ہے۔۔۔ اب تم بھی اس فقیرنی کی طرح مجھ سے خوفزدہ دکھائی دے رہے ہو،“ میں نے مسکرا کر موٹے سے کہا تو موٹے کی کپکپاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”کیا ہو گیا بھائی۔۔۔؟“ میں نے آگے بڑھ کر موٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہا تو موٹا ہڑبڑا گیا اور پھر زور سے چیخا ہوا سنسان سڑک پر دور تک بھاگ گیا۔ وہ بھاگتے ہوئے بار بار مڑ مڑ کر خوفزدہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا اس کا چہرہ خوف کی وجہ سے سفید پڑ گیا تھا۔ وہ مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھتا ہوا اندھیرے میں کھو گیا۔

موٹے اور فقیرنی کے اس طرح خوفزدہ ہونے سے میں مزید پریشان ہو گیا۔

”یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔ کیا میری شکل خوفناک ہو گئی ہے۔۔۔“ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا پھر میں نے زمین پر گری اپنی ٹوپی اٹھائی اور اسے سر پر رکھا اور سوچتے ہوئے سڑک پر سیدھا چلنے لگا۔

”کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ایک رکتہ نظر آیا میں نے جلدی سے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ دیکھ سکوں کہ میرا وائلٹ (پرس) میری جیب میں ہے یا نہیں۔۔۔۔۔ جیب میں میری انگلیاں میرے وائلٹ سے ٹکرائیں تو میں نے وائلٹ جیب سے نکالا اور اسے کھول کر دیکھا وائلٹ میں کافی پیسے تھے۔

”اگر مجھے کسی نے نہیں لوٹا۔۔۔ اور میری مذ بھیڑ کسی جرائم پیشہ سے نہیں ہوئی تو۔۔۔ تو پھر میں یہاں شادمان روڈ پر کیا کر رہا ہوں اور۔۔۔ اور یہ میرے سر میں اتنا شدید درد کیوں ہو رہا ہے۔۔۔ کیا میرے سر

آؤی کی طرح چیتے ہوئے اپنا رکشہ چھوڑ کر سیدھا بھاگتا چلا گیا۔

”یہ۔۔۔ یہ کیوں بھاگ گیا۔۔۔“ میں نے بوکھلا کر سوچا۔

”یہ سب لوگ مجھ سے خوفزدہ کیوں ہو رہے ہیں۔۔۔ کہیں میرا چہرہ خوفناک تو نہیں ہو گیا یا واقعی میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں“ میں یہ سب سوچنے لگا اور رکشہ چھوڑ کر پیدل ہی ایک جانب چلنے لگا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا چہرہ کسی جانور کے چہرے میں تبدیل ہو گیا ہو۔۔۔“ میں نے سوچا کیونکہ کچھ دن پہلے ہی میں نے ایک رسالے میں ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک آدمی رات کو انسان کے روپ میں سوتا ہے اور صبح اٹھتا ہے تو وہ خونخوار کتے کے روپ میں ہوتا ہے۔ ہارر کہانیاں پڑھنا اور ہارر موزیک دیکھنا میرا شوق ہے مگر۔۔۔ مگر اس وقت تو میں خود کسی ہارر موزی کا خوفناک کردار بنا ہوا ہوں جس سے ہر شخص ڈر کر بھاگ رہا ہے۔

میں نے جلدی سے اپنے ہاتھ پیروں پر نظر دوڑائی اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔

”میں۔۔۔ میں انسان ہی کے روپ میں ہوں۔۔۔“ میں نے اپنے ہاتھ پیروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

”میرا خیال ہے مجھے پیدل ہی گھر چلنا چاہیے آدھا ایک گھنٹے کی واک سے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔۔۔“ میں نے ایک بار پھر سوچا اور اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔

میں تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا تیز چلنے کی وجہ سے میرے سر میں درد کے دھماکے ہو رہے تھے مگر میں نے پروا نہیں کی اور میں تیز چلتا رہا میں سر جھکائے چل رہا تھا کہ میری نظر سامنے اٹھی سامنے ایک چائے کا چھوٹا سا ہوٹل تھا چائے کا ہوٹل دیکھ کر مجھے ایک دم چائے کی شدید طلب ہونے لگی۔ چائے کی طلب محسوس کرتے ہی میں نے اپنا رخ چائے کے ہوٹل کی جانب کیا اور آگے بڑھا۔

چائے کا وہ ہوٹل چھوٹا سا تھا مگر صاف ستھرا تھا

جب میں ہوٹل میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ پورا ہوٹل خالی ہے بس ایک پٹھان کوٹے میں کھڑا چائے بنا رہا ہے۔

”لالہ ایک کپ اسٹرائنگ سی دودھ پتی چائے تو بنا دو۔۔۔“ میں نے چائے بناتے پٹھان بھائی کو مخاطب کیا۔

”ابھی بناتا ہے۔۔۔ بیٹھو۔۔۔“ پٹھان بھائی نے اپنے مخصوص کمرے لے لےجھ میں جواب دیا تو میں ایک اسٹول اٹھا کر لایا اور پٹھان بھائی کے سامنے بیٹھ گیا چونکہ سردی خاصی تھی اور پٹھان کے سامنے چولہا جل رہا تھا لہذا میں چولہے کی آگ پر ہاتھ تاپنے لگا۔

”کیا بات ہے۔۔۔ ہوٹل خالی ہے۔۔۔“ میں نے پٹھان سے بات چیت شروع کی۔

”سروپوں کی وجہ سے لوگ جلدی گھر چلے جاتے ہیں“ پٹھان چائے کی کیتلی میں چینی اور پتی ڈالتے ہوئے بولا اس نے اب تک نظر اٹھا کر میری نہیں دیکھا تھا بس وہ نظریں نیچی کیے چائے بنا رہا تھا۔ چائے بنانے کے بعد اس نے چائے ایک کپ میں ڈالی اور چائے کا کپ میری جانب بڑھایا تو میں نے ایک ہاتھ چائے کا کپ تھامنے کے لیے بڑھایا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سر پر پہنی ٹوپی اتار کر کاؤنٹر پر رکھی۔

پٹھان نے چائے کا کپ میری جانب بڑھاتے ہوئے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا تو۔۔۔ تو اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹ گیا اور وہ چیختا ہوا ہوٹل سے باہر کی جانب بھاگا۔

”رکو۔۔۔ رکو۔۔۔ لالہ۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟“ میں چیخا مگر پٹھان نے میری بات پر دھیان نہیں دیا اور چیختا ہوا ہوٹل سے باہر بھاگ گیا۔

”یا خدا یا۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ سب لوگ مجھے دیکھ کر کیوں ڈر رہے ہیں کہیں میرے چہرے پر کوئی خوفناک بات تو نہیں ہے۔۔۔“ میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا مگر مجھے اپنے چہرے پر کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی میری ناک میرے مونٹ میرے کان سب اپنی جگہ پر موجود تھے۔ میں نے اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھنے کی غرض سے ہوٹل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



طرح اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ غنڈہ بھی خوفزدہ ہو گیا
”دور رہو۔۔۔ مجھ سے دور رہو۔۔۔“ وہ غنڈہ زور

سے چیخا اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”کیا ہوا بھائی۔۔۔ حیرت تو ہے نا۔۔۔؟“ میں

نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

”تم۔۔۔ تم زندہ کیسے ہو گئے۔۔۔“ اس غنڈے

نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں مرا کب تھا۔۔۔۔۔ جو زندہ کیسے ہو۔۔۔“

میں نے حیرت سے اس غنڈے کی تہ کی نقل

اتاری۔

”تم۔۔۔ تم زندہ نہیں ہو سکتے۔۔۔ تم۔۔۔ تم مر

چکے ہو۔۔۔“ وہ غنڈہ حیرت سے چیخا تو۔۔۔۔۔ تو میں

بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

”میں زندہ ہوں اور پوری طرح صحت مند

ہو۔۔۔“ میں نے اٹھا ہاتھ آگے کرتے ہوئے اس

غنڈے کو جواب دیا۔

”دور رہو۔۔۔۔۔ مجھ سے دور رہو۔۔۔“ اچانک

اس غنڈے نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔

”کیا ہو گیا بھائی۔۔۔ کیوں مجھ سے ڈر رہے

ہو۔۔۔ میں زندہ ہوں۔۔۔ میں نہیں مرا۔۔۔“ میں نے

اپنی جگہ پر رکتے ہوئے جواب دیا میری نظریں اس

غنڈے کے پستول پر جمی ہوئی تھیں۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں تم زندہ نہیں ہو سکتے۔۔۔ تم مر

چکے ہو۔۔۔ میں نے خود تمہاری لاش دیکھی تھی۔۔۔“

”تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے میرے

دوست۔۔۔“ میں نے پیار سے اس غنڈے سے کہا

مجھے خطرہ تھا کہ کہیں وہ غنڈہ خوفزدہ ہو کر گولی نہ چلا

دے ”میں زندہ ہو۔۔۔ اور صحت مند بھی ہو۔۔۔ تم نے

شاید کسی اور کی لاش دیکھی ہوگی۔۔۔ تمہیں مغالطہ ہو رہا

ہے۔۔۔“ میں نے غنڈے کو رام کرنا چاہا۔

”نہیں مجھے کوئی مغالطہ نہیں ہو رہا۔۔۔ وہ تم ہی

تھے۔۔۔ تم۔۔۔ تم مر چکے ہو۔۔۔“ غنڈہ اپنی بات پر اڑا

ہوا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں نے یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو۔۔۔“ میں جھنجھلا گیا۔

”تم۔۔۔ تم یا سر جواد ہو نا۔۔۔ شہر صحافی شہنشاہ

میں چاروں طرف نظریں گھمائی کہ شاید مجھے کوئی
آئینہ مل جائے جس میں، میں اپنی صورت دیکھ سکوں
تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ لوگ مجھ سے کیوں خوفزدہ
ہو رہے ہیں ہوٹل میں چاروں طرف نظریں دوڑانے
کے بعد بھی مجھے ہوٹل میں کوئی آئینہ نظر نہیں آیا جس
میں، میں اپنی صورت دیکھ سکوں ہوٹل کے چاروں
اطراف نظر دوڑانے کے بعد جب کوئی آئینہ مجھے نہ ملا
تو میں نے مایوسی کے عالم میں کاؤنٹر پر رکھی اپنی نوپي
اٹھا کی اور اسے سر پر جمایا اور ہوٹل کے باہر کی
دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔

اس سے پہلے کہ میں ہوٹل سے باہر نکلتا ایک کالا
بھنگ آدی ہوٹل میں داخل ہوا اس موٹے تازے
کالے آدی نے کالی جینز کی پینٹ اور کالی ٹی شرٹ
پہنی ہوئی تھی اس کے پیر میں کالے اسپورس شور
تھے۔ گویا وہ آدی اوپر سے نیچے تک کالے لباس میں
لبوس تھا۔ اس کی کالی ٹی شرٹ پر اور بلیج رنگ سے
ایک کھوپڑی کا نشان بنا ہوا تھا ایسا لگتا تھا گویا
اند میرے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس آدی کے
چہرے پر دائیں جانب کال پر ایک بڑے گھاؤ کا
نشان تھا شاید کافی عرصہ پہلے اسے کسی نے چاقو سے
زخمی کیا تھا جس کا نشان اس کے چہرے پر رہ گیا
تھا۔ وہ کالا آدی اپنے چہرے مہرے اور چال ڈھال
سے ہی غنڈہ معلوم ہو رہا تھا اس غنڈے نے ہوٹل میں
داخل ہو کر چاروں طرف اپنی نظریں دوڑائی پھر اس
کے نظر مجھ پر پڑی تو اس کی نظریں مجھ پر جمی کے جمی رہ
گئی۔

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ غنڈے نے حیرت زدہ
انداز میں کہا

”ہاں۔۔۔ میں“ میں نے بھی حیرت کا اظہار کیا
مجھے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ یہ غنڈہ مجھے دیکھ کر
خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ وہ غنڈہ ایک بار پھر حیرت
سے بڑبڑایا

”ہاں۔۔۔ میں نے یہ کیا ہوا؟“ میں نے بھی حیرت
سے پوچھا اور اس غنڈے کی جانب بڑھتا مجھے اس

غنڈے کے پیچھے بھاگتے ہوئے چیخا میری آواز سن کر اس غنڈے نے مڑ کر میری جانب دیکھا اور مجھے اپنے تعاقب میں آتا دیکھ کر اور تیز بھاگنے لگا۔

”میں بھی پوری طاقت سے اس غنڈے کے پیچھے بھاگ رہا تھا اس طرح تیز بھاگنے کی وجہ سے میرے سر میں درد کے دھماکے ہو رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں چکرا کر گر جاؤں گا مگر میں ہمت کر کے اس غنڈے کا پیچھا کرتا رہا مگر جلد ہی میری ہمت ٹوٹ گئی اور میں نے بھاگنا بند کر دیا۔ وہ غنڈہ انتہائی تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا اندھیری گلیوں میں گم ہو گیا جب وہ غنڈہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں اپنی جگہ رک گیا اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے لگا۔ سانسوں پر قابو پانے کے ساتھ میں غنڈے کی باتوں پر بھی غور کر رہا تھا۔

اس غنڈے نے مجھے صحیح شناخت کیا کہ میں مشہور صحافی شہنشاہ یاسر کا شوہر یاسر جواد ہو مگر۔۔۔ مگر وہ یہ کیوں کہہ رہا تھا کہ میں مرچکا ہوں۔ میں سوچنے لگا۔

”اور وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اس نے مجھے قتل کیا ہے۔۔۔ مگر اس نے مجھے کیوں مارا۔۔۔ میں اپنے ذہن پر زور ڈالنے لگا اچانک میرے ذہن میں بجلی کا جھماکا ہوا مجھے۔۔۔ مجھے یاد آیا شہنائی (شہنشاہ) کئی دنوں سے بہت پریشان تھی میں نے جب بھی اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی وہ ہنس کر ٹال گئی میرے بے حد اصرار پر اس نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ حکومت کے خلاف کرپشن کی تحقیقات کے دوران اسے ایک انتہائی اہم حکومتی عہدیدار کے خلاف ایک بہت اہم ثبوت حاصل ہوا ہے۔ اس ثبوت سے روئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حکومتی عہدیدار دراصل۔۔۔ دشمن ملک کا جاسوس ہے اور حکومت میں اعلیٰ عہدہ حاصل کر کے وہ ہمارے پیارے وطن کے اہم راز دشمن ملک کو بھیج رہا تھا اور اس طرح وہ ہمارے پیارے وطن کی جڑوں کو کاٹ رہا ہے۔“

میرے تار مار اصرار کے باوجود شہنائی نے مجھے اس عہدیدار کا نام نہیں بتایا اور آج۔۔۔ آج شام کو

یاسر کے شوہر۔۔۔ غنڈے نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں میں یاسر جواد ہوں۔۔۔ شہنشاہ یاسر کا شوہر۔۔۔“ میں نے اس غنڈے کی بات کی تصدیق کی۔

”پھر تم۔۔۔ تم مر چکے ہو۔۔۔“ میری بات سن کر اس غنڈے نے کہا اور اپنا پستول والا ہاتھ اوپر کیا اور میرے سینے کا نشانہ لینے لگا۔۔۔ مگر اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے خوف اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔

تم۔۔۔ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں مر چکا ہوں۔۔۔“ میں نے جھنجھلا کر غنڈے سے پوچھا اس غنڈے کی بے ٹکی باتوں سے مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی اور مجھے غصہ آ رہا تھا۔

”میں۔۔۔ میں یہ بات اس لیے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ۔۔۔ میں نے ہی تمہیں قتل کیا تھا۔۔۔“ اس غنڈے نے انکشاف کیا ”کیا“

ہاں میں نے تمہارے فلیٹ میں تمہیں قتل کیا تھا مگر۔۔۔ شاید اس وقت کوئی کمی رہ گئی۔۔۔ لہذا اب تم مجھ سے نہیں بچ سکتے۔۔۔“ افسانہ کہہ کر اس غنڈے نے پستول پر اپنا ہاتھ سخت کیا اور زنگیر پر دباؤ ڈالنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں وہ غنڈہ گولی چلانے کے لیے بالکل تیار تھا اس نے ٹریگر پر دباؤ بڑھایا مگر پستول سے گولی نہیں چلی۔ ایک لمحے کو غنڈے کی توجہ مجھ پر سے ہٹی اور وہ اپنے پستول کو دیکھنے لگا میرے لیے یہ بہترین موقع تھا میں نے قریب رکھی میز سے پانی سے بھرا جگ اٹھایا اور اس غنڈے کے منہ پر وہ مارا میری اس اچانک حرکت سے وہ غنڈہ بوکھلا گیا۔ جگ کا سارا پانی اس غنڈے کے منہ پر گرا وہ غنڈہ ایک ہاتھ سے اپنا منہ صاف کرنے لگا اور اگلے ہی لمحے اس نے اپنے قدم پیچھے کئے اور وہ ہوٹل سے باہر کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔

”اے۔۔۔ اے میری بات سنو۔۔۔ دیکھو میری تمہیں کچھ نہیں ہوں گا۔۔۔ رکت جاؤ۔۔۔“ میں اس

کروں کہ لوگ مجھ سے کیوں خوفزدہ ہو رہے ہیں یہ خیال آتے ہی میں شیشے کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا اور شیشے میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔

”یہ۔۔۔ یہ میرے چہرے کو کیا ہوا۔۔۔“ میں نے اپنے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچا میرا چہرہ بالکل سفید تھا حالانکہ میں پہلے بھی سرخ و سفید رنگ کا یا لک تھا مگر اب میرے چہرے سے سرخی غائب ہو چکی تھی میرا پورا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو مجھے اپنی جلد بھی لگی ہوئی محسوس ہوئی میں بغور اپنے چہرے کو دیکھنے لگا پھر میں نے اپنے سر پر پہنی ٹوپی اتاری تو۔۔۔ تو میرے منہ سے چیخ نکل گئی میں انتہائی خوفزدہ نظروں سے شیٹے میں موجود اپنے عکس کو گھورنے لگا۔ خوف سے میرا برا حال تھا میرے جسم سے تو ایسا لگتا تھا جیسے میرا سارا خون نکال لیا گیا ہو مگر۔۔۔ مگر میرا سر۔۔۔ اف۔۔۔ میں۔۔۔ میں زندہ کیسے ہو۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ میری کھوپڑی۔۔۔ میری کھوپڑی کہاں غائب ہو گئی۔۔۔ یا تھے۔۔۔ بعد سے پچھلے حصے تک میری کھوپڑی غائب تھی۔۔۔ اندر سے میرا پلپلا، الجھا دماغ بھاٹک رہا تھا دماغ کی اندرونی رگیں اور دماغ کے اندرونی حصے صاف نظر آرہے تھے۔ میرا دماغ پھول اور بچک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ لگا کر اپنے دماغ کو چھونا چاہا تو درد کی ایک تیز میس میرے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے جلدی سے اپنے سر پر ٹوپی رکھی اور چور نظروں سے چاروں طرف دیکھ کہ کوئی۔۔۔ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا مجھے اطمینان ہوا اور میں جلدی سے بنک کے سامنے سے ہٹ گیا۔

یہ --- یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میری کھوپڑی کہاں گئی۔۔۔ یہ حادثہ میرے ساتھ کب پیش آیا اور۔۔۔ بغیر کھوپڑی کے میں زندہ کیسے ہو۔۔۔“

میں یہ سب سوچتے ہوئے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا میں لوگوں سے بچتا بچتا محل رہا تھا۔ آخر کار میں اس بلڈنگ کے سامنے پہنچ گیا جس میں بلڈنگ کے ساتویں فلور پر میرا فلیٹ تھا میں چونکدار کے نظروں

اس نے انتہائی خوف کے عالم میں مجھے فون کیا اور گھر
 بلاپا پھر --- پھر کیا ہوا۔۔۔ میں گھر پہنچا۔۔۔ یا
 --- نہیں۔۔۔

”اف مجھے یہ کیوں یاد نہیں آ رہا کہ میں شوروم سے نکل کر کہاں گیا۔۔“ میں پریشانی کے عالم میں بڑبڑایا۔

”پھر لوگ مجھے دیکھ کر کیوں خوفزدہ ہو رہے ہیں۔۔۔ وہ فقیرنی، کالا آدمی۔۔۔ رکشے والا۔۔۔ پٹھان چائے والا۔۔۔ اور پھر وہ غنڈہ۔۔۔ اور وہ غنڈہ تو کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ کہ میں مر چکا ہوں۔۔۔۔۔ بھلا مرنے کے بعد کوئی اس طرح سڑک پر گھوم سکتا ہے۔۔۔“ میں سوچ رہا تھا۔

”آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔۔“ میں مسلسل سوچوں میں غطاب تھا۔

”مجھے فوراً گھر چلنا چاہیے۔۔۔ نہ جانے شہنائی کے ساتھ کیا حالات پیش آئے۔۔۔“ میں سوچا۔
”لیکن کوئی رکشہ ٹیکسی والا تو مجھے بٹھائے گا نہیں۔۔۔ پھر۔۔۔“

”مجھے پیدل ہی چلنا چاہیے۔ آدھے ایک گھنٹے میں، میں پیدل ہی گھر پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے سوچا پیدل چلنے کا سوچ کر مجھے سکون ملا اور میں نے سڑک پر آگے کی جانب اپنے قدم بڑھا دیئے۔

میں سوچوں میں گم سیرنگ کے کنارے کنارے
چلا جا رہا تھا میری کوشش تھی کہ میں لوگوں کی نظروں
میں نہ آؤں۔۔۔ اس لیے میں زیادہ تر اندھیرے کی
جانب سفر کر رہا تھا۔

ہیں۔۔۔ میرے چہرے میں ایسی کیا تبدیلی ہو گئی ہے
جسے دیکھ کر ہر کوئی خوفزدہ ہو رہا ہے۔۔۔ میں نے
اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔

ای وقت میری نظر سامنے ایک بنگ پر پڑی۔
بنگ بند تھا بنگ کے ساتھ اے، ٹی، ایم مشین لگی ہوئی
تھی اے، ٹی، ایم مشین جس جگہ لگی ہوئی تھی وہاں شیشے
کا دروازہ تھا شیشے کا دروازہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ
میں شیشے میں اپنا عکس دیکھوں اور یہ جاننے کی کوشش

”جلدی آؤ یا سر۔۔۔ مجھے لگتا ہے وہ قاتل میرا
تعاقب کرتے ہوئے بلڈنگ تک پہنچ چکا ہے۔۔۔“
”بس۔۔۔ دو منٹ میں پہنچتا ہوں۔۔۔“

اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر میں نے گاڑی
پارکنگ میں گھڑی کی اور تیزی کے ساتھ لفٹ کی
جانب لپکا جیسے ہی لفٹ سیونٹھ فلور پر پہنچی میں چھلانگ
مار کر لفٹ سے باہر نکلا اور دوڑتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ
تک پہنچا۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ بند تھا میں نے
دروازے سے کان لگا کر اندر کی صورتحال معلوم کرنا
چاہی مگر اندر مکمل خاموشی تھی پھر میں نے اپنی جیب
سے اپارٹمنٹ کی چابی نکالی اور دروازے کے
ہول میں چابی لگائی اور نہایت احتیاط سے چابی گھمائی
ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔ میں نے
انتہائی آہستگی اور احتیاط کے ساتھ دروازہ کھولا اور
اندر جھانکا اندر مکمل سکوت تھا مجھے شہنائی نظر نہیں آئی
میں اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور میں نے مڑ کر
دروازہ بند کیا اور آہستہ سے آگے بڑھا مگر۔۔۔ مگر
تھوڑا آگے بڑھتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے
رکھے صوفے کے پیچھے شہنائی اونٹھ مٹھ پڑی تھی
اس کی پیٹھ میں ایک بڑا سا خنجر دھرتے تک گھسا ہوا تھا
اس خنجر سے بننے والے زخم سے خون بہہ رہا تھا جس
نے شہنائی کے آس پاس ایک چھوٹا سا خون کا تالاب
بنا دیا تھا شہنائی کو اس حالت میں دیکھ کر میں بوکھلا
گیا اور جلدی سے شہنائی کی جانب بڑھا اور اسے
اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور سیدھا کیا۔

”شہنائی۔۔۔۔۔ شہنائی۔۔۔۔۔“ میں نے
شہنائی کو مخاطب کیا اور اس کا سراپے زانوں پر رکھا
شہنائی زندہ تھی اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اس کا
چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ میری آواز سن کر شہنائی نے اپنی
آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا پھر اس کے ہونٹ ہلے
وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر۔۔۔ مگر اس سے پہلے
کہ وہ کچھ کہہ سکتی مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی میں
نے جلدی سے مڑ کر دیکھا مگر۔۔۔ مگر افسوس مجھے
ویر ہوئی ایک زوردار ڈنڈا میرے سر پر پڑا اور میرے
سر سے خون کا فوارا بہہ نکلا۔ ڈنڈا پڑنے کی وجہ سے

سے بچتا ہوا بلڈنگ کے اندر داخل ہوا تو۔۔۔ تو پارکنگ
میں مجھے اپنے گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں گاڑی کے
پاس جا کر رک گیا۔

”گاڑی یہاں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ
میں۔۔۔ میں شہنائی کا فون سننے کے بعد اپنے
اپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا۔۔۔“ میں اپنی گاڑی کے پاس کھڑا
سوچ رہا تھا اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب
شہنائی نے مجھے فون کیا تھا تو میں عجلت میں شوروم سے
نکلا اور تیز رفتاری کے ساتھ یہاں تک پہنچا پھر۔۔۔ پھر
کیا ہوا۔۔۔ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔۔۔ میں
یہاں سے شادمان روڈ کیسے پہنچ گیا
اور پھر۔۔۔ پھر میری کھوپڑی کہاں گئی۔

میں سوچوں میں گم تھا کہ اچانک۔۔۔ اچانک
میرے ذہن میں روشنی کا تیز جھماکا ہوا اور۔۔۔ اور
میری آنکھوں کے سامنے پچھلے واقعات آنے لگے۔
میرے دماغ کے اسکرین پر پچھلے واقعات کسی قلم کی
طرح چل رہے تھے۔۔۔ جب شہنائی کا فون میرے
شوروم پر آیا تو۔۔۔ تو میں فوراً اپنے گھر کی جانب
بھاگا۔ میں نہایت عجلت میں شوروم سے نکلا اور اپنی
گاڑی میں سوار ہو کر تیز رفتاری کے ساتھ اپنے گھر کی
جانب روانہ ہوا۔ میرے ذہن میں شہنائی کا فون گونج
رہا تھا۔

”یا سر۔۔۔ یا سر۔۔۔ تم۔۔۔ تم جلدی سے گھر
پہنچو۔۔۔“

”کیا ہوا شہنائی۔۔۔ خیریت ہے نا۔۔۔“
”یا سر میں نے اس دشمن ملک کے جاسوس کے
بارے میں انتہائی اہم ثبوت حاصل کر لیا ہے۔ مگر
اب مجھے وہمکیاں مل رہی ہیں مجھے لگتا ہے کہ۔۔۔ کہ
میرے پیچھے اجرتی قاتل لگا دیا گیا ہے۔۔۔ پلیز یا سر
جلدی سے گھر پہنچو مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ شہنا
ئی نے جلدی جلدی کہا۔

”میں۔۔۔ میں ابھی پہنچتا ہوں۔۔۔ تم۔۔۔ تم
اپنا خیال رکھنا اور اپارٹمنٹ کے سامنے دروازے اور
کھڑکیاں اندر سے بند کر لینا۔۔۔ بس میں پہنچ رہا
ہوں۔۔۔“

کوشش کی تھی۔ میں نے انسپکٹر خان کی بات کاٹ کر جواب دیا۔

”یا سر۔۔۔ قاتل نے تم پر بھی حملہ کیا۔۔۔“
ڈاکٹر احمد جلدی سے میرے پاس آئے ڈاکٹر احمد سے میرے دوستانہ تعلقات تھے اس لیے وہ مجھ پر حملے کا سن کر بے چین ہو گئے۔

”ہاں اس نے مجھے بھی مارنے کی کوشش کی۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔“ میں نے جواب دے کر اپنے سر سے ٹوپی اتاری میرا بغیر کھوپڑی کا سر دیکھ کر وہاں موجود پولیس والوں کی چیخیں نکل گئیں۔

”یا سر۔۔۔ یا سر تم۔۔۔ تم بہت زیادہ زخمی ہو۔۔۔“ ڈاکٹر احمد بے چین ہو کر میرے برابر بیٹھ گیا اور میرے سر کا معائنہ کرنے لگا۔

”یا سر۔۔۔ یا سر تم آرام سے لیٹ جاؤ۔۔۔ پلیز کوئی حرکت مت کرو۔۔۔ میں ایسولینس کو فون کرتا ہوں۔۔۔“ ڈاکٹر احمد نے مجھے صوفے پر لٹاتے ہوئے کہا۔

”تم اپنی بیوی کے قتل کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو۔۔۔“ انسپکٹر خان نے مجھ سے سوال کیا۔

”پلیز انسپکٹر۔۔۔ اس سے کوئی سوال نہیں کرو۔۔۔ یا سر کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ وہ کسی سوال کا جواب دے سکے۔۔۔“ ڈاکٹر احمد نے انسپکٹر خان سے کہا۔

”ظہرو۔۔۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔۔۔ میں نے ڈاکٹر احمد سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

”پلیز یا سر زیادہ باتیں مت کرو تم بہت زخمی ہو۔۔۔ میں۔۔۔ میں ایسولینس کو فون کرتا ہوں۔۔۔“ ڈاکٹر احمد نے مجھ سے کہا اور ایسولینس کے لیے فون کرنے لگے۔

”مجھے اندازہ ہے کہ میں کتنا زخمی ہوں۔۔۔ بس چند سانس ہیں جو ایک بار یک دور سے بندھی ہیں۔۔۔ نہ جانے یہ دور کب ٹوٹ جائے۔۔۔ مجھے سب کچھ بتانے دو۔۔۔“ میں نے ڈاکٹر احمد سے التجا کی تو

اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

میرے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی فوراً ہی میرے سر پر ڈنڈے کا ایک اور وار ہوا اور مجھے اپنی کھوپڑی چھتی ہوئی۔ محسوس ہوئی درد کی شدت اتنی تھی کہ میں برداشت نہیں کر پا رہا تھا اسی وقت ایک بار پھر ڈنڈا میرے سر پر پڑا اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

یہ سب یاد آتے ہی میں تیزی کے ساتھ لفٹ کی جانب لپکا لفٹ خالی تھی میں نے سیونٹھ فلور کا بشن دیا۔ لفٹ نے سیکنڈوں میں مجھے سیونٹھ فلور پر پہنچا دیا۔ میں لفٹ سے نکلے ہی تیزی کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ کی جانب بڑھا مگر پھر مجھے ٹھنک کر رکنا پڑا میرے اپارٹمنٹ کے سامنے کئی پولیس والے کھڑے تھے۔ میں بوکھلا گیا اور تیزی کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے لگا۔

”اے کون ہو تم۔۔۔ کہاں جا رہے ہو۔۔۔؟“ ایک سپاہی نے مجھے روکنا چاہا۔

”میں۔۔۔ میں یا سر جواب دو۔۔۔ اور یہ میرا فلیٹ ہے۔۔۔“ میں نے جواب دیا اور فلیٹ میں داخل ہو گیا اندر علاقے کے ایس ایچ او انسپکٹر خان اور پولیس سرجن ڈاکٹر احمد کے ساتھ کئی اور پولیس والے کھڑے تھے۔ میں نے فلیٹ میں داخل ہو کر نظریں دوڑائی مجھے شہنائی کی لاش نظر نہیں آئی۔ شاید پولیس والے شہنائی کے لاش لے جا چکے تھے کمرے میں ابھی تک شہنائی کا خون پڑا ہوا تھا جواب جم کر سپاہ پڑ رہا تھا۔

”مسٹر یا سر۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کہاں تھے؟“ انسپکٹر خان نے مجھے سنبھالتے ہوئے پوچھا کیونکہ مجھے شدید چکر آنے لگے تھے۔

”پتا نہیں۔۔۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔“ میرے منہ سے بے ترتیب الفاظ نکل رہے تھے مجھے چکراتا دیکھ کر انسپکٹر خان نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور ڈاکٹر احمد نے مجھے ایک گلاس پانی لا کر دیا میں نے کھٹاکٹ پانی پی لیا۔

”مسٹر یا سر آپ کی وائف کو۔۔۔“ انسپکٹر خان نے کہنا چاہا۔

”ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ شہنائی کو قتل کر دیا گیا ہے۔۔۔ اور اس قاتل نے مجھے بھی قتل کرنے کی

ہوئے پوچھا۔

”اس وقت۔۔۔ جب اس نے میرے سر پر دار کیا تھا تو اس وقت میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا مگر۔۔۔“ میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”مگر۔۔۔ کیا“ انسپکٹر خان اور ڈاکٹر احمد کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”جب میں زخمی حالت میں شادمان روڈ پر پھر رہا تھا تو مجھے ایک غنڈہ ملا۔۔۔ جو مجھے دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے قبول کیا کہ اس نے میرے سر پر دار کر کے مجھے مارا تھا۔۔۔ وہ مجھے مردہ کہہ رہا تھا۔۔۔“ میں نے آہستہ آہستہ کر کے پوری داستان ڈاکٹر احمد اور انسپکٹر خان کو سنا دی۔

”اوہ یہ تو بہت اہم بات ہے۔۔۔ تم قاتل کو پہچان سکتے ہو۔۔۔“ انسپکٹر خان نے پوچھا۔

”سو فیصد۔۔۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔۔۔“ میں جواب دیا۔

”اگر وہ قاتل پکڑا گیا تو اس کے ذریعے ہم اس ملک دشمن جاسوس تک پہنچ سکتے ہیں جو ہمارے پیارے وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے“ انسپکٹر خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگوں نے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی۔۔۔ شاید شہنائی نے قاتل یہیں کہیں چھپائی ہو۔۔۔“ میں نے انسپکٹر خان سے پوچھا۔

”ہم نے پورا اپارٹمنٹ چھان مارا۔۔۔ ہنس کوئی قاتل نہیں ملی۔۔۔“ انسپکٹر خان نے جواب دیا۔

”میں دیکھتا ہوں۔۔۔ شاید وہ قاتل مجھے مل جائے۔۔۔ وہ کالے رنگ کی فائل ہے جس میں شہنائی نے اس جاسوس کے خلاف سارے ثبوت اکٹھا کئے ہیں۔۔۔“ میں صوفے سے اٹھتا ہوا بولا مگر ڈاکٹر احمد نے کندھے سے پکڑ کر مجھے دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا۔

”یاسر۔۔۔ تم بہت زخمی ہو زیادہ اہل جل مت کرو۔۔۔“

”مم۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔“ میں نے ٹوپی اپنے سر پر اچھاڑتے ہوئے ڈاکٹر احمد کو جواب دیا۔

اسی وقت اپارٹمنٹ کے کھلے دروازے سے دو

”دونوں سے شہنائی ایک خاص کیس پر کام کر رہی تھی حکومت کا اعلیٰ عہدیدار جو کہ اصل میں دشمن ملک کا جاسوس تھا شہنائی نے اس کے خلاف کافی ثبوت حاصل کر لیے تھے۔۔۔“ میں نے کہنا شروع کیا انسپکٹر خان اور ڈاکٹر احمد دونوں بغور مجھے سن رہے تھے۔

”اس عہدیدار کا نام کیا ہے۔۔۔“ انسپکٹر خان نے مجھ سے سوال کیا۔

”شہنائی نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔۔۔“ میں نے جواب دیا اور پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد گویا ہوا۔

”آج شام پانچ بجے شہنائی کا فون میرے شوروم پر آیا وہ۔۔۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے اس دشمن ملک کے جاسوس کے خلاف کافی ثبوت حاصل کر لیے ہیں مگر اس جاسوس کو بھی شہنائی کے متعلق پتا لگ گیا ہے لہذا اس نے کرائے کا قاتل شہنائی کے پیچھے لگا دیا ہے۔ پانچ بجے شہنائی نے مجھے فون کر کے بتایا کہ وہ کرائے کا قاتل اس بلڈنگ تک پہنچ گیا ہے۔ شہنائی بہت گھبرائی ہوئی تھی اس نے مجھ سے فوراً گھر پہنچنے کا کہا۔ میں نے شہنائی کو تسلی دی اور شوروم سے نکل بیباں کے لیے روانہ ہوا۔ جب میں یہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ شہنائی اس صوفے کے پیچھے اونڈھٹے منہ پڑی ہے اور اس کی پیٹھ میں ایک بڑا سا خنجر دسے تک گھسا ہوا ہے۔ میں نے شہنائی کو سیدھا کیا وہ اس وقت زندہ تھی وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر۔۔۔ مگر چھپے ہوئے قاتل نے کسی بھاری چیز سے میرے سر پر دار کیا اور۔۔۔ اور میں بے ہوش ہو گیا۔۔۔۔۔۔ بس اس سے آگے مجھے کچھ یاد نہیں۔۔۔ جب مجھے ہوش آیا تو۔۔۔ تو میں شادمان روڈ پر تھا اور زخمی حالت میں پھر رہا تھا۔۔۔ بے ہوش ہونے کے بعد میں کیسے ہوش میں آیا اور شادمان روڈ تک کیسے پہنچا۔۔۔ مجھے یاد نہیں۔۔۔“ میں نے بے بسی کے ساتھ ساری داستان سنا ڈالی۔

”اس کا مطلب ہے تم نے قاتل کا چہرہ نہیں دیکھا۔۔۔“ انسپکٹر خان نے مایوسی کے ساتھ سر ہلاتے

دھڑک رہا۔۔۔ کیا ایسے انسان کو تم زندہ کہہ سکتے ہو۔۔۔ میں نے ڈاکٹر احمد سے پھر سوال کیا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو احمد۔۔۔ نہ میرا دل دھڑک رہا ہے اور نہ ہی میری نبض چل رہی ہے۔۔۔ پھر بھی میں زندہ ہوں کیوں۔۔۔ قدرت نے مجھے اس حالت میں کیوں زندہ رکھا ہوا ہے۔۔۔" میں نے ڈاکٹر احمد سے پھر سوال کیا۔

"میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔۔۔ یہ صحیح ہے کہ نہ تمہاری نبض چل رہی ہے اور نہ ہی تمہارا دل دھڑک رہا ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر تم زندہ ہو۔۔۔" ڈاکٹر احمد نے جواب دیا۔

"سو چو احمد۔۔۔ خدا نے مجھے اس حالت میں کیوں زندہ رکھا ہے۔۔۔ پھر شہنائی کے قاتل نے میرے سر پر ساڑھے پانچ بجے مار کیا تھا اور مجھے جب ہوش آیا تو رات کے دس بج رہے تھے اور میں شادمان روؤں لگا رہا تھا۔ آخر اس ساڑھے چار گھنٹے میں کہاں رہا۔۔۔ یقیناً خدا نے مجھے دوبارہ اس دنیا میں صرف شہنائی کے قاتلوں سے انتقام لینے کے لیے بھیجا ہے۔۔۔ پلیز احمد۔۔۔" میں نے ڈاکٹر احمد سے التجا کی۔

"یہ بد لے اور انتقام کی باتیں چھوڑو اور آرام سے لیٹ جاؤ۔۔۔"

"نہیں احمد میں ضرور جاؤں گا۔۔۔" میں اسٹریچر سے اٹھتا ہوا بولا تو احمد نے سختی سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور مجھے زبردستی اسٹریچر پر لیٹا دیا۔

"تم آرام سے لیٹے رہو۔۔۔ ہسپتال آنے والا ہے۔۔۔" ڈاکٹر احمد نے میرے کندھوں پر دوبارہ بڑھاتے ہوئے کہا تو میں اسٹریچر پر لیٹ گیا اور میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا میرے ہاتھ اسٹریچر سے نیچے لٹک گئے اسٹریچر سے نیچے ایسبولینس کے فرش پر میرا ہاتھ کسی نوکیلی چیز سے ٹکرایا تو میں نے اس چیز کو اپنی گرفت میں لے لیا وہ نوکیلی چیز ایک میڈیکل نشتر تھا جس سے ڈاکٹر آپریشن کے وقت انسانی جسم کو کاٹتے ہیں۔ نشتر کو گرفت میں لیتے ہی میں جھٹکے سے اسٹریچر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور میں نے ڈاکٹر احمد کی گردن

آدی اندر داخل ہوئے دونوں نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور انھوں نے اپنے ہاتھوں میں اسٹریچر اٹھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر احمد نے اسٹریچر میرے قریب رکھوایا اور مجھے اس اسٹریچر پر لٹا دیا۔ میرے لیٹتے ہی ان دونوں آدمیوں نے اسٹریچر اٹھایا اور باہر کی جانب چل دیے۔ میرے اسٹریچر کے ساتھ ڈاکٹر احمد بھی چل رہے تھے۔ بلڈنگ سے باہر آ کر ان دونوں آدمیوں نے میرا اسٹریچر ایسبولینس میں رکھا ڈاکٹر احمد میرے اسٹریچر کے برابر بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایسبولینس ڈرائیور نے ایسبولینس چلا دی۔

ڈاکٹر احمد میرے اسٹریچر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پہلے میری نبض دیکھنے کی کوشش کی پھر اسٹھٹسکوٹ اپنے کانوں سے لگا کر میرے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرنے لگا۔

"احمد بے کاری کی کوششیں مت کرو۔۔۔ نہ میری نبض چل رہی ہے اور نہ ہی میرا دل دھڑک رہا ہے۔۔۔ سائنسی طور پر میں مر چکا ہوں" میں نے اسٹریچر پر بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر احمد سے کہا تو وہ مجھے عجیب سے نظروں سے دیکھنے لگا۔

"احمد تم میرے دوست ہو۔۔۔ پلیز میری بات سمجھو۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔" میں نے ڈاکٹر احمد سے کہا۔

"کہاں جاؤ گے تم؟" ڈاکٹر احمد نے پوچھا۔ "شہنائی کے قاتل نے مجھے دوسرے قتل کرنے کی کوششیں کیں اور میں اس کو اچھی طرح پہچان گیا ہوں۔۔۔ یقیناً یہ بات اس قاتل کو کھٹک رہی ہوگی۔ وہ مجھے ایک بار پھر قتل کرنے کی کوشش کرے گا شاید اس طرح وہ قاتل پکڑا جائے۔۔۔" میں نے تفصیل سے ڈاکٹر احمد سے کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو۔۔۔ اس طرح تو تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔۔۔" میری بات سن کر ڈاکٹر احمد بھڑک اٹھا۔

"کیا میں زندہ ہوں؟" میں نے ڈاکٹر احمد سے سوال کیا تو وہ نے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ "میری نبض نہیں چل رہی۔۔۔ میرا دل نہیں

”شادمان روڈ اتنا بڑا ہے۔۔۔ میں اس قاتل کو کہاں ڈھونڈوں۔۔۔“ شادمان روڈ پہنچ کر میں نے سوچا۔

”قاتل کو اس جگہ پر ڈھونڈنا چاہیے جہاں پر وہ کچھ دیر قبل بھاگتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔۔۔“ میرے ذہن میں سوچ ابھری۔

یہ سوچتے ہی میں اس جگہ کی جانب چل دیا جہاں کچھ دیر قبل میں نے قاتل کو کھودیا تھا اس جگہ پہنچ کر میں نے چاروں طرف بغور نظریں دوڑائیں تو کچھ قاصدے پر مجھے ایک عمارت کے کھنڈرات نظر آئے۔ کافی عرصہ پہلے اس عمارت میں آگ لگ گئی تھی جب سے یہ عمارت اسی طرح ادھ جلی حالت میں کھڑی ہے۔ میں آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے اس عمارت کے قریب پہنچا۔ جب میں اس عمارت کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس عمارت کی جلی ہوئی دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی سیاہ رنگ کی کار کھڑی ہے۔

”اتنی رات گئے اس جلی ہوئی عمارت میں کون ہے اور کیا کر رہا ہے۔۔۔“ سیاہ کار دیکھ کر مجس نے میرے اندر سر ابھارا۔

میں نے عمارت کی چھوٹی سے باؤندری وال پھانگی اور عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ عمارت کے اندر داخل ہو کر میں نہایت احتیاط کے ساتھ آواز کئے بغیر آگے بڑھنے لگا۔

عمارت کے اندر ایک کمرے میں مجھے ہلکی سے روشنی نظر آئی جیسے کوئی ایمر جیسی لائٹ جل رہی ہو۔ میں احتیاط کے ساتھ اس کمرے کی جانب بڑھا میں حتی الامکان کوشش کر رہا تھی کہ میرے چلنے سے آواز نہ ہو۔ عمارت مکمل طور پر سنسان تھی سوائے اس ایک کمرے کے عمارت میں مکمل اندھیرا تھا۔ اس عمارت کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں مشہور تھیں لہذا کوئی اس عمارت کی جانب رخ نہیں کرتا تھا عمارت کی حالت بھی بہت بری تھی۔ جگہ جگہ سے دیواریں گر گئی ہوئی تھیں پلاسٹر آف سٹون ہوا تھا آگ اور دھوئیں سے عمارت مکمل طور پر سیاہ ہو چکی تھی۔ عمارت میں جگہ

پر نشتر رکھ دیا۔“ ایسبولینس روکوورنہ میں ڈاکٹر کی گردن کاٹ دوں گا۔“ میں نے خوفناک لہجے میں ایسبولینس ڈرائیور کو مخاطب کیا تو اس نے ایسبولینس کے بریک پر پیر رکھ دیئے۔ ایسبولینس آہستہ ہو کر سڑک کنارے رک گئی۔ ڈاکٹر احمد حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”موری احمد۔۔۔ معاف کرنا میں مجبور ہوں۔۔۔“ میں نے ڈاکٹر احمد سے کہا اور ایسبولینس کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

”یاسر۔۔۔ یا سرتم غلطی کر رہے ہو۔۔۔“ ڈاکٹر احمد نے مجھ سے کہا۔

”میں کوئی غلطی نہیں کر رہا ہوں۔۔۔ اور کوئی میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرے۔۔۔“ میں نے نشتر لہراتے ہوئے کہا اور سڑک کے ساتھ اپنی گلیوں میں بھاگ کھڑا ہوا۔

ایسبولینس سے دور ہونے کے بعد میں دوبارہ سڑک پر آ گیا۔

”مجھے شادمان روڈ چلنا چاہیے۔۔۔ مجھے شہنائی کا قاتل وہیں ملے گا۔“ میں نے سوچا اور شادمان روڈ کی جانب قدم بڑھا دیئے میں تیز تیز قدموں سے شادمان روڈ کی جانب روانہ ہوا تھا۔ تیز چلنے کی وجہ سے میرے سر میں درد کی بیسیں اٹھ رہی تھیں مگر میں نے پروا نہ کی۔ مجھ پر جنون سا طاری ہو رہا تھا میں جلد از جلد شہنائی کے قاتل تک پہنچنا چاہتا تھا میری کوشش تھی کہ میں لوگوں کی نظروں سے بچتا رہوں دیسے بھی رات کے بارہ بج چکے تھے سردی اپنی عروج پر تھی اس لیے سڑک زیادہ تر سنسان و ویران تھی کبھی کبھی ایک آدھ آدی آتا جاتا نظر آ رہا تھا۔

”اے خدا۔۔۔ اے میرے مالک۔۔۔ تو نے مجھے ابھی تک زندہ رکھا ہے تو میرے معبود۔۔۔ مجھے اس قاتل تک بھی پہنچا دے۔۔۔“ چلتے چلتے میں نے ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگی۔

تھوڑی دیر پہنچنے کے بعد میں شادمان روڈ پہنچ گیا۔

جگہ چمکا دریں الٹی لٹکی نظر آ رہی تھیں چمکا دروں کی سرخ آنکھیں ماحول کے دراؤنے پن میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔

میں احتیاط کے ساتھ بے آواز چلتا ہوا اس کمرے کے دروازے تک پہنچا جہاں سے روشنی باہر نکل رہی تھی مجھے کمرے سے باہر کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں میں دروازے کی آڑ میں چھپ گیا اور کمرے سے آئی والی آوازوں پر کان لگا دیئے۔

”وہ۔۔۔ وہ زندہ ہے اور۔۔۔ مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔“ مجھے اسی غنڈے کی آواز سنائی دی جو مجھے چائے کے ہوٹل میں ملا تھا شاید کمرے میں کوئی اور بھی تھا جس سے وہ غنڈہ مخاطب تھا۔

غنڈے کی آواز سن کر میری آنکھیں تشکر سے بھٹ گئیں۔ خدا نے میری دعا سن لی اور مجھے شہنائی کے قائل تک پہنچا دیا ورنہ۔۔۔ اس بڑے سے شہر میں کسی کو تلاش کرنا مجھ سے میں سے سوئی ڈھونڈنے کے برابر ہے۔

میں نے اپنے کان اندر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔۔۔ تم نے ہی مجھے فون کر کے کہا تھا کہ تم نے دونوں میاں بیوی کو مار دیا ہیں۔۔۔ پھر۔۔۔“ مجھے ایک بھاری سی آواز اور سنائی دی

”یہ آواز۔۔۔ یہ آواز تو میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔۔۔“ بھاری آواز سن کر میں سوچ میں پڑ گیا ”اس آواز کو میں نے کہاں سنا ہے۔“

”ہاں وہ مر چکا تھا۔۔۔ میں نے خود اس کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی تھی۔۔۔ میری ضرب سے اس کی کھوپڑی ٹوٹ کر اس کے جسم سے علیحدہ ہو گئی تھی اس کا پلپلا مغز اس کے سر سے باہر نکل گیا تھا مگر۔۔۔ مگر اب وہ اسی ٹوٹی کھوپڑی کے ساتھ مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔“ غنڈے کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔

”وہم کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔ کوئی شخص مرنے کے بعد زندہ نہیں ہوتا۔“ بھاری سے آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

یہ آواز۔۔۔ یہ آواز۔۔۔ یاد آ گیا مجھے یاد آ گیا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو سردار ریاض کی آواز ہے۔ وہ میرے خدا۔۔۔ تو۔۔۔ تو دشمن ملک کا جاسوس۔۔۔ یہ ہے۔ اتنی اہم پوسٹ پر بیٹھا ہوا یہ شخص دشمن ملک کا جاسوس ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اس نے میری شہنائی کو مروایا ہے۔“ غصے سے میری مٹھیاں بھینچ گئیں۔

”قائل کہاں ہے۔۔۔؟“ سردار ریاض کی آواز پھر ابھری میں نے دروازے کی درز سے کمرے میں جھانکا اندر وہ غنڈہ اور سردار ریاض ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے

”یہ رہی قائل۔۔۔ مگر سر میرا کیا ہوگا؟“ غنڈے نے ایک سیاہ رنگ کی قائل سردار ریاض کو دی یہ وہی قائل تھی جس میں شہنائی نے سردار ریاض کے خلاف سارے ثبوت جمع کئے تھے۔ سردار ریاض قائل کھول کر دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔“ سردار ریاض نے قائل بند کی اور ایک لفافہ اس غنڈے کی جانب بڑھایا۔

”یہ لو۔۔۔ اس لفافے میں رقم ہے اور تمہارا پاسپورٹ اور ہنگامہ کار کا ٹکٹ بھی ہے۔ تمہاری صبح کی فلائیٹ ہے۔۔۔ تم ہنگامہ کار چلے جانا اور جب تک یہ معاملہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا وہیں رہنا۔“ غنڈے نے سردار ریاض سے لفافہ لیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا میں دروازے کی جھری سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اب معاملہ میری برواشت سے باہر ہو رہا تھا۔ میں نے ایک زوردار ٹھوکر دروازے کو ماری اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

”تم ہو وہ زہریلے ناگ۔۔۔ جس نے میری شہنائی کو قتل کروایا۔“ میں نے زہر قند لہجے میں سردار ریاض کو مخاطب کیا مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر سردار ریاض بری طرح بوکھلا گیا۔

”یہ۔۔۔ یہ دیکھیے سر۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ زندہ ہے۔“ غنڈہ مجھے دیکھتے ہی سردار ریاض سے بولا اس کے آواز میں کپکپاہٹ نمایاں تھی پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ کمرے کے کونے میں اچھالا اور اپنی پاس پڑی ایک نوکیلی علاج ڈال کر جنوبی انداز میں مجھ

پرحملہ آور ہوا میں نے جھپکائی وہ کراہیں غنڈے پروار
خالی کیا اس طرح جھکان دیکھتے میرے سر پر رکھی
ٹوپی گر گئی اور میرا بغیر کھوپڑی کا سرعریاں ہو گیا۔
”دیکھ۔۔۔ سر اس کی کھوپڑی غائب ہے۔۔۔“

غنڈہ میری جانب اشارہ کر کے سردار ریاض سے بولا
سردار ریاض کھوپڑی کے بغیر میرے سر سے جھانکنا
میرا دماغ دیکھ کر سکتے کی کیفیت میں آگیا غنڈے نے
ایک بار پھر سلاخ سنبھالی اور مجھ پر حملہ کرنا چاہا مگر میں
نے آگے بڑھ کر سلاخ کا دوسرا سرا پکڑ لیا غنڈہ مجھ
سے سلاخ چھیننے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ جانے مجھ
میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ وہ غنڈہ مجھ سے
سلاخ نہ چھین سکا۔ میں نے سلاخ کو ہلکا سا جھٹکا دیا تو
اس غنڈے کے ہاتھ سے سلاخ نکل گئی اور وہ وور جا
گرا۔ گرتے ہی اس غنڈے نے پینتر ابدلا اور کسی
اڑیل بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا میری جانب بڑھا میں
نے اپنے ہاتھ میں پکڑی سلاخ سیدھی کر دی سلاخ
سیدھے غنڈے کے سینے میں گھس گئی اور وہ ایک
بھیا تک چیخ مار کر الٹ گیا اور کمرے کے فرش پر گر کر
تڑپنے لگا۔ غنڈے کے سینے سے گاڑھا گاڑھا سرخ
لبو نکل کر کمرے میں پھیلنے لگا۔ تھوڑی دیر تڑپنے کے
بعد غنڈہ ٹھنڈا ہو گیا۔ غنڈے کے مرتے ہی میں سردار
ریاض کی جانب مڑا۔ سردار ریاض کمرے کے ایک
کونے میں ساکت کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

”تو وہ تم ہو جو میرے پیارے وطن کی جڑوں کو
کاٹ رہے ہو اور تم نے میری شہنائی کو بھی مروایا
ہے۔۔۔“ میں نے سردار ریاض کو مخاطب کر کے
زہریلے لہجے میں کہا تو سردار ریاض چونک پڑا۔
میں سردار ریاض کی جانب بڑھا تو سردار ریاض
نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سیاہ ریوالور نکال
کر مجھ پر تان لیا۔
”میری قریب مت آنا ورنہ۔۔۔ ورنہ میں گولی
مار دوں گا۔“ سردار ریاض کی آواز کپکپا رہی تھی۔
”ہا ہا ہا۔۔۔“ میں نے ایک قبضہ لگایا۔۔۔ ”اس
کھلونے سے وہ ڈرتے ہے جو زندہ ہوں۔۔۔ میں تو
ایک مردہ ہوں۔۔۔“

”میں موت کا فرشتہ ہوں اور اپنی بیوی کا انتقام
لینے آیا ہوں۔۔۔ تم اپنی خواہش پوری کر لو۔۔۔ چلاؤ
گولی۔۔۔“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے سردار ریاض
سے کہا تو۔۔۔ تو سردار ریاض نے خوف سے کانپتے
ہوئے گولی چلا دی۔
گولی چلنے کا زور کا دھماکا ہوا اور گولی سیدھی
میرے سینے میں گھس گئی مگر۔۔۔ مگر مجھے اس گولی سے
کوئی تکلیف نہیں ہوئی بس ایسا لگا جیسے کوئی سوئی چھبی
ہو۔۔۔ میرے بڑھتے جسم کو ایک جھٹکا لگا
اور بس۔۔۔ میں نے اپنے سینے کی جانب دیکھا۔ جہاں
گولی لگی تھی۔ وہاں ایک سوراخ ہو گیا تھا۔ اور اس
سوراخ سے سیاہ مادہ نکل رہا تھا میں نے اپنی انگلی اس
سوراخ میں ڈالی اور اسے کھسکایا تو میری انگلی سیاہ
نارے سے بھر گئی میں نے اپنی انگلی اپنے کپڑوں سے
صاف کی اور سردار ریاض کی جانب بڑھا جو انتہائی
خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ خوف کے مارے
اس کی آنکھیں اس کے حلقوں سے باہر نکل رہی
تھیں۔ اس کے پیر کا مپ رہے تھے اس کا چہرہ خوف
سے سفید پڑ چکا تھا۔ وہ دیوار کے سارے کھڑا مجھے
تک رہا تھا میں نے آگے بڑھ کر سردار ریاض کی گردن
پکڑ لی سردار ریاض میرے ہاتھوں میں بنا پانی کی پھلی
کی طرح تڑپنے لگا میں اپنا دوسرا ہاتھ بڑھا کر سردار
ریاض کے ہاتھ سے وہ سیاہ فائل چھین لی جس کی وجہ
سے میری شہنائی کی جان گئی تھی۔ جس میں سردار
ریاض کے جاسوس ہونے کے تمام ثبوت موجود تھے
فائل کو دیکھ کر مجھے ایک دم غصہ چڑھ گیا اور میں نے
سردار ریاض کے گلے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا
سردار ریاض بری طرح تڑپ رہا تھا اس کے منہ سے
بھیا تک چیخیں نکل رہی تھیں میں نے اپنا انگوٹھا سردار
ریاض کے زخروں پر رکھا اور اپنی پوری قوت سے دبایا
تو میرا انگوٹھا سردار ریاض کے زخروں کو پھاڑتا ہوا اندر
گھس گیا۔ سردار ریاض کے حلق سے خون کا فوارا بہہ

جڑی رہے جو دراصل دشمن ملک کا جاسوس تھا۔ سردار ریاض نے خلاف سارے ثبوت اس فائل میں موجود ہیں سردار ریاض ہی نے کرائے کے قاتل کے ذریعے شہنائی کو مردایا تھا۔۔۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی فائل ڈاکٹر احمد کو دے دی۔

ڈاکٹر احمد نے فائل میرے ہاتھ سے لی اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔

”اوہ مائی گاڈ۔۔۔ اس میں تو اور بھی لوگوں کے نام ہیں جو ہمارے دشمن ملک کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں۔۔۔ ڈاکٹر احمد فائل پڑھتے ہوئے بولا۔

”میں آئی جی کو فون کرتا ہوں۔۔۔ اتنا کہہ کر ڈاکٹر احمد نے اپنا موبائل نکالا اور آئی جی کو فون کرنے لگا۔

مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں ایسبولینس کا سہارا لے کر سڑک پر بیٹھ گیا فون سے فارغ ہو کر ڈاکٹر احمد میرے پاس آیا اور مجھے سہارا دے کر کھڑا کیا اور ایسبولینس کا دروازہ کھول کر مجھے اسٹریچر پر لٹایا اور آکسیجن کا ٹاسک میرے منہ پر لگایا پھر ایسبولینس کے ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہا۔

”یاسر کو فوراً ہسپتال لے جاؤ اور وہاں ڈاکٹر شائستہ سے کہنا کہ یاسر کو فوری ٹریسٹ دے۔۔۔“ اتنا کہہ کر ڈاکٹر احمد میری جانب مڑا اور کہنے لگا۔

”آئی جی اور پولیس کے دیگر حکام خود یہاں آرہے ہیں۔۔۔ مجھے ان کا انتظار کرنا پڑے گا لہذا تم ہسپتال جاؤ۔“ ڈاکٹر احمد کی بات سن کر میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر احمد کے ایسبولینس سے اترتے ہی ایسبولینس ڈرائیور نے ایسبولینس آگے بڑھادی مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب رہا تھا میں نے آنکھیں بند کر لیں تھوڑی ہی دیر میں، میں دنیا دافنیہا سے بے خبر ہو گیا میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

”ویل ڈن۔۔۔ مسٹر یاسر نے تو بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔۔۔“ آئی جی فائل پڑھتے ہوئے بولے

”سراسر فائل کے لیے یاسر کے وائف مشہور صحافی شہنشاہ یاسر کا قتل ہوا اور خود یاسر شدید زخمی

نکلا میں نے سردار ریاض کی جھوٹا دیا۔ سردار ریاض کمرے کے فرش پر گر کر مر رہے تھے لگا اور کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد اس نے اپنی جان دے دی۔ کمرے کے فرش پر سردار ریاض لاش کی صورت میں پڑا تھا۔ میں نے سردار ریاض کے لاش پر نفرت سے تھوک دیا۔

یہ وہ ظالم تھا جس نے صرف میرے ملک سے غداری کی بلکہ میری شہنائی کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ مجھے سردار ریاض کے چہرے سے گھن آرہی تھی میں نے نفرت سے سردار ریاض کی لاش کو دیکھا اور اپنا دایاں پیراٹھا کر زور سے سردار ریاض کے چہرے پر مارا تو سردار ریاض کا منہ ٹیزھا ہو گیا۔

سردار ریاض کے مرنے کے بعد میں فائل لے کر اس جلی ہوئی عمارت سے باہر آیا اور سڑک کے کنارے کنارے چلتے لگا اچانک میرے پیچھے کسی گاڑی نے زوردار بریک لگائے۔ بریک لگانے کی بھینک آواز فضا میں پھیلی تو میں اچھل پڑا اور فوراً ایک سائیڈ میں ہو گیا پھر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرے پیچھے ایک ایسبولینس کھڑی تھی اور اس ایسبولینس میں سے ڈاکٹر احمد باہر نکلا اور میرے پاس آیا۔

”مجھے معاف کرنا احمد میں نے تمہاری ساتھ ناروا سلوک کیا۔“ ڈاکٹر احمد جب میرے قریب آیا تو میں نے اس سے گزشتہ واقعے کی معافی مانگی۔ جب میں نے ایسبولینس سے فرار ہوتے وقت ڈاکٹر احمد کی گردن پر نشتر رکھا تھا۔

”کوئی بات نہیں یاسر۔۔۔ تم نے جو کیا وہ حالات کی مجبوری تھی۔۔۔ مگر اب تمہیں فوراً ہسپتال چلنا چاہیے۔“ ڈاکٹر احمد نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”ضرور۔۔۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔۔۔ میں نے اپنی شہنائی کا بدلہ لے لیا۔“

”کیا۔۔۔ کیا تم نے شہنشاہ کے قاتلوں کو مار ڈالا۔“ ڈاکٹر احمد نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ اس کی لاش اس جلی ہوئی عمارت کے کھنڈر میں پڑی ہے اور ساتھ ہی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار سردار ریاض کی لاش بھی اس کھنڈر میں

ہے۔ ڈاکٹر احمد نے آئی جی کو بتایا۔
 ہوں۔ آئی جی نے ہکا بکا اظہار میں نے
 اعلیٰ حکام کو فون پر تفصیل بتا دی ہے جن لوگوں کا نام
 اس فائل میں ہے بس کچھ ہی دیر میں وہ سب گرفتار ہو
 جائیں گے۔ آئی جی بولے۔

”سر۔۔۔ شہنشاہ اور یاسر کی قربانی ضائع نہیں جانی
 چاہیے۔ ڈاکٹر احمد نے آئی جی سے کہا۔

”قطعی نہیں۔۔۔ میں نے اس فائل کی بابت
 آری کو بھی مطلع کر دیا ہے۔ وہ لوگ بھی پہنچنے والے
 ہیں۔ آئی جی نے جواب دیا۔

”یاسر خود کہاں ہے۔۔۔؟“ اتنی دیر سے خاموش

انسپیکٹر خان نے ڈاکٹر احمد سے پوچھا
 ”یاسر کی حالت بہت خراب تھی لہذا میں نے
 اسے ہسپتال روانہ کر دیا۔“ ڈاکٹر احمد نے جواب دیا
 کچھ ہی دیر میں وہاں پولیس اور آری کے اعلیٰ
 افسران پہنچ گئے۔ فائل کو محفوظ ہاتھوں میں دیکھ کر ڈاکٹر
 احمد اور انسپیکٹر خان ہسپتال کی جانب چل دیے۔

”ڈاکٹر شائستہ۔۔۔ ہسپتال کے کوریڈور میں
 ڈاکٹر احمد نے ڈاکٹر شائستہ کو پکارا ڈاکٹر احمد کے ساتھ
 انسپیکٹر خان بھی موجود تھے۔

”سر آپ۔۔۔ اتنی رات کو۔۔۔“ ڈاکٹر شائستہ
 نے ڈاکٹر احمد کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

”ڈاکٹر شائستہ میں نے ایک گھنٹہ پہلے ایک
 مریض آپ کو ریفر کیا تھا اس کی حالت اب کیسی
 ہے۔“ ڈاکٹر احمد نے ڈاکٹر شائستہ کی حیرت کو
 نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”مریض۔۔۔“ ڈاکٹر شائستہ کے منہ سے بے
 ساختہ نکلا۔۔۔ ”سر آپ نے مریض نہیں بلکہ ایک لاش
 بھیجی تھی۔ مشہور صحافی شہنشاہ یاسر کے شوہر یاسر جواد کی
 لاش۔۔۔“ ڈاکٹر شائستہ نے تفصیل سے جواب دیا۔

”لاش۔۔۔“ ڈاکٹر احمد اور انسپیکٹر خان کے منہ
 سے ایک ساتھ نکلا۔

”جی ہاں۔۔۔ لاش اور میں نے اس لاش کا پوسٹ
 مارٹم بھی کر دیا ہے۔ یہ رہی اس کی رپورٹ۔۔۔“ ڈاکٹر

شائستہ نے اپنی ہاتھ میں پکڑی رپورٹ ڈاکٹر احمد کو دی تو
 ڈاکٹر احمد رپورٹ پر غصے لگے۔
 ”یہ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔“ رپورٹ پڑھنے
 کے بعد ڈاکٹر احمد بولے۔

”کیا ہوا۔۔۔“ انسپیکٹر خان نے پوچھا تو ڈاکٹر احمد
 نے رپورٹ انسپیکٹر خان کو دے دی۔

”یہ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے مسٹر یاسر کی موت شام
 ساڑھے پانچ بجے ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر شائستہ آپ سے
 کوئی غلطی تو نہیں ہوئی کیونکہ رات گیارہ بجے تو یاسر
 ہمارے ساتھ تھا۔“ انسپیکٹر خان حیران تھے۔

”پوسٹ مارٹم کرنے کا میرا بیس سال کا تجربہ
 ہے۔۔۔ میں لاش دیکھ کر اس کے مرنے کا صحیح وقت بتا
 سکتی ہوں۔۔۔ مسٹر یاسر کے موت شام ساڑھے پانچ
 بجے سر پر لگنے والی شدید ضرب کی وجہ سے واقع ہوئی
 تھی۔ اس شدید ضرب نے مسٹر یاسر کے کھوپڑی کو چٹھا
 کر رکھ دیا تھا اور مسٹر یاسر نے موقع پر ہی دم توڑ دیا
 تھا۔“ ڈاکٹر شائستہ نے جواب دیا۔

”لیکن۔۔۔“ انسپیکٹر خان نے کچھ کہنا چاہا مگر
 ڈاکٹر احمد نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں مزید
 کچھ بولنے سے روک دیا۔

”کچھ باتیں ہماری عقل سے باہر ہوتی
 ہیں۔۔۔ شہنشاہ سے شدید محبت اور اس کے قاتل سے
 انتقام لینے کے لیے یاسر کی روح دوبارہ اس کے جسم میں
 داخل ہو گئی تھی۔ شاید یہ بات ہماری عقل میں نہ آئے
 مگر جب ایسوی لینس میں دیکھنے کی بجائے چاہی اور
 اس کے دل کی دھڑکن سننی چاہی تو نہ اس کی بغل چل رہی
 تھی اور نہ ہی اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ سائنسی طور پر وہ
 اس وقت ہی مر چکا تھا بس انتقام کے جنون میں اس کا
 مردہ زندہ تھا اور جیسے ہی اس نے اپنا انتقام لیا وہ مر گیا۔۔۔
 شاید عقل اس بات کو تسلیم نہ کرے لیکن محبت میں بڑی
 طاقت ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر احمد نے انسپیکٹر خان سے کہا تو
 انسپیکٹر خان نے جھٹکے کی دیوار کے پار بھی یاسر جواد کی لاش
 کو دیکھا یاسر کا چہرہ ایک دم پرسکون تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے
 وہ مرا نہیں ہو بلکہ پرسکون نیند سو رہا ہو۔

☆☆☆☆☆☆

پراسرارہ سر کی پانچویں خاص کہانی

پس ذرا سی چھاؤں کی تھی ✓



محمد قاسم خان بلوچ

اُس نوجوان کی پراسرار داستان جو آج بھی ایک بڑی آتما کی قید میں جی رہا ہے



تو میں نے ایک جگہ رکنے کا فیصلہ کیا تا کہ کچھ دیر کے لیے کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر آرام کر سکوں۔ یہی سوچ کر ایک جگہ میں نے اپنی سائیکل روک لی اور سائیکل روکنے کے بعد میں نے سائیکل کے دونوں ٹائروں کی ہوا چیک کی اور ساتھ ہی ایک کیکر کے درخت کے پاس اس کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ کیکر کا یہ ایک بہت پرانا درخت تھا جس کے تنے پر چند شاخیں موجود تھیں لیکن اس کی چھاؤں گھنی اور نہایت ٹھنڈی تھی۔ میرے چہرے کا رخ کیکر کے اس درخت کے تنے کی طرف تھا۔ میں نے اس درخت کا بغور جائزہ لیا۔ اس درخت کا رنگ عمر کی زیادتی کی وجہ سے بہت زیادہ سیاہ ہو چکا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس درخت کا تنا جی بھی ٹھیک حالت میں تھا۔ اس کی چھاؤں میں سکون اس قدر تھا کہ میں کتنی ہی دیر تک اس درخت کے پاس بیٹھا رہا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں تھا بس مجھے وہاں سکون اتنا مل رہا تھا کہ دل کر رہا تھا کہ ساری زندگی اس درخت اور اس جگہ پر گزار دوں اور یہاں سے دور کہیں نہ جاؤں۔

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ ہمارے ساتھ والے گاؤں میں میرے ایک دوست کی والدہ فوت ہو گئی تھیں اور آج اُن کے ختم شریف کا دن تھا۔ میں نے صبح ہی وہاں جانے کی تیاری کی اور سائیکل پر سوار ہو کر اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر ختم شریف میں شامل ہوا پھر اپنے دوست سے اجازت لے کر واپس اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ تقریباً ایک کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد میں نے اپنی سائیکل کا رخ ایک کچی سڑک کی طرف موڑ لیا۔ میری کوشش تھی کہ میں درمیانی رستوں سے ہوتا ہوا جلد سے جلد اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ جس کچی سڑک کی طرف میں نے اپنی سائیکل کا رخ موڑا تھا یہ کچی سڑک ایک بڑی نہر کے ساتھ دور تک منسلک تھی نہر اور کچی سڑک کے کناروں کے ساتھ بہت سارے پرانے درخت بھی موجود تھے جن سے مجھے یہ فائدہ ہو رہا تھا کہ چلتے ہوئے جسم پر ان درختوں کا سایہ پڑ رہا تھا اور کچھ حد تک گرمی سے بچت ہو رہی تھی۔

پھر کافی دور تک چلنے کے بعد جب میں تھک گیا

ہوا چٹک کی تھی۔ اب یہ ہنسی ایک ٹائر سے کس طرح غائب ہو گئی تھی۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ لہذا اب باقی سفر مجھے پیدل طے کرنا پڑ گیا تھا۔ خیر جانا تو مجھے لازمی تھا سو میں پیدل چلنے لگا۔

تھوڑی دور پیدل چلنے کے بعد میں کچی سڑک سے اتر کر ایک پگنڈی پر ہولیا۔ میری سوچیں ابھی بھی اس درخت اور اس جگہ کی طرف ہی مائل تھیں اور دل اداس ہو گیا تھا اس درخت اور جگہ کو چھوڑ کر آنے سے میرا دل مجھے بار بار مجبور کرنے لگا کہ میں پھر واپس اس جگہ چلا جاؤں جہاں میں کچھ دیر کے لیے بیٹھا تھا۔ میں نے کس طرح اپنے دل پر قابو رکھا یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں پیدل چلتا رہا پھر ایک ڈیرہ آگیا، میں اس ڈیرے کے قریب گیا تو وہاں یہ موجود میرا ایک واقف دوست چار پانی پر لیٹا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے آواز دے کر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ سلام دعا کے بعد وہ میرے لیے ٹھنڈا پانی لے آیا میں نے پانی پی لیا تو وہ کہنے لگا۔

چٹا نہیں اس درخت میں ایسی کیا بات تھی کہ میں نے دو ٹن بارود ہاں سے اٹھنے کی کوشش بھی کی لیکن اس درخت کی چھاؤں نے وہاں سے نہ جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سوچا کچھ دیر اور رک جاتا ہوں۔ جانا تو ہے ہی تھوڑی دیر بعد چلا جاؤں گا۔ چند لمحے اور گزرے تو مجھے نیند آنے لگی اور میں غنودگی کی حالت میں ڈوب گیا۔ اچانک نیند کی وجہ سے مجھے شدید جھٹکا لگا تو میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا لیکن سوائے میری سائیکل کے اور کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

اب میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب جو بھی ہو میں یہاں سے ضرور اٹھ جاؤں گا، میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سائیکل پر سوار ہو کر جیسے ہی آگے بڑھنے کی ہمت کی لیکن سائیکل لے کر آگے بڑھنے سے جواب دے دیا اس لیے کہ سائیکل کے پچھلے ٹائر میں ہوا موجود نہیں تھی۔ ٹائر میں ہوا کا نہ ہونا ایک عجیب سی بات تھی کیونکہ جب میں نے اس جگہ سائیکل کھڑی کی تھی تو میں نے تسلی سے دونوں ٹائر دوں کی



Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

آنکھیں اچانک بند ہو گئیں اور مجھے اپنی آنکھوں پر
تھوڑا سا بوجھ بھی محسوس ہوا۔ میں نے فوراً اپنی
آنکھیں کھولیں اور سوچ میں پڑ گیا کہ یہ ابھی کیا ہوا
تھا میرے ساتھ۔

میں نے اپنے باقی گھر والوں کی طرف دیکھا وہ
سبھی سو رہے تھے جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں پھر اپنی
چار پائی پر لیٹ گیا اور پھر سے ذکر الہی کرنے لگا
ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ مجھے پھر سے وہی کچھ
محسوس ہوا۔ میں جاگ رہا تھا لیکن میری آنکھیں پھر
سے بند ہو رہی تھیں لیکن اب میں کوشش کرنے کے
باوجود اٹھ نہ سکا اور میری آنکھیں بند ہوئیں اور مجھ پر
نیند طاری ہونے لگی اور سکون بھی۔ وہ منظر ابھی تک
یاد ہے کہ میں سو ضرور گیا تھا لیکن مجھے ہوش بھی تھا اور
جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا وہ میں محسوس کر رہا تھا
لیکن میرا وجود بے بس ہو گیا تھا کہ میں کوئی حرکت
کر سکوں۔

جب مجھے نیند آئی تو میں نے دیکھا کہ خواب
میں، میں ایسی جگہ پر کھڑا ہوں۔ وہ جگہ ویران ہی جگہ
ہے اور اس ویران جگہ پر میرے سامنے دو عورتیں
کھڑی تھیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

ان دونوں میں ایک بوڑھی عورت تھی جب کہ
دوسری نہایت خوب صورت اور جوان لڑکی۔ میں بھی
ان دونوں کی طرف دیکھ رہا ہوں خوب صورت اور
جوان لڑکی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور اپنے
ساتھ کھڑی بوڑھی عورت سے پوچھنے لگی ای یہ خوب
صورت لڑکا کون ہے۔ تو بوڑھی عورت اسے بتانے
لگی۔ بیٹی کیا تجھے نہیں پتا یہ وہی لڑکا تو ہے جو آج
دوپہر کے وقت ہماری رہائش والی جگہ پر آکر بیٹھا
تھا۔ دھوپ اور گرمی کی وجہ سے۔ میں نے اسے وہاں
دیکھا تو یہ مجھے بہت اچھا لگا اور میں نے اس کے
ساتھ ایک شرارت بھی کی تھی تاکہ یہ وہاں سے ہمیں
چھوڑ کر اپنے گھر نہ جاسکے لیکن یہ پھر بھی وہاں نہ رکا
اور اپنے گھر چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ اس کے
گھر چلی آئی تاکہ اس کا گھر دیکھ سکوں اس کو اس بات
کی خبر بھی نہیں تھی کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی

یاد خیر تو ہے تم پیدل آرہے تھے۔ حالانکہ
تمہارے پاس سائیکل بھی ہے۔ میں نے اسے
ساری بات بتائی تو وہ کہنے لگا۔ ”یار تم پریشان نہ ہو،
میں ہوا بھرنے والا پمپ لے آتا ہوں۔ تم ہوا بھر
کے دیکھ لو ہو سکتا ہے ہوائی مار میں بھر جائے اور تم
آسانی سے گھر جاسکو۔“

اپنے دوست کی بات سن کر مجھے تسلی ہوئی تو میں
نے اسے کہا کہ ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب جلدی سے
پمپ لے آؤ۔“

یہ سن کر وہ اپنے گھر گیا اور پمپ لے آیا اور اس
نے خود ہی سائیکل میں ہوا بھری یوں میں نے اس
سے اجازت مانگی اور اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا۔
باقی سفر میں نے سائیکل پر آدھے گھنٹے میں طے کیا
لیکن حیرانگی والی بات میرے لیے یہ تھی کہ اتنی دیر اور
اتنے وقت میں ابھی تک مار سے ہوائیں نکل رہی تھیں۔

گھر پہنچ کر میں نے نماز عصر ادا کی اور سو گیا پھر
جیسے ہی مجھے نیند جاگ ہوئی میں نے ایک بار پھر
سائیکل کے پچھلے مار کی ہوا چیک کی لیکن ہوا ابھی تک
موجود تھی۔ اب میں کچھ پریشان سا ہو گیا کہ اگر مار
بکھر ہوتا تو اب تک ہوا کو نکل جانا چاہیے تھا لیکن مار صحیح
ہونے پر اس کی ہوا کا غائب ہو جانا۔ آخر یہ کیا راز
تھا؟ میں نے بہت غور کیا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

نماز عشاء ادا کرنے کے بعد میں قرآن مجید کی
تلاوت میں مصروف ہو گیا۔ میری عادت تھی کہ میں
نماز عشاء کے بعد قرآن مجید کی تین سورتیں لازمی
تلاوت کرتا تھا۔ اپنی والدہ مرحومہ کے ایصال ثواب
کے لیے، جن میں سورہ بقرہ کی آخری آیات، سورہ
یائین، سورہ ملک اور سورہ مزل ان سورتوں کی
تلاوت کے بعد میں اپنی چار پائی پر لیٹ گیا اور ذکر
الہی کرنے لگا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں
جب لیٹ کر ذکر الہی کر رہا تھا تو اپنے ہوش و حواس
میں تھا اور نیند تو مجھ سے کوسوں دور تھی میری عادت
بن چکی تھی میں رات کو تھوڑا لیٹ سوتا تھا۔ پر اب میں
نے محسوس کیا کوئی زبردستی میری آنکھوں کو بند کرنے
کی کوشش کر رہا ہے۔ میں جاگ رہا تھا لیکن میری

میرے گھر آیا ہے۔ اب سیتا بیٹی میں تمہیں اپنے ساتھ اس کے گھر لے آئی ہوں تاکہ تو بھی اسے پسند کر لے میں نے تو اسے تیرے لیے پسند کر لیا ہے۔ یہ سن کر وہ جوان لڑکی کہنے لگی۔ امی یہ لڑکا مجھے بھی پسند آیا ہے لیکن ہم میں اور اس میں فرق بہت بڑا ہے۔ امی تم نے دیکھا نہیں کہ یہ نماز اور قرآن کی تلاوت بھی کر رہا تھا کچھ دیر پہلے جس کا مطلب کہ یہ ایک مسلمان لڑکا ہے اور ہم تو مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔

یہ سن کر بوڑھی عورت نے اپنی جوان لڑکی کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ سیتا بیٹی تو فکر مت کر ہم اس کے جسم اور دماغ پر قبضہ کر لیں گے تو پھر یہ ہمارے حکم اور ہماری مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارے گا اور یہ اپنی مرضی کا کوئی بھی کام نہیں کر سکے گا۔ یہ سن کر وہ جوان لڑکی خوش ہوئی اور کہنے لگی پر امی یہ سب کچھ ہو گا کس طرح یہ سن کر بوڑھی عورت کہنے لگی۔ سیتا بیٹی ابھی سب کچھ دکھاتی ہوں کہ یہ کس طرح ہو گا۔

یہ کہہ کر اس بوڑھی عورت نے اپنا ایک بازو میری طرف لبا کیا اور اپنا ہاتھ میرے سینے پر دل کی جگہ پر رکھا تو میرے دل میں شدید درد ہوا اور دل میں گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے میں ایک زوردار چیخ کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ چیخ کی آواز سن کر سبھی گھر والے بھی گھبرا کر اٹھ گئے۔ میرے ابو نے جلدی سے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور پوچھنے لگے۔

”عابد بیٹا کیا ہوا خیر تو ہے، کس چیز سے ڈر گئے کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا تم نے۔“

لیکن میں ڈر اور خوف میں اس قدر بندھا تھا کہ مجھے میرے ہی گھر سے خوف آرہا تھا۔ میرے آس پاس گھر والے ضرور موجود تھے لیکن ان کے علاوہ مجھے کسی اور مخلوق کی موجودگی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ میرے ابو نے جب دوبارہ مجھ سے پوچھا تو میں نے کچھ بتائے بغیر اپنے ابو سے کہا۔

”ابو خدا کے لیے مجھے اس گھر سے کہیں دور لے جاؤ۔ مجھے اس گھر سے ڈر لگ رہا ہے۔“

ابو مجھے تمام کر اپنے ساتھ میرے چچا کے گھر لے

آئے۔ وہ سب بھی اس صورت حال سے پریشان ہو گئے پھر کبھی کہنے لگے عابد اب ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تم خواب میں ڈر گئے تھے۔ اب آیت الکرسی پڑھ کر ادھر ہی سو جاؤ۔ انشاء اللہ کچھ نہیں ہو گا دوبارہ۔ لیکن اب میں ان سب لوگوں کو کیا بتاتا اور کس طرح یقین دلانا کہ میں نے خواب میں سب کچھ حقیقت میں دیکھا ہے اور میں اپنے پاس کسی اور مخلوق کی موجودگی بھی محسوس کر رہا ہوں اور میرے جسم میں کچھ عجیب طرح کی حرکتیں ہو رہی ہیں۔

میرے جسم میں ایک عجیب طرح کی حرکت ہو رہی تھی۔ خاص طور پر ٹانگوں اور دماغ میں۔ مجھے اپنی رگوں میں چیونٹیاں رینگتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ٹانگوں اور دماغ میں سنسناہٹ تھی، میں خوف کے عالم میں اپنے رب کو یاد کر کے اس سے مدد مانگ رہا تھا کہ یا اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے یا اللہ میری مدد کر۔ پھر دیر بعد سبھی لوگ سو گئے لیکن مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میرے دماغ میں نہ جانے کس نے یہ خیال پیدا کر دیا کہ عابد اگر تم نے سونے کی کوشش کی تو ہم تم کو پھر ڈرائیں گے۔ بہتر ہے جاگتے رہو یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔“ مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ میرا جسم میرا دماغ کسی اور مخلوق کے قبضے میں ہے۔ میں پریشان اور خوف زدہ سا سوچوں میں کہ تھا تو میں نے اپنے بہت ہی قریب ایک عجیب سی آواز سنی۔ ڈر کر اپنے آس پاس دیکھا تو میرے سامنے سے ایک بے نام سا سایہ محن کی دیوار کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا اور پھر وہ سایہ دیوار کے پاس جا کر ایک انتہائی خوفناک شکل میں تبدیل ہو گیا جس کی وحشت میری کمزور آنکھیں برداشت نہ کر سکیں اور میں چیخیں مارنے لگا۔

اس بار میری چیخوں کی آواز بہت سارے گھروں میں سنائی دی تھی تو بہت سارے لوگ ہمارے پاس جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے عابد کو آج کیا ہو گیا ہے جو یہ ڈر کر اتنی زور سے چیخیں مار رہا ہے ابو نے سب کو سب کچھ بتایا کہ یہ پہلے خواب میں ڈرا تھا اور اب جاگتے ہوئے ڈرا ہے۔

اور ساری رات میرے دماغ میں ڈر اور خوف چھایا رہا۔ میرے ساتھ میرے ابو بھی جاگتے رہے اور مجھے تسلیاں دیتے رہے کہ عابد بیٹا فکر نہ کرو صبح ہوگی تو میں آپ کو کسی چیر کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ میرا باپ تھا اور ایک باپ ہونے کے ناتے میرا دکھ درد محسوس کر رہا تھا۔

☆.....☆

اکلی صبح دس بجے میرے ابو اور دو لڑکے مجھے ایک چیر صاحب کے پاس لے گئے۔ ابھی ہم راستے میں تھے کہ میرا جسم بے چین اور بے قرار ہونے لگا۔ جیسے میں صدیوں کی مسافت طے کر کے تھکا ہوا تھا۔ ٹانگوں میں گرماش اور درد ہونا شروع ہو گیا، دل گھبرانے لگا اور پھر وہ مخلوق دماغ میں ہی مجھ سے باتیں کرنے لگی۔

”عابد! تم اچھا نہیں کر رہے ہو چیر صاحب کے پاس جا کر تم نے رات کو وعدہ کیا تھا کہ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا اب کیوں چیر صاحب کے پاس جا رہے ہو۔ بہتر ہے واپس چلے جاؤ نہیں تو بعد میں تم کو بہت ساری تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو تمہاری ہمت سے کہیں بڑھ کر ہوں گی اور ہاں عابد ہم تم کو اب بتا رہے ہیں کہ ہم تمہارے کو زندگی بھر نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ہمارا تم سے وعدہ ہے تم کہیں بھی ہٹاؤں گے۔ اس سے دور نہیں جاسکتے۔ اس لیے کہ تمہارا وجود ہماری قید میں ہے۔“

عابد میں تم کو اب بتا رہی ہوں کہ میرا نام سیتا ہے اور میں جنات میں سے ہوں میں نے تم کو اپنے لیے پسند کیا ہے۔ اب تم میرے ہو اور میرے رہو گے۔ تم اس پیر تو کیا خواہ اس سے بڑے طاقت ور پیر کے پاس بھی چلے جاؤ یہ تمہیں ہم سے کبھی جدا نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے بہتر ہے واپس چلے جاؤ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اب تم اگر چیر صاحب کے پاس چلے جاؤ گے تو وہ ہمیں تھوڑی بہت تکلیف دے گا اور بعد میں اس تکلیف کا بدلہ ہم تم سے لیں گے۔ تمہیں سزا دے کر اب تمہاری مرضی ہے۔“

ان کی اس بات پر میں نے بس اتنا ہی کہا تم

یہ سن کر کچھ لوگ کہنے لگے عابد بیٹا بھلا آج تم کہاں گئے تھے اور کس کس جگہ بیٹھے تھے۔ کس تم کسی ایسی جگہ تو نہیں جا کر بیٹھے جہاں ہوائی مخلوق رہتی ہو اور ان کو تمہارا وہاں بیٹھنا پسند نہ آیا ہو۔ اس لیے وہ تم کو اب ڈر رہے ہوں، اس بات کا بدلہ لینے کے لیے۔“

یہ سنتے ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا کہ میں کس جگہ دھوپ سے نہننے کے لیے بیٹھا تھا۔ وہ جگہ، وہ کیکر کا درخت میری آنکھوں میں کسی عکس کی طرح آسا جیسے میں ابھی بھی اس درخت کے پاس بیٹھا ہوں۔

جب یہ سب کچھ میرے ذہن میں آ گیا تو ایک بار پھر میرے دماغ میں کسی نے یہ بات کہی کہ عابد تم کو ابھی جو کچھ بھی یاد آیا ہے وہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ تم دو پہر کو ہمارے پاس آ کر بیٹھے تھے اور ہم اس جگہ کے مالک ہیں اور ہم ہی تم کو ڈر رہے ہیں۔ ہم تم کو اغنا بنانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں لیکن اب یہ کسی کو بھی مت بتانا کہ میں دو پہر کو کس جگہ پر جا کر بیٹھا تھا۔ وہ کس طرح کی جگہ تھی اور وہاں کیا کچھ تھا ورنہ ہم تم کو ڈر ڈرا کر مار دیں گے۔“

میں نے اپنے دماغ میں یہ بات سنی تو میں نے ڈر کے مارے اپنے دماغ میں ہی ان کو جواب دیتے ہوئے کہا خدا کے لیے مجھے ڈر اومت میں کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

میری اس بات پر پھر میرے دماغ میں کہا گیا۔ شاباش عابد ہماری بات مانو گے تو بھلائی میں رہو گے۔“

اب اس بات میں کوئی شک تو باقی نہیں رہا تھا کہ میں کسی اور مخلوق کے قبضے میں پھنس گیا تھا اور جس جگہ پر میں دو پہر کو جا کر بیٹھا تھا وہاں حقیقت میں ہوائی مخلوق کی رہائش تھی۔ جنات یا پھر کسی جڑیل کی۔ اب میں ان کی قید میں آچکا تھا میں افسوس کرنے لگا کاش میں اس جگہ نہ بیٹھتا تو اب اس مصیبت میں نہ پھنستا اب سوائے افسوس کے اور کچھ بھی کیا سکتا ہوں۔

پوری رات بہت گئی۔ میں ایک بل بھی نہ سوکا

پوچھنے لگے۔ اب بتاؤ تو بھلا جادو بٹاتا ہے یا نہیں؟
ابھی تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ لیکن میں نے لاشی
کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں پیر جی! مجھے کچھ یاد نہیں۔“

پھر پیر صاحب کہنے لگے۔ ”بنا تم پر ایک
مسلمان جن لڑکی عاشق ہو گئی ہے۔ اس کا نام مریم
ہے۔ وہ تمہیں بہت فائدہ دینا چاہتی ہے اور وہ اب
وہ تمہیں تنگ نہیں کرے گی اور نہ ہی تمہارے پاس
آئے گی۔ میں نے اس کو تمہارے جسم سے نکال دیا
ہے۔ وہ تو چاہتی تھی کہ وہ تمہارے ساتھ تمہارے جسم
میں موجود رہے لیکن میں نے اس کو بڑی مشکل سے
جانے پر راضی کیا تو وہ کہنے لگی میں چلی جاتی ہوں
لیکن مہینے میں ایک دو بار اس کے پاس آ جایا کروں
گی جس پر تمہارے ابو بھی راضی ہو گئے اور انہوں
نے بھی کہہ دیا ٹھیک ہے تم اسے ڈراؤ نہیں اور کبھی
اس کے پاس آ جانا۔“

پیر صاحب کی بات ختم ہوئی تو میں نے دل ہی
دل میں پیر صاحب سے کہا۔ ”واہ پیر صاحب یہ آپ
نے کیا کر دیا اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ مجھے چھوڑ
کر کہیں نہیں گئی بلکہ پیر جی وہ تو ابھی بھی میرے جسم
میں موجود ہے۔ وہ کبھی مجھے نہیں چھوڑے گی یہ تمہاری
پہلی غلطی ہے اور دوسری غلطی یہ کہ وہ مسلمان نہیں بلکہ
کافر ہے۔ وہ کبھی تمہاری بات نہیں مانے گی۔ وہ مجھے
فائدہ نہیں بلکہ نقصان دے گی اور وہ بھی سزاؤں کی
صورت میں۔“

ہوائی مخلوق سیتان نے مجھے ٹھیک ہی کہا تھا کہ دیکھنا
عابد اب میں کیسے تمہارے پیر کو دھوکا دیتی ہوں اور یہ
کبھی تمہیں ہم سے جدا نہیں کر سکے گا۔

مجھے یہ سب اسی وقت بتا چل گیا تھا جب مجھے
ہوش آیا تھا اور پیر صاحب یہ کہہ کر خوش ہو رہے تھے
کہ میں نے اس ہوائی لڑکی کو تمہارے جسم سے بھگا دیا
ہے تو اس جنات سیتان نامی لڑکی کی اپنے وجود میں
موجودگی میں نے محسوس کر لی تھی اور پیر جی کی باتیں
سن کر سیتان نامی جنات نے میرے دماغ میں کہہ دیا تھا
دیکھا عابد تمہارے پیر کو میں نے دھوکا دے دیا نا اور

صرف مجھے تنگ کر رہے ہو۔ نہ آپ کو مجھ سے محبت
ہے اور نہ بندہ دی۔ میں اپنے جسم میں آپ کا وجود
برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ضرور پیر کے پاس جاؤں
گا۔“

اس کے بعد میرا جسم ہلکا ہونا شروع ہو گیا اور
میں اونچی آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ میں اچھی
طرح سے سب کچھ سمجھ رہا تھا کہ کلمہ طیبہ کا اونچی آواز
میں ورد میں نہیں کر رہا تھا بلکہ میرے جسم میں موجود
جاوی جن جس نے اپنا نام سیتا بتایا تھا یہ ورد وہ کر رہی
تھی۔ اس کلمہ طیبہ کا اونچی آواز میں پڑھنے کا مقصد
میرے ساتھ آنے والے لوگوں کو دھوکہ دینے کا تھا
کہ وہ اب جان تو چکے ہیں کہ اس لڑکے پر کسی ہوائی
مخلوق کا سایہ ہو گیا ہے۔ تو اب ان کو یہ بھی بتا چل
جائے کہ یہ ہوائی مخلوق ایک مسلمان ہے جو اس لڑکے
کو نقصان نہیں دے گی بلکہ اس کو فائدہ دے گی اور یہ
لوگ بھی میرے حق میں ہو جائیں فلی الوقت کلمہ
پڑھنے کے بعد وہ پھر مجھے کہنے لگی۔

”عابد اب دیکھنا کہ میں کس طرح ان لوگوں اور
تمہارے پیر کو دھوکا دیتی ہوں۔“

خیر ہم پیر صاحب کے آستانے پر پہنچ گئے۔ سلام
دعا کے بعد میرے والد صاحب نے پیر صاحب کو
سب کچھ بتا دیا کہ رات سے اس لڑکے کے ساتھ یہ
سب کچھ ہو رہا ہے۔ پیر صاحب نے مجھے اپنے آگے
بٹھالیا اور مجھ سے سب کچھ پوچھنے لگے۔ پھر میں جیسے
جیسے سب کچھ پیر صاحب کو بتا رہا تھا تو دکھ اور غم سے
میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اور آنکھوں سے
آنسو بھی نکل رہے تھے۔

سب کچھ سن کر پیر صاحب نے مجھے تھپکی دی اور
کہنے لگے۔ ”بنا سب ٹھیک ہو جائے گا تم سیدھے ہو
کر بیٹھ جاؤ۔“

پھر مجھے اتنا یاد ہے کہ کچھ دیر بعد پیر صاحب نے
کچھ پڑھا تھا اور مجھے اپنے آپ کا کچھ بھی ہوش نہیں
تھا۔ میں کہاں ہوں اور میرے ساتھ کیا کچھ ہو رہا
ہے۔

جب مجھے ہوش آیا تو پیر صاحب مجھ سے کچھ

پھر وہ مسکرائے مگر تھی۔ میں تو جانتا تھا کہ یہ خوف کس وجہ سے آ رہا تھا۔

آ نکھیں اور بھی تھیں جو انتہائی وحشت ناک آنکھیں
تھیں جن سے دیکھنے والے کو خوف آنے لگا اور وہ یہ
سمجھتا کہ میری آنکھوں میں خوف نظر آ رہا ہے۔

یوں ہم پیر صاحب کے آستانے سے نکل کر اپنے گاؤں پہنچ گئے تو میرے والد صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ ”عابد اب تم ڈرو نہیں اور اپنے گھر چلو۔“ گھر کا نام سن کر میں پھر خوف زدہ ہو گیا اور میں نے ابو کو انکار کر دیا گھر جانے سے اور سیتانے بھی یہ بات سن لی تھی اب وہ مجھے بتا رہی تھی کہ بھول کر بھی اپنے گھر مت جانا ورنہ پچھتاؤ گے۔“

میں بھی نہیں چاہتا تھا کسی اور بڑی مصیبت میں پڑتا میں تو پہلے ہی ایک ایسی مخلوق کی قید میں آچکا تھا جو ظالم بھی تھی اور کافر بھی۔

اور ایک مسلمان کیسے اپنے وجود میں کسی اللہ کے
منکر کو داشت کر سکتا ہے۔

میں نے ابو کو انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”ابو میں ابھی اپنے گھر نہیں جاؤں گا جب تک میں ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ مجھے اس گھر سے اتنی دور بھی خوف آرہا ہے تو میں گھر کے اندر کیسے چلا جاؤں۔“ لیکن ابو اصرار کرنے لگے کہ میں اب ٹھیک ہوں اور اپنے گھر چلا جاؤں۔ یہ سن کر نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے بڑی ہی وحشت ناک نظروں سے والد صاحب کو دیکھا تو میرے ابو نے پلٹ جھپکتے ہی اپنی نظریں جھکا لیں اور مجھے کہنے لگے۔

”عابد بیٹا تم جہاں رہنا چاہو وہ کہتے ہو، اپنی مرضی سے۔“ ابو کی بات سن کر میں نے کہا۔

”ابو جان کیا بات ہے ابھی تم کہہ رہے تھے کہ میں اپنے گھر جاؤں اور ابھی آپ کہہ رہے ہو جہاں مرضی رہنا چاہو رہ سکتے ہو۔ آپ کی بات فوراً کیوں بدل گئی بتاؤ ابو جان مجھے۔“

میرے والد صاحب کہنے لگے۔ ”بیٹا! کہتاؤں جب تم نے میری طرف دیکھ کر یہ کہا کہ میں اس گھر میں نہیں جاؤں گا تو خدا کی پناہ تمہاری آنکھوں میں مجھے خوف دکھائی دیا تھا جس کی تاب میں نہیں لاسکا۔ میں حیران ہوں تمہاری آنکھوں میں یہ خوف یہ وحشت کہاں سے آئی۔ پہلے تو یہ وحشت اور خوف نہیں تھا۔“

میں تو جانتا تھا کہ یہ خوف کس وجہ سے آرہا تھا۔
 ظاہر تو میری آنکھوں سے لیکن میری آنکھوں میں دو
 آنکھیں اور بھی تھیں جو انتہائی وحشت ناک آنکھیں
 تھیں جن سے دیکھنے والے کو خوف آنے لگا اور وہ یہ
 سمجھتا کہ میری آنکھوں میں خوف نظر آرہا ہے۔

پھر یہ ہوا جو بھی ایک بار میری آنکھوں میں دیکھ
کراتا تھا تو دوسری بار اس کی ہمت نہیں ہوتی
تھی کہ وہ دوبارہ میری طرف ایک نظر دیکھ لے اور یہ
بات بالکل سچ تھی۔ مجھے کئی دوستوں اور لوگوں نے
بتایا تھا کہ یار عابد آپ کی آنکھوں سے خوف آتا
ہے۔ کیا ہوا ہے تمہاری آنکھوں کو۔" لیکن میں کسی کو
کچھ بھی نہیں بتاتا تھا کہ میرے ساتھ کیا مسئلہ ہوا ہے
اور ویسے بھی مجھے اجازت تو تھی نہیں۔ بتانا ہی اس
ہوائی مخلوق نے مجھے محکم دے رکھا تھا کہ میں اپنا کوئی
بھی راز کسی کو نہ بتاؤں خاص طور پر ہم دونوں کی محبت
کے بارے میں۔

☆.....☆

پیر صاحب سے ملاقات کے کچھ روز بعد شام کے وقت سیٹا نے میرے وماغ میں یہ بات کہی۔

”عابد! اب سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس دن تم نے پیر صاحب سے مجھے سزا دلوائی تھی اب میں تمہیں سزا دوں گی تاکہ تم کو ہماری طاقت کا پتہ چل جائے کہ ہماری بات نہ ماننے والوں کو ہم کتنی سخت سزا میں دیتے ہیں۔“ میں جانتا تھا کہ سیٹا ضرور مجھے سزا دے گی۔ اس لیے میں نے سیٹا سے کہا۔

”سیتا! تم مجھ سے یہ کیسی محبت مجھ سے کرتی ہو جو مجھے اب ذرا اور ای بات پر سزا دینا چاہتی ہو مطلب تم مجھ سے محبت نہیں بلکہ محبت کے نام پر مجھے دھوکا دے رہی ہو۔“

تو سیتا کہنے لگی۔ ”میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں جس کی کوئی بھی حد نہیں اور میں چاہتی ہوں کہ تو صرف میرا حکم مانو۔ یہاں تک کہ تم اپنی مرضی بھی بھول جاؤ اور تمہارا وجود اب مکمل طور پر میرے قبضے میں ہے۔ میں جو چاہوں وہ تم سے کروا سکتی ہوں۔“

سیتا کی یہ بات بھی سچ ہی نکلی۔ میں ایک بار نماز

پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا تو نماز میں مجھے نیند آگئی اور میں خاموش کھڑا رہا۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ میں نے نماز میں کچھ پڑھنا بھی ہے۔ اگر میں رکوع میں جاتا تو دس دس منٹ رکوع کی حالت میں رہتا اور کبھی کبھی نماز توڑ دیتا لیکن یہ سب میں خود نہیں کر رہا تھا بلکہ یہ سب سیتا کا کارنامہ تھا اور اگر قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگتا تو اس میں بھی مجھے نیند آ جاتی۔ کبھی اس طرح بھی ہو جاتا کہ میری زبان سے قرآن اور نماز کے متعلق غلط قسم کی باتیں نکلنا شروع ہو جاتیں اور میں نماز اور قرآن کو اس مجبوری کی وجہ سے چھوڑ دیتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ قرآن اور نماز کی بے ادبی نہ کرے۔ وہ میرے ساتھ محبت کے نام دھوکا اور ظلم کر رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں نماز اور قرآن پڑھوں کیونکہ وہ میرے وجود میں تھی تو ان چیزوں کے پڑھنے سے اس کے جسم کو تکلیف ہوتی تھی۔

کئی روز تک ایسا چلتا رہا۔ اب سیتا کی قرآن اور نماز کے بارے میں گستاخیاں حد سے آگے تجاوز کر رہی تھیں۔ اب وہ جب دیکھتی کہ میں نماز اور قرآن پڑھنے لگا ہوں تو وہ مجھے بہکانے لگتی اور ایسے غلط الفاظ کہنے لگتی جو الفاظ یہاں لکھنا مناسب نہیں سمجھتا کہ کسی بھی مسلمان کو ان باتوں سے تکلیف نہ ہو۔

سیتا جو سزا میں مجھے دینا چاہتی وہ سزائیں مجھے دے رہی تھی۔ میں راتوں کو جاگتا رہتا۔ نیند تو میری آنکھوں سے ختم ہو گئی تھی اور نماز، قرآن کو میں ایسے بھول گیا جیسے یہ میری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔ قرآن اور نماز کا پڑھنا۔

میں اب اکثر تنہائی اور ویران جگہوں پر چلا جاتا اور پراسرار طور پر پرانے درختوں کی طرف دیکھتا رہتا۔ کئی بار میں نے بہت لمبے لمبے سفر بھی پیدل طے کیے۔ میرے قدم جھکتے نہیں تھے بلکہ میرے جسم میں طاقت بھی اتنی آ جاتی تھی کہ میرے قدم خود بخود اٹھنے لگتے۔

میرے اندر سے میری تمام خواہشیں اور میری مرضی تو ختم ہو گئی تھی۔ میں جو بھی کام کرتا وہ سیتا کی مرضی کا ہوتا۔ میں اگر اس کی بات نہ بھی مانتا تو وہ خود منوا لیتی۔ اب تو میرا دل کرتا تھا کہ میں کسی ایسی جگہ

چلا جاؤں جہاں ہر کوئی نہ ہو اور میں ہنس بول چاہتا کروں۔

یہ خواہش دن بدن میرے اندر بڑھتی چلی گئی اور ایک دو بار مندر کی زیارت اور پوجا کے لیے میں صوبہ سندھ کے ایک علاقے بھاگ ناڑی بھی گیا جو ہندوؤں کی بستی ہے اور یہاں پر ایک بڑا سا مندر بھی موجود ہے۔ میں مندر سے جیسے ہی واپس آیا تو میں نے اپنے جسم میں ایک عجیب سا سکون پایا اب میری کوشش ہوتی ہر وقت سویا رہوں اور میرا دل اور دماغ مندر میں موجود مورتی کی طرف مائل رہتا اور میں عکس میں اس کی زیارت اور پوجا کرنے لگتا۔

ایک دن سیتا کہنے لگی۔ ”عابد ہم دونوں محبت میں بہت آگے تک جا چکے ہیں اب تمہاری جدائی کا خیال بھی سوچنا تکلیف اور دکھ دیتا ہے تم زندگی بھر کے لیے میرے ہو جاؤ اور میری ہر بات مان لو تو میں تمہیں زندگی میں کبھی دکھ نہیں دوں گی۔ جس طرح تم نے قرآن اور نماز کو چھوڑا ہے اسی طرح اب اپنے خدا اللہ اور اس کے پیارے رسول کو بھی چھوڑ دو۔“

سیتا کی یہ بات سن کر میں غصے میں آ گیا اور میں نے سیتا اور اس کے جھوٹے خداؤں کو گالیاں اور لعنتیں دینی شروع کر دیں اور میں نے سیتا سے کہہ دیا کہ تم جو مرضی کر لو مجھے جتنی بھی تکلیفیں دے دو۔ میں اپنے رب اللہ اور پیارے محمد سے کبھی بغاوت نہیں کروں گا۔ یہ نام مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔“

اب سیتا کا اصل مقصد بھی میرے سامنے آ چکا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اپنا ایمان اپنے دل سے نکال دوں اور اس کا حکم مانتے ہوئے اس کے خداؤں کو پوجوں اور ان کو حقیقی خدا مانوں۔ بھلا یہ میں کیسے برداشت کرتا۔ پھر میں نے سیتا کو کہا کہ سیتا تمہارے خداؤں کا کوئی وجود نہیں یہ محض پتھروں کے پتلے ہیں جو اپنا اچھا اور برا نہیں سوچ سکتے اور وہ تم کو کیا فائدہ اور نقصان دیں گے۔“

تو سیتا کہنے لگی۔ ”اس بات کو چھوڑو اور جو کہا ہے وہ کرو۔“ لیکن میں نے اس کی بات کا انکار

کرو یا سیتا نے پھر مجھے دھکی دئے کہہ کیا۔
 ”ٹھیک ہے۔ پھر میری نافرمانی پر تکلیفوں کے
 لیے تیار ہو جاؤ۔“

میں نے اسے کہہ دیا کہ ”میں تیار ہوں ہر دکھ
 پہننے کے لیے لیکن میں اپنے سچے رب اور سچے رسول کو
 کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ میرا ایمان پختہ ہے اور اللہ
 میرے ایمان کی حفاظت کرنے والا ہے۔ وہی
 میرے دکھ اور سکھ کا مالک ہے۔“

اس کے بعد کچھ پل اور گزرے تو خود بخود مجھے
 نیند آنے لگی اور نیند میں میرے ساتھ کچھ اور ہونے
 لگا۔ ایک خوب صورت لڑکی ہر رات نئے روپ میں
 آتی اور میرے ساتھ گناہ عظیم کرتی اور یہ گناہ ہر رات
 کا معمول بن گیا۔ وہ خوب صورت لڑکی کوئی اور نہیں
 بلکہ وہ سیتا ہی تھی جو میرے پاس آ کر اپنی جسم کی
 بھوک مٹاتی اور میں انکار کے باوجود بھی یہ گناہ کرتا
 کیونکہ جب میں اس گناہ سے انکار کرتا تو میرے
 ساتھ عجیب طرح کی حرکتیں ہونی شروع ہو جاتی اور
 میں مجبور دے بس ہو جاتا۔ کبھی میرا گلا دبے لگتا تو
 کبھی میرا سانس رک جاتا جس سے مجھے انتہائی
 تکلیف ہوتی۔

ایک دن میں نے پکارا وہ کر لیا کہ اگر آج سیتا
 اس گناہ کے ارادے سے میرے پاس آئی تو میں یہ
 گناہ نہیں کروں گا چاہے کچھ بھی ہو۔
 رات ہوئی اور سیتا میرے پاس آئی تو اس نے
 جیسے ہی اپنے گندے ارادے کا اظہار کیا تو میں نے
 سیتا کو انکار کر دیا۔ وہ شدید غصے میں آگور کہنے لگی۔
 ”اچھا ہے مان جاؤ ورنہ مجھے بہت کچھ کروانا آتا ہے
 لیکن میں نے دوبارہ انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ
 تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم مجھے گناہوں کی دلدل میں
 دھکیلتی جا رہی ہو اور میں مجبور دے بس ہو کر ہر گناہ کرتا
 جا رہا ہوں۔“

سیتا میرے قریب آئی اور میرے جسم سے لپٹ
 گئی۔ میں نے ایک زوردار پھیر اس کے منہ پر جڑوایا
 اور دھکا دے کر اپنے وجود سے الگ کر دیا۔ سیتا اب
 نہایت غصے میں آگئی اور اپنی وحشت ناک نظروں

سے میری طرف دیکھ کر سیتا نے جی جی مجھے ایک پھڑامارا
 اور میں جی مار کر غیظ سے جاگ گیا۔ پھر میرے
 کانوں سے سانپوں کے پھنکارنے کی آواز آنے
 لگیں جیسے میرے آس پاس بہت سارے سانپ
 ہوں اور پلک جھپکتے ہی مجھے ڈسنا چاہتے ہوں۔
 میرے جسم میں عجیب سی سرسراہٹ ہو رہی تھی میں
 نے ڈر کے مارے سیتا سے کہا۔

”خدا کے لیے سیتا تم ایسا مت کرو میرے
 ساتھ۔ میں یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔“ مجھے ڈر اور
 خوف میں مبتلا دیکھ کر سیتا خوش ہو کر کہنے لگی۔
 ”بس یہی تھی تیری تیرے رب سے محبت۔“

اسے کہو وہ آپ کو ہم سے بچالے۔
 پھر وہی ہوا جو سیتا کی مرضی تھی اور جو وہ چاہتی
 تھی۔ بعد میں، میں نے اللہ سے روبرو کر دیا مائلی۔
 ”یا اللہ! مجھے اس ظالم اور کافر مخلوق سے بچا کر اپنی پناہ
 میں رکھ۔ یا اللہ! مجھے اس کافر مخلوق سے بچالے۔ پھر
 شاید میری یہ دعا رب کے دربار میں ابھی قبول نہ ہوئی۔
 یوں مشکل گھڑیوں میں ڈوب کر میری زندگی
 گزرتی تو رہی لیکن اللہ پاک کی ذات سے بہتر کوئی
 نہیں جانتا، میں کس قدر مجبور تھا میں کر بھی کیا سکتا
 تھا۔ ایک ظالم ماویٰ جن کے آگے جب میرا جسم اور
 میرا دماغ ہی میرے بس میں نہیں رہا تھا کہ میں ان
 تکلیفوں سے بچ سکوں۔“

سائنس کا علم آسب اور آسبیں مخلوق پر یقین نہیں
 رکھتا جس کی وجہ سے آسب میں پھنسنے کئی بڑے کھسے
 لوگ طرح طرح کی مصیبتوں اور دکھوں میں اپنی
 زندگی برباد کر چکے ہیں۔ سائنس قرآن کے آگے صفر
 ہے۔ اللہ ہر مسلمان کو حدیث نبوی اور قرآن مجید کو
 پڑھنے اور سمجھنے کی ہمت دے، آمین۔ خیر سیتا نے مجھ
 پر کئی طرح کے ظلم کیے کچھ ایسے بھی ظلم اس نے مجھ پر
 کیے جو میں یہاں لکھنا مناسب نہیں نہ وہ پڑھنے اور
 لکھنے کے قابل ہیں۔ میں زندگی سے تنگ آ چکا تھا،
 نت نئے دکھوں اور تکلیفوں کی وجہ سے اب میں اللہ
 سے یہی دعا میں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ یا تو اس ظالم
 مخلوق کو مجھ سے جدا کر دے یا پھر مجھے موت دے

وے لیکن میری سب دعا میں ناقابل قبول ثابت ہو رہی تھیں۔ شاید مجھے ابھی اور بھی بہت سارے ظلم سیتا کی ذات سے پہنچے تھے۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے اس بیماری کی وجہ سے میں پورے دو سال تک سو نہیں سکا تھا اور اگر مجھے کبھی نیند آ بھی جاتی تھی تو سیتا خواب میں آ جاتی تھی۔ اس دوران میں اپنے گھر بھی ایک بل کے لیے نہ جاسکا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت میں پیدل چلا ہوا کیکر کے اس درخت کے پاس چلا گیا جیسے ہی میں اس درخت کے قریب پہنچا تو میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں صدیوں بعد اس جگہ پر آیا ہوں اور اس درخت اور اس جگہ سے میرا بہت پرانا رشتہ ہے۔ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

اے خدائی قدرت سے پیدا کی ہوئی مخلوق آج میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں کہ میں تھوڑی دیر کے لیے اگر آپ کی اس رہائش میں بیٹھ گیا تو یہاں بیٹھنے کی اتنی سزا میں کیوں دے رہی ہو۔“

”جو تمہارے وجود میں سیتا نامی جن عورت رہتی ہے وہ میری بیٹی ہے اور ہم نے اس کو قسم دے رکھی تھی کہ وہ تمہارے پورے وجود پر اپنا قبضہ کر لے اور ہم سے ہر وہ غلط کام کروائے جس کا تمہارا رب اور رسول ناپسند کرتے ہیں اور تم بھی۔ ہم تمہیں ایک شرط پر تنگ نہیں کریں گے کہ تم ہمارے ہومان (رب) کو اپنا رب مان لو اور ہم نے چھوڑنا تو ویسے بھی آپ کو نہیں۔ بہتر ہے ہماری بات مان لو۔“

اس کے بعد مجھے اتنا یاد ہے کہ میرا سر جھکا اور وہیں اٹک گیا۔ میں نے بہت کوشش کی اپنی گردن کو سیدھا کرنے کی لیکن تکلیف اور خوف سے میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے چچا کے گھر میں چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔ وہاں سے گزرنے والے کچھ لوگ یہاں لے آئے تھے۔ پھر میری زندگی تھی اور

سیتا کی طرح طرح کی سزا میں اور دکھ جو شاید میرا مقدر بن چکی تھیں۔ ان سارے حالات سے تنگ آ کر ایک دن میں ایک مفتی صاحب کے پاس چلا گیا۔ ان سب حالات کے بارے میں تو میں نے مفتی صاحب کو اپنے ساتھ گزرنے والے ہر دکھ اور تکلیف کے بارے میں بتا دیا۔

میری آپ بیٹی سن کر مفتی صاحب ششدر رہ گئے اور میرے کاغذ سے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

”اللہ تم کو اپنی پناہ میں رکھے۔“ اور مجھے کچھ حدیث کا حوالہ دے کر کہا۔ ”تمہارا فی الحال اس میں کوئی جرم نہیں اگر ہے تو اللہ معاف کرے تم یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنی طاقت سے ایسا کرنے کے لیے تمہارا دماغ اور جسم استعمال کرتے تھے اور بعد میں تمہارے دماغ میں یہ خیال ڈال دیتے کہ یہ سب تم اپنی مرضی سے کر رہے ہو اور تمہارا جسم تو ان کے قبضے میں تھا۔ ہر وقت وہ تمہارے بڑے دشمن تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ تم قرآن اور نماز پڑھو اور ان کے سامنے اللہ رسول کا نام لو کیونکہ جب تم قرآن اور نماز پڑھتے تھے تو ان کو ان چیزوں سے تکلیف ہوتی تھی اور پھر گستاخانہ لفظ بولتے تھے۔

اب نیکی کرنا تمہارے بس میں نہیں تو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں اللہ آپ کو معاف کرے گا وہ چاہتے تھے کہ تم بھی ان کے مذہب میں شامل ہو کر کافر ہو جاؤ لیکن اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہارا ایمان مضبوط تھا اللہ نے تمہارے ایمان کی حفاظت کی۔“

مفتی صاحب خاموش ہوئے تو میں انہیں خدا حافظ کہتا ہوا واپس لوٹ آیا اور اپنے ساتھ ہونے والے آئندہ ظلم و ستم سے اللہ کی پناہ مانگنے لگا۔

ساتھیو! یہ بالکل سچے لفظ ہیں جو ایک کہانی کی صورت میں آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں۔ اللہ سے ہمیشہ دعا کریں کہ وہ ہمیں ایسی شر مخلوق سے اپنی پناہ میں رکھے، آمین۔ عابد کا جسم اب بھی سیتا کی قید میں ہے۔ آپ بھی دعا کریں کہ مالک عابد کو اس گندی آتما سے جلد چھٹکارا نصب فرما دے۔

☆☆☆



WWW.PAKSOCIETY.COM

VICTIM کون؟

ماہ دش طالب

اُس فاعدان کی کہانی جس میں کوئی کمین ہا جان پایا کہ شیطان آخر کس شخص میں سرایت کر گیا ہے

کو اسکول کے لیے تیار کیا اور فیکٹری جانے سے پہلے اسے اسکول ڈراپ کیا۔ عفان جس روز دیر سے آفس جاتے، نینا کو اسکول چھوڑنے اور لینے کی ذمہ داری انہی کی ہوتی۔ شام میں نینا کو ہوم ورک کراتے ہوئے اس نے اس کی ڈائری چیک کی تو اس کا پیغام پڑھ کر چونک گئی۔

”سنز جہانگیر! میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کی نیچر کو کوئی حل نظر نہیں آیا تو آپ کو بلوانا پڑا۔“

”نہیں کوئی بات نہیں آپ بتائیے۔ کیا نینا نے کوئی بد تمیزی کی ہے۔“ وہ تفکر آمیز لہجے میں بولی۔
”ارے نہیں آپ کی بیٹی تو بہت پیار کرنے والی تمیز دار ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ.....“ پرنسپل بات کرتے ہوئے لحظہ بھر کور کی اور پاس کھڑی مس شائشہ کی جانب دیکھا۔

”اس کی مس نے اکثر و بیشتر اسے باتیں کرتے دیکھا ہے خود ہے۔ صرف یہ زیادہ قابل حیرت بات نہ ہوتی اگر.....“ پرنسپل اور مس شائشہ اسے جیسے جیسے بتا

سیاہ آسمان پر اکاؤ کا ستارے غم غم کر رہے تھے، صحن میں لگے دیو قامت نیم کے پیر کی شاخیں اور دیواریوں میں چھپے بھینگروں کی آوازیں سنائے میں سہا رہی تھیں۔ وہ چار پائی پر آنکھیں موندے چیت لیٹی تھی۔ اچانک ایک جہاز بالکل اس کے سر کے اوپر مشرق سے اور دوسرا مغرب سے آیا۔ کان کے پردے چیر دینے والی آوازوں کے ساتھ وہ ایک دوسرے سے ٹکرائے، یکا یک منظر بدلا۔ چادر اوپر لینے کو اس نے ٹانگوں کی جانب ذرا سا ہاتھ بڑھایا تو چار پائی کے نیچے سے کسی نے اس کی بائیں ٹانگ چھنی۔ ”آ آ آ.....“ دبی، سہمی چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اپنی ٹانگوں کی جانب دیکھا تو بستر پر کوئی چادر نہ تھی۔ چہرہ پسینے سے تر ہر تھا۔ وہ فوراً بھاگ کر اندر کمرے کی جانب لپکی۔ ای اور بابا خراٹے لیتے گہری نیند سو رہے تھے۔ اسے بچپن سے ہی جہازوں سے ڈر لگتا تھا۔

☆.....☆

بیسن کی نکلیا کی مانند زرد آفتاب اپنی توانائی اہل زمین کو سونپنے کو تیار تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی بیٹی نینا

رہی تھیں اس کا تخیل دیکھنے ویسے تیز ہو رہا تھا۔ گزشتہ دو ماہ کے واقعات اسے یاد آئے گئے جو حقیقتاً غیر معمولی تھے۔

☆.....☆

”مما میرا لچ باکس؟“ بارہ سالہ نینا اسکول کے لیے تیار ہوئی اور ڈائمنگ نیبل کے پاس آرکی۔
 ”نینا! یہ کیسا نشان ہے اوھر دکھاؤ ذرا۔“ پانی کی بوتل اور ٹفن اس کے بیگ میں رکھتے ہوئے اس کے

سرمرا رہا تھا۔
 اس نے چاروں اطراف نظر دوڑا کر دوبارہ شیشے میں دیکھا تو دل ڈوب کر ابھرا تھا جیسے کوئی تیزی سے اس کے پیچھے سے گزرا۔ اس نے مڑ کر



دیکھا..... اور..... پھر.....“ اور پھر اطمینان بھری سانس خارج کی۔ ماما دودھ کا گلاس لیے آرہی تھیں۔
 ”بابا سو گئے؟“

”ابھی کہاں، جب تک ایک آدھ کتاب نہ چاٹ لیں خیند تو آتی نہیں۔“ وہ اس کے ساتھ بیڈ پر ٹک گئیں۔

”یہ تو ہے..... آج کتنا انجوائے کیا ناں، بھوپو بھی کتنی خوش ہیں آج۔“ وہ دودھ پیتے ہوئے بوٹی رہی

کالر کے پاس گردن کے قریب سرخ گول دائرے نما دھبے کو دیکھ کر وہ ٹھکی۔

”یہ..... پتا نہیں، صبح اٹھی تو گردن پر یہ بنا ہوا تھا۔ مجھ نے یا کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہوگا۔ میں آ کر کوئی کریم لگا لوں گی اب چلیں۔“ وہ لاپرواہی سے کہتی گیراج کی جانب بڑھی۔

ویک اینڈ پر عرفان جہانگیر نندا اور نینا پکنک کے لیے ہاکس بے گئے راستے میں بڑی بھوپو کو بھی پکنا کر لیا۔

”ہاں..... بالکل! چلو اب تم جلدی سے سو جاؤ کل تمہاری پیرنٹ ٹیچر میننگ بھی ہے۔“
”جی بس سونے ہی والی تھی۔ آئی ایم ویری ایکسائینڈ اباؤٹ ٹو مارو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
”ہم م..... انشاء اللہ..... او کے شب بخیر بیٹا۔“
”گڈ نائٹ ماما۔“ اس نے کمرے میں اڑھا۔ ندا کے جانے کے تیس سیکنڈ بعد تک دروازہ چہچہاتا رہا۔ وہ گہری نیند سو چکی تھی۔

☆.....☆

”جہانگیر آج آپ نینا کو چھوڑ آئیے گا اسکول اور واپسی پر رازش بھی خریدنا ہے۔ میں حمیدہ کے ساتھ مل کر صفائی کرواؤں گی۔“ وہ ناشتے کے برتن سمیٹ رہی تھی۔
”او کے باس..... نینا بیٹی..... کم آن سوئی ہری اپ!“ عفان کڑی سے اٹھتے ہوئے بولے۔ ان کے جانے کے بعد ندا نے نینا کے کمرے سے آواز کیا۔ بکھرا ہوا سامان سمیٹا تھا۔ پروے، فٹ میٹ وغیرہ نکالنے لگے تھے۔

”حمیدہ جاؤ یہ شیشیا اور نو تھ پیسٹ اوپر ہاتھ روم میں رکھ آؤ۔“
”اچھا باجی۔“ کچھ دیر بعد وہ پھولی سانسوں سمیت ہاتھ میں بیڈ شیٹ اور ٹیکوں کے غلاف وغیرہ لیے واپس آئی۔

”باجی..... با..... جی۔“ وہ ڈرامائی وقفہ دے رہی تھی۔

”کیا ہے بول بھی چکو۔“ ندا اکتائی۔
”باجی، نینا بیٹی کے ہاتھ روم کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں۔“

”ٹوٹے ہوئے ہیں کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوئی اور پھر اوپر جا کر خود دیکھا۔

”حد کرتی ہو..... حمیدہ اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ ٹوٹ گیا ہوگا۔ ہنومیں گروں گی خود صفائی، تم نیچے کے کمرے دیکھ۔“ ندا اس کے اس تھڑدل سینے سے بہت جڑی تھی۔ حمیدہ نیچے آکر بھی

کافی دینک کاٹتے رہی۔
”نہ جانے کیوں بیگم صاحبہ کو وہ خون کے چھینے نظر نہیں آئے یا شاید میرا ہی وہم ہوگا۔“ بمشکل ڈرگو جھٹکتے ہوئے اس نے اپنی توجہ کام کی جانب مبذول کی۔
اگلی صبح غیر معمولی تھی۔

”نینا! یہ کیا ہے؟“ اس کے دونوں بازوؤں، گردن اور چہرے پر سرخ دھبوں کی بہتات تھی۔
”کیا ہوا ماما؟“ وہ ایک بار پھر لاپرواہی سے بولی۔

”یہ داغ..... کیا الرجی ہے تم نے جراثیم کش دوا نہیں لگائی تھی۔“
”اوہ ماما..... یاد نہیں رہا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ٹیک ہو جائیں گے۔“ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہوئے تھے۔

”نہیں تم ابھی چلو میرے ساتھ۔ کتنا برا حال ہو گیا ہے ایک ہی رات میں۔ مسئلہ بڑھ نہ جائے۔“ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ اسے ساتھ والے کیننگ لے گئی۔

ڈاکٹر سامیہ نے الرجی کی کریم لکھ کر دی تھی۔
”کہا تھا نا کوئی مسئلہ نہیں۔“ گھر آکر وہ جتاتے ہوئے بولی۔ شولڈر کٹ بال، ٹیکھی ناک اور گہری براؤن آنکھیں وہ بے حد مقصوم اور پرکشش تھی۔ ندا اسے دیکھ کر پیار سے مسکرا دی۔
”اچھا جی۔ کنفرم ہو گیا میری بھی تسلی ہو گئی۔“

”اچھا ماما میں اپنے روم میں پڑھنے جا رہی ہوں۔ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔“ وہ کہتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں پار کر گئی۔

☆.....☆

رات کا اندھیرا ہولے ہولے سناٹا پھیلا رہا تھا۔ تیز آندھی کے سچ بتی بھی چلی گئی۔ کتے کے بھونکنے کبھی بائی کی میاؤں کی آواز چوٹکا دیت۔ دور یا قریب کہیں بارش ہوئی تھی شاید۔

”کہاں سے آئی ہو تم؟ تم مجھے بالکل پسند نہیں..... چلی جاؤ.....“ جیمن سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔

”اگلے دن سب ضروری جگہوں پر نئے شیشے ڈلوائے گئے۔ نینا کے کمرے کی باری آئی تو وہ اندر سے لاکڈ تھا اور چابی کہیں نہ ملی۔ خود نینا اس وقت اسکول میں تھی۔

☆.....☆

”صرف یہی نہیں مسز جہانگیر اس نے اسکول کے ہاتھ رومز کے شیشے توڑ دیئے ہیں۔ ہمیں پتا نہ چلتا کہ یہ کام اسی کا ہے اگرچہ اسی اسے ایک ہفتہ پہلے ہاتھ روم سے زخمی ہاتھ لیے نکلتے نہ دیکھتا۔“ وہ مس شائستہ کے ساتھ اب گرافنڈ میں آگئی جہاں پیری کے خوفناک ورخت کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ کچھ لمحے بل نینا نے نظر اٹھا کر بڑی سی شاخ کی جانب دیکھا اور مسکرائی۔ پھر ایڑیوں کے بل اونچا ہوئی اور ہاتھ بڑھا کر شاخ کو لگا۔ جیسے کسی سے ہاتھ ملا رہی ہو۔ ندا کو یاد تھا جب ہاتھ پیر پی باندھے وہ گھر آئی تھی اور ندا کے پوچھنے پر اس نے یہ کہہ کر دیا کہ کلاس فیلو کے ہاتھ سے بلیڈ لگ گئی۔

”آپ بچل سے کام لیں۔ کسی سائیکا ٹرسٹ کو چیک کروائیں۔ جو ہی مسئلہ ہوگا سامنے آجائے گا۔“ مس شائستہ کہتے ہوئے انشاف روم کی جانب چلی گئی۔ ندا نے گھر آکر بیماری صورت حال عرفان کو بتائی۔ بات ناقابل یقین تھی۔ عرفان کا خیال تھا پہلے کسی ماہر نفسیات کو چیک کرانا چاہیے مگر ندا نے فیصلہ کر لیا تھا اس کے گاؤں میں جو حکیم بی بی رہتی ہیں، ان سے رجوع کرے گی۔ اس سے بھی پہلے ان دونوں نے نینا سے براہ راست بات کرنے کی کوشش کی مگر نینا ہاتھ ہی نہیں آرہی تھی۔ اس کا انداز اور رویہ بالکل نارمل ہو گیا۔ اس کے کمرے کے شیشے بھی لگ چکے تھے اور پھر دنوں تک سب کچھ نارمل ہی رہا۔ وہ پہلے کی طرح گھر میں ماما بابا کے ساتھ کھیلتی دھیان سے پڑھائی کرتی مگر پھر ایک شام..... جب ندا اسے جگانے کے لیے اوپر اس کے کمرے میں گئی تو ٹھٹھک کر دروازے پر ہی رک گئی۔

”اے ٹھٹھک! بے ہوش ہمارے ساتھ کھیل بھی لیا

دور اثر سے پر دستک دینے کے بعد ندا اندر داخل ہوئی۔

”ارے سوئی نہیں بیٹا ابھی تک؟ بتی بجھا دو، یو پی ایس ٹرپ ہو جائے گا۔“

”جی ماما بس..... لائٹ ہی بند کرنے کے لیے ابھی تھی۔ دودھ مجھے پکڑا دیں۔ آپ لائٹ آف کر جائے گا۔“ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر گلاس پکڑ لیا۔ کچھ دیر بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ ماما نیچے چلی گئی ہیں تو اس نے لائٹ دوبارہ آن کی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے سے چادر ہٹائی۔ ٹوٹے ہوئے شیشے میں نینا کا بکھرا ہوا عکس نظر آ رہا تھا۔

☆.....☆

ندا کچھ دنوں سے نوٹ کر رہی تھی نینا کا عجیب و غریب رویہ۔ وہ پہلے کی طرح فریش نہیں رہتی تھی۔ نہ ہی شام کا وقت ماما اور بابا کے ساتھ گزارتی تھی۔ بلکہ کترائی کترائی پھرتی رہتی تھی۔ عرفان سے ذکر کیا تو انہوں نے یہ تسلی دے کر نال دیا کہ پڑھائی کی مصروفیت ہوگی۔

اگلے ہفتے دو تینوں ان کی طرف گئے۔ نینا کے چہرے پر نشانات قدرے ملے ہوئے تھے مگر پوری طرح ختم نہ ہوئے۔ دانیہ، مریم کے ساتھ اس نے کافی اچھا وقت گزارا، ندا کی پریشانی بھی رفع ہو گئی۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد نشانات پھر سے کمرے ہو گئے۔

ندا نے فیکٹری سے چھٹی کی تھی۔ لہذا عرفان کے ساتھ نینا اسکول گئی تھی۔ ندا بے فکری کی نیند لے کر ابھی تھی تو پورے گھر کا بکھرا حال دیکھ کر بری طرح ہنسی۔ گھر کے تمام شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ہاتھ رومز، صحن، بیڈ روم، سب میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ پریشانی سی پریشانی، حیرت صد حیرت، آج حمیدہ بھی نہیں آئی تھی۔ معذ کیا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکی۔ عرفان کو پتا چلا تو بولے۔

”اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے بھاری ٹریفک کے گزرنے سے ترک گئے ہوں۔ میں کل ہی مسٹری ولواؤں کا نئے شیشے لگا رہے گا۔“

کروں گی اور مجھے ہر بھی نہیں ملے گا۔ کیوں کہ اندھیرے میں تم مجھے شیشے میں نظر بھی نہیں آسکو گی لیکن ماما اگر پتا چل..... شی.....

ندا کے پیروں تلے سے زمین نکلی تھی۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور حیرت کی انتہا نہ رہی۔ نینا اسڈی ٹیبل پر کتابیں بکھیرے پڑھ رہی تھی۔ اس نے کمرے کے اطراف میں دیکھا لائٹ آن تھی۔ آئینہ سلامت تھا۔ ہر شے سلیقے سے رکھی تھی۔
 ”کیا ہوا ماما؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

”آپا..... کچھ نہیں..... جب پڑھ لو تو نیچے آ جانا۔ میں نے نکلنے بنائے ہیں۔“

”اوکے۔“ ندا کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہر شے سمجھنے سے باہر تھی یا شاید سمجھ آنے لگی تھی مگر وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

☆.....☆

اگلے ہی دن انہیں نے حکیم بی بی کو بلوایا۔ پینتیس چالیس سال کے لگ بھگ کی چہرے پر نور لیے حکیم بی بی جیسے ہی گھر کے بیرونی دروازے سے داخل ہوئیں۔ ندا، نینا اور عفان کی جانب دیکھ کر ان کا سر چکرا گیا۔ ہر شخص خود پر قابو پائی وہ آگے بڑھیں۔ ندا اور پھر عفان نے انہیں نینا اور گھر میں ہونے والی گاہے بگاہے تبدیلیوں سے آگاہ کیا اور یہ بھی کہ ہر رات کے دوسرے پہر کسی آہٹ کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ نینا اس دوران ایک سو برہنہ بنی ہوئی تھی۔

ان کے گھر رہتے ہوئے حکیم بی بی نے غور کیا تھا تنہائی میں نینا ان کے سامنے آنے سے کترات تھی۔ چہرے پر نشان مدھم ہو گئے تھے۔ البتہ باقی جسم پر جوں کے توں تھے۔

یہ ایک سنائے والی تپتی دو پہر تھی۔ ندا اور عفان جب گھر لوٹے تو حکیم بی بی کسی وظیفے میں مشغول تھیں۔

”پہلے مجھے لگا کہ اس گھر میں سایہ ہے۔“ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انھوں نے بات شروع کی۔

”اس دن جب میں گھر میں داخل ہوئی تو تمہارے پیچھے سے کوئی ہولہ ہوا تھا۔“ وہ عفان کی جانب دیکھتے

”مسلکہ تم تینوں میں سے کسی کے ساتھ ہے۔“ اب کی بار انہوں نے دھماکا کیا۔

”کیا؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ ندا اور پھر عفان دنگ رہ گئے۔

”آپ جانیے یہاں ہے، ہم کسی ڈرائنگ روم سے چیک کروائیں گے اپنی بی بی کو، آپ تو انتہائی ناقابل یقین بات کر رہی ہیں۔“ عفان عیش سے بولتا ہوا صوفے سے اٹھ گیا۔

”خو حقیقت ہے مینا وہی بتا رہی ہوں۔ آپ انہیں بند کرنے سے خطرہ مل نہیں جاتا۔ البتہ آنکھوں کے آگے اندھیرا ضرور چھا جاتا ہے۔“ وہ سپاٹ انداز میں بولیں۔

”اور ایک اہم بات..... Victim جانتا ہے کہ وہ شکار Haunted ہے۔“

”اچھا تو پھر آپ ہی بتائیے کہ کون ہے وہ؟“ ندا کی آواز کنویں میں سے آئی محسوس ہوئی۔

”میں کچھ نہیں جانتا..... آپ برائے مہربانی تشریف لیے جانیے۔“ عفان بدل لحاظ ہوا۔

”ٹھیک ہے مینا جیسے تم چاہو۔“

ان کے جانے کے گھنٹوں بعد تک وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں نہ ملا سکے۔

”ماما..... آئی چلی گئیں؟“

”ہاں مینا۔“

”شکر ہے مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں۔ عجیب طرح سے دیکھتی رہتی تھیں مجھے۔“ نینا ریلیکس لگ رہی تھی۔

”ہم ماما اس لیے ہم نے بھیج دیا انہیں، چلو بیٹھیں گی ایک حکیم لگائے ہیں لیکن کوئی ماحول میں

ہوئی۔

”جی بی بی..... مجھے کیا ہونا تھا۔“ اس کے برعکس وہ لاپرواہی سے بولی اور نیچے چلی گئی۔ حکیم بی بی کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال بچھ گیا۔

دو دن سے ندافیکٹری نہیں جا رہی تھی۔ گھر کی فضا میں کچھ تناؤ سا گھلا تھا۔ حکیم بی بی بدستور وظائف میں مشغول تھیں۔ البتہ عفان کی روٹین نارمل تھی۔ تیسرے دن نینا کو اسکول سے پک کرتے ہوئے وہ واپس گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے گراؤنڈ کی جانب چلی آئی۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے اس کے سامنے کھڑی رہی۔ ندا بے تاب اور مضطرب نظر آرہی تھی۔ پیری کے درخت کی بڑی سی شاخ پر رسی بندھا کوئی بد ہیئت وجود لگا تھا اور ندا اس بات پر غور کر رہی تھی۔ اس نے اپنا دایاں بازو آنکھوں کے سامنے کیا جس پر لال دائرے نما دھبے اور خراشیں نظر آرہی تھیں۔ اس کے ذہن میں فلیش بیک چلا تھا۔ تین دن پہلے وہ مضطرب مضطرب سی نینا کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ اس کے بستر پر چت لیٹی تھی۔ جب کسی بدروح نے اس پر جھپٹا مارا۔ اپنے لمبے ناخن اس نے ندا کے بازوؤں پر گاز دیے۔ وہ خوف اور درد سے چیختی تھی اور اچانک پھر اس بدروح نے خون بھری قے ندا کے منہ میں اٹھیلی۔ چند لمحوں بعد حکیم بی بی کمرے میں آئیں تب تک ندا سنبھل چکی تھی۔

”مما چلیں نا۔“ نینا بیزاری سے بولی۔

”ٹھیک ہے بیٹا چلتے ہیں۔ پہلے بتاؤ تمہیں اس درخت پر کچھ نظر آ رہا ہے؟“ ندا نے سکون سے کہتے ہوئے آخر میں پوچھا۔

”نہیں، یہ درخت تو بالکل خالی ہے۔“

”اچھا..... چلو پھر چلیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے

بولی۔

”تمہاری کمر پر جو دھبے تھے ختم ہو گئے نا؟“

بیرونی دروازہ پار کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”جی ہاں وہ لکڑی کے پتلے بننے ہی ختم ہو گئے تھے۔“ وہ

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب آہٹ سے عفان جہانگیر کی آنکھ کھلی۔ اس نے لیپ روشن کیا کھڑی کے پاس سے آوازیں آرہی تھیں۔ گھر کی باہر کو کھولتے ہوئے ایک تاسف بھری آہ اس نے خارج کی۔ ایک کبوتر مردہ حالت میں پڑا تھا اور پانچ چھ کبوتر اس کے گرد گھومتے شور مچا رہے تھے۔ کھڑکی بند کر کے وہ واپس اپنے بستر پر آ گیا۔

”ایک نظر دائیں طرف لیٹی ندا پر ڈالی۔ ہتی بجھائی۔ ساری رات آنکھوں میں جلن اور ذہن میں پریشانی لیے کٹی تھی۔

☆.....☆

مطلع ابر آلود ہو رہا تھا۔ لگتا تھا آندھی اب آئی کہ تب۔ ڈاکٹر زینا کی چھوٹیں سمجھنے سے قاصر تھیں۔ جگ آکر بہت سوچ بچار کے بعد عفان نے حکیم بی بی کو دوبارہ بلوایا کہ جو بھی تھا ان کے آنے سے گھر میں ایک غیر معمولی سا سکون محسوس ہوتا تھا۔ وہ اب ہر طرح کے نتائج سمجھنے کے لیے تیار تھا۔

”میں نہیں جانتی کہ Victim کون ہے۔ اس کے لیے مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔“ ہنر شیفون کے دوپٹے کو حجاب کی مانند سر پر لپیٹے وہ نرم لہجے میں گویا ہوئیں اور پھر کچھ ہی دنوں بعد جب وہ اگلے کپڑے تار پر لٹکے تھے۔ ندا نہ جانے کہاں تھی ہوا جس محسوس ہو رہا تھا، بارش کے آثار تھے۔ لہذا حکیم بی بی جلدی سے لان میں تار سے کپڑے اتارنے آئیں۔ کپڑے اتارتے ہوئے وہ چونکی تھیں۔ کالے بادل کا کٹڑا عین ان کے سر پر آ کر ٹپک گیا۔ ایک سنساہٹ سی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ آخر سفید دوپٹے کو تار پر سے اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو یکایک دوپٹہ ہوا میں بلند ہوتا اڑا۔ دھیرے دھیرے وہ کسی وجود کی شکل اختیار کر گیا۔ وہ پہنچ سے دور ہوتا اوپر والے کمرے کی کھڑکی سے نکل کر غائب ہو گیا۔

”نینا! حکیم بی بی چیختے ہوئے اندر کی جانب بھاگیں اور کچھ ہی لمحوں بعد نینا کے کمرے پر کا منظر بدلا

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤلز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے ایچ پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

سادگی ہے بولی۔ البتہ جہاز اور جواب ہے ورنہ نہیں چھڑا تھا اس نے۔ "عفان ماضی میں چلا گیا۔

"ابھی کہاں ہے وہ۔" حکیم بی بی کو فکر ہوئی جب کہ عفان کے چہرے کے تاثرات سمجھ کر وہ دونوں تیزی سے باہر بھاگے۔

"اوہ نو۔"

"نیکسی رکواؤ جلدی سے۔" اسکول پہنچے تو پتا چلا بیگم صاحبہ ایک گھنٹہ پہلے اسے لے کر جا چکی ہیں۔ "فون کرو جلدی۔" وہ لوگ واپس نیکسی میں بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا؟" ازی رنگت لیے عفان کی جانب دیکھ کر انھوں نے پوچھا۔ "فون نہیں اٹھا رہی۔ بلکہ اب تو نمبر بھی بند جا رہا ہے۔"

"اف! بالی خیر۔" ٹریفک جام کو چیرتے نیکسی ڈرائیور کو پیچھے پیچ کر رزرتے ہاتھوں سے ڈرائیونگ کرتا عفان گھر پہنچا تو بیرونی گیٹ کھلا دیکھ کر بری طرح وہ دونوں غصے۔ لان میں لگا واحد نیم کا پیڑ پہلے کسی اتنا بھیاٹک نہ لگا تھا جتنا کہ اب۔ اس کی ایک شاخ پر رسی بندھی تھی جس پر ہاتھ سے چاروئی کا پتلا لٹک رہا تھا۔ "نینا۔" عفان نے جھپٹتے ہوئے اسے پکارا اور اندر بھاگا۔

"عفان آپ آگئے؟" پکار پر نداؤڑانگ روم میں آئی تو وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ "کیا ہوا۔" ندا پچھتے ہوئے سے بولی۔ "نینا کہاں ہے؟" وہ درشتی سے بولا۔ "ریٹیکس۔" اس کے برعکس ہوا پر داسی تھی۔ "میں پوچھ رہا ہوں نینا کہاں ہے؟" "آرام سے عفان بیٹا۔" حکیم بی بی نے معاملہ سنبھالنا چاہا۔

"وہ تو نہیں ہے۔"

"کیا مطلب..... یو....."

"ندا بیٹا محل سے بتاؤ۔ نینا کہاں ہے۔"

"آپ دونوں اتنے حواس باختہ کیوں ہیں۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"نینا۔" ندا بیٹا "وہ بے تالی سے پکارتا زینہ

"مما کیا ہم گھر نہیں جا رہے؟" انجان راستے پر گاڑی دیکھ کر نینا نے سوال کیا اور جواباً وہ محض مسکرا کر اتنا بولی۔ "کون سا گھر....."

☆.....☆

"عفان بیٹا..... ندا..... تمہاری بیوی نارمل نہیں ہے۔ وہ Huanted ہے۔ شیطان اس کے اندر سرایت کر گیا ہے جو اسے اپنی ہی اولاد کو مارنے پر اکسا رہا ہے۔" حکیم بی بی کے انکشاف پر عفان کو لگا کمرے کی ساری دیواریں اس پر آن گری ہوں۔ "آپ کیا کہہ رہی ہیں..... میں....."

خاموشی سے میری بات سنو۔" انہوں نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ "کیا کبھی..... میرا مطلب ہے بچپن میں اس پر کوئی سیار با؟" حکیم بی بی کے سوال پر عفان سانسے میں آ گیا۔

"عفان کیا میں تمہاری خاموشی کا مطلب ہاں سمجھوں؟" اس کے جواب نہ دینے پر انہوں نے اصرار کیا اور پھر عفان نے جو تفصیل بتائی حکیم بی بی تو پریشان نہیں مگر ساتھ ہی ان کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے کافی تھی۔

"اسے شروع ہی سے برے خواب آتے تھے۔ بڑے بڑے جہازوں کو ایک دوسرے سے ٹکراتے دیکھتی تو چیخ کر اٹھ بیٹھتی۔ وہ میری تائیا زاد ہے۔ اس لیے ان حالات سے میں ناواقف نہ تھا۔ خواب میں وہ اکثر اپنے گھر کے صحن خصوصاً نیم کے درخت کے گرد ہوائی مخلوقوں کو کھومتے دیکھتی اور پھر باقی ساری ساری رات سو نہ پاتی۔ جہازوں کا ڈراتا بیٹھ چکا تھا کہ حقیقت میں جب کوئی جہاز آسمان پر اڑتا دیکھتی تو آنکھیں بند کر لیتی اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ پھر یوں ہونے لگا کہ وہ نیند میں اکثر اٹھ کر درخت کے گرو چکر لگانے لگتی۔ کمرے میں بیٹھی خود سے یا پھر شاید کسی نادیدہ مخلوق سے باتیں کرنے لگتی۔ محلے کے پیر صاحب جو حکیم بھی تھے سے علاج کروایا، دم درود کروائے گئے تو پھر بھی عرصے میں سب ٹھیک ہو

پار کر گیا۔ میں تمہیں جان اسے ماروں گا، کیا کہنا ہے میری بیٹی کے ساتھ۔“ مکھوں بعد وہ واپس آیا تو زبان سے بولنے سے انکار کر دیا۔ بیروں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔

”ہائے بابا۔“ نینا بیدروم سے باہر آئی۔

”نینا بیٹی، میری چندا۔“ عفان اس کی جانب لپکا۔

”میں ٹھیک ہوں بابا۔ میں اور ماما واپسی پر آنس کریم کھانے چلے گئے تھے۔ اس لیے دیر ہو گئی۔“ عفان نے حیرت سے پہلے ندا اور پھر حکیم بی بی کی جانب دیکھا۔ ندا روئی صورت لے کر کمرے میں چلی گئی۔

”دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ ندا۔۔۔۔۔ نینا بیٹی دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ میں ہوں آپ کا بابا۔“ دروازہ کھل کے نہیں دے رہا تھا۔ نیچے حکیم بی بی نہ جانے کس کھوج میں تھیں۔

”وہڑ دھڑ۔“ دھماکے کی آواز سے دروازہ کھلا اور ندا

اپنے وحشی پن کے ساتھ نینا کو مارنے کے لیے دوڑے

تھی۔ میرے قریب مت آنا۔ ورنہ تمہیں بھی نہیں چھوڑ

دوں گی۔“ وہ چاقو ہاتھ میں لیے کھڑی تھی جب کہ نینا

الٹاری میں ٹھس کر چھینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور پھر

ایک نندا نے نینا پر حملہ کیا مگر اس سے پہلے کہ چاقو کا وار

کار ثابت ہوتا۔ نیچے سے آئی زبرداری آواز میں ندا کو

رکنے اور پھر پیچھے پر مجبور کر گئیں۔ عفان نے غور کیا تو نو

کوئی ایئر کریشن کی ڈاکو منٹری لگتی تھی۔ دھماکے دار

آدازیں سن کر ندائے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ عفان

کو صورت حال سمجھ آ گئی۔ اسے میں حکیم بی بی اور پر آنس

اور تیزی سے ندا کو پکڑ کر رسی کے ساتھ باندھ دیا۔ ندا چیختی

رہی، مغلظات بکتی رہی مگر جیسے ہی حکیم بی بی نے تلاوت

قرآن شروع کی، ندا کے اندر کا شیطان و بک کر نکل گیا۔

اس سارے معاملے کو سنبھالنے میں سانٹھ منٹ

لگے تھے۔ عفان اور نینا بھی اپنی لرزش پر قابو پاتے وضو

کر آئے۔ وہ ساری رات ندا، عفان، جہانگیر نے کرسی

پر بندھے گزار دی تھی جب کہ عفان اور نینا نے جائے

نماز پر حکیم بی بی نے مختلف وظائف پڑھنا جاری رکھا۔

اکلی صبح چمک دار تھی۔ سورج کی زردی نائل کرنوں

نے ندا کے جسم پر پڑے لال دھبوں کو دفع کر دیا۔

”مجھے معاف کر دینا میری جان سے پیاری

بیٹی۔“ ندائے نینا کو گلے لگا لیا۔ عفان نے دونوں کے

گردن پر ہاتھ رکھ کر دیا۔

حکیم بی بی آپ نے خواہوا اتنی سراسیمگی

پھیلائی۔“ عفان، حکیم بی بی پر ناراض ہو رہا تھا۔ جو اب

وہ سر جھکائے خاموشی سے ٹیسٹ روم میں چلی گئیں۔

پھر عفان کے منائے بغیر ہی ندا مان گئی۔ گھر کا ماحول

پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ پرسکون اور ہلکا بھلکا۔ حکیم بی بی کو

اپنی موجودگی غیر ضروری لگنے لگی سواٹھوں نے واپسی

کے لیے تیاری شروع کر دی مگر قدرت کو شاید حکیم بی بی

کی اس گھر میں ابھی مزید موجودگی منظور تھی۔

گزشتہ رات ہونے والی بارش کے اثرات ختم نہ

ہوئے تھے۔ بجلی ابھی بھی کڑک رہی تھی۔ وقفے وقفے

سے تیز ہوا کے ساتھ بارش بھی تیز ہوتی جاتی۔ رات کے

کسی پہر وہ کروٹ لینے کو کسمپاسا۔ تو بستر کی دوسری

جانب جگہ خالی تھی۔ ”ندابا تھ روم گئی ہوگی“ سوچ کر وہ

اطمینان سے سو گیا مگر اگلے پہر بھی جب کمرے میں سردی

برھنے لگی آہٹ مضطرب کرنے لگی تو وہ اٹھ بیٹھا۔

”چر۔۔۔۔۔ چر۔۔۔۔۔“ دروازہ ہلا تھا مگر ندا ہنوز

غائب تھی۔ اس نے بیڈ سے اتر کر کمرے کی بتی جلائی

اور باہر نکل آیا۔ ڈرائنگ روم ویران تھا وہ فوراً نینا کے

کمرے کی جانب بھاگا۔ دروازے پر رک کر اس کے

بدترین خدشات صحیح ثابت ہوئے۔ نینا وہی آواز میں

کسی سے باتیں کر رہی تھی اور مخاطب کون تھا؟ اس کی

تصدیق کرنے کے لیے عفان نے حکیم بی بی کو زحمت

دی۔ وہ دوپٹہ سر پر اوڑھتی جلدی سے اوپر آئیں۔ ندا

کے روپ میں بدروح اس سے بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

پراسرار فہرست سائنس کی سائنس کی کہانی

✓ رب کا انصاف

ممتاز احمد



اس شیطان مفت شخص کی کہانی جس نے رشتہ نہ ملنے پر کالے علم کا سہارا لے کر اپنا انتقام لیا مگر

صم بیٹھا تھا تو والدہ صاحبہ میرے کمرے میں آئیں تب ان کے استفسار پر ساری بات ان کے گوش گزار کی تو ای کہنے لگیں۔

”چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ تم جلدی سے موٹر سائیکل نکالو۔“

اگلے پندرہ منٹ کے بعد ہم ماں بیٹا عدنان کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ ڈور بیل بجائی تو فوراً عدنان نے گیٹ کھول دیا۔ جیسے ہی ہم گھر کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ عدنان کی بیوی خالدہ جس کے سر کے بال جھاڑ جھنکار ہوئے شانوں پر لہرا رہے تھے سر سے دوپٹہ غائب تھا۔ اس کی انگارے کی طرح سرخ آنکھیں تھیں جن سے وہ عدنان کو گھور رہی تھی اور منہ سے غوغا کی آوازیں نکال رہی تھی۔ پھر یکلخت اس نے جنونی انداز میں سر کو دائرے کی شکل میں پوری شدت سے گھمانا شروع کر دیا جس سے اس کے کھلے ہوئے بال بھی ہوا میں لہرانے لگے۔ ہم یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ امی کچھ کچھ معاملہ سمجھ گھٹیں انہوں نے

مجھے آفس سے گھر آئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ عدنان کی کال آگئی۔ وہ سخت گھبراہٹ میں بول رہا تھا اور مجھے اپنے گھر بلا رہا تھا۔ اس کی کال کے دوران شور کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ”عدنان خیر تو ہے؟“ اس پر وہ بولا کہ خیر نہیں ہے بس تم جلدی سے آ جاؤ اور ہاں بھابی کو ضرور ساتھ لے کر آنا۔“ میں نے کہا۔ ”یار عدنان کچھ تو بتاؤ معاملہ کیا ہے؟“

کہنے لگا۔ ”تم لوگ آؤ تو سہی سب بتا دوں گا۔“ پھر جلدی پہنچنے کی تاکید کے ساتھ ہی اس نے کال کاٹ دی۔ میں پریشان ہو گیا اور دل میں دعا کرنے لگا کہ خدا خیر کرے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اور عدنان ہنستے کھیلے آفس سے نکلے تھے۔ وہ بڑے پی پی موڈ میں اپنے گھر گیا تھا۔ اب پندرہ بیس منٹ کے بعد اس کا گھبراہٹ ہوئی آواز اور پریشانی میں کال کر کے اپنے گھر بلانا.....! یہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اب اتفاق سے میری بیوی نے گئی ہوئی تھی تو میں گہری سوچ میں گم



پر لے لیا اور واجبی ضرورت کے سامان سمیت رہائش اختیار کر لی۔

جس دن عدنان اپنی بیوی خالدہ کے ساتھ شہر میں شفٹ ہوا، ہم نے ان دونوں میاں بیوی کی دعوت کی تو اس طرح میری بیوی اور خالدہ دونوں سہیلیاں بن گئیں۔ اب ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ میری بیوی خالدہ کو زیادہ سے زیادہ ٹائم اور کمپنی دیتی ایک تو وہ نئی نویلی ذہن تھی، دوسرا وہ گاؤں کی رہنے والی تھی اور شہر میں پہلی بار آئی تھی تو اسے کسی قسم کی تنہائی کا احساس نہ ہو۔ پہلا مہینہ تو بڑے آرام سے ٹھیک ٹھاک گزرا پھر یوں ہونے لگا کہ خالدہ اکثر خلاؤں میں دیکھنے لگتی اور کافی دیر گم صم رہنے لگتی اور کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے ایک دم چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی ایسے لگتا جیسے ڈر گئی ہو مگر ان باتوں کا کسی نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا تھا۔

دو مہینے بعد میرے سب سے چھوٹے سالے کی شادی تھی تو میری ساس صاحبہ نے میری بیوی کو کچھ دن کے لیے شادی کی تیاری کے سلسلے میں بلایا تھا اس لیے

بسم اللہ، درود پاک اور آیت الکرسی پڑھ کر عدنان کی بیوی خالدہ پر پھونک ماری اور آگے بڑھ کر اس کے سر پر دوپٹہ اوڑھایا۔ اس کی حالت درست کی اور اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ عدنان کو پانی لانے کا کہا تو ای نے پانی کے گلاس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور گلاس خالدہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔

عدنان میرا نہ صرف کو لیگ تھا بلکہ بہت اچھا دوست بھی تھا۔ وہ ہمارے شہر سے پچیس کلومیٹر دور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ جب اس کو ملازمت ملی تو وہ روزانہ اپنے گاؤں سے آفس آیا جایا کرتا تھا۔ پانچ مہینے پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ ایک مہینہ وہ چھٹی پر رہا پھر موٹر سائیکل پر وہ گاؤں سے آفس آنے لگا چونکہ سخت سردی کا موسم تھا۔ صبح کے وقت گہری دھند ہوتی تھی جس کی وجہ سے موٹر سائیکل کی سواری بہت دشوار کام تھا۔ دوسرا وقت بر آفس پہنچنا بھی محال تھا۔ چنانچہ عدنان نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ اپنے گھر والوں اور بیوی کے صلاح مشورے سے شہر میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے

انہوں نے بہت دور ایک شہر میں رہنے والے ایک اللہ والے بزرگ جو کہ حقیقی اور پرہیزگار عبادت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ فی سبیل اللہ خدمت خلق کے جذبے کے تحت پریشان حال اور مصیبت کے مارے لوگوں کی مدد کرتے تھے تو میری بیوی نے اپنے بھائی کے ذریعے کسی طرح ان بزرگ کا رابطہ نمبر لے کر خالدہ کے حالات انہیں بتائے تو انہوں نے خالدہ کے ساتھ اس کی ماں کا نام پوچھا اور تھوڑے وقف کے بعد کہا کہ فوراً خالدہ کو اس کی ماں کے ہمراہ لے کر ان کے پاس پہنچیں۔ چنانچہ فوراً خالدہ کی ماں کو اطلاع دی گئی اور اگلے ہی دن صبح ایک ٹیکسی کروا کر عدنان نے اپنی ماں، خالدہ اور اس کی ماں کو ہمراہ ساتھ لے کر رخت سفر باندھا اور چار گھنٹے کی مسافت کے بعد ان بزرگ کے آستانے پر پہنچ گئے۔

انہوں نے پوچھا کہ خالدہ کی یہ حالت کب سے ہے تو عدنان نے بتایا کہ پندرہ سے بیس دن ہو گئے ہیں پھر انہوں نے خالدہ کی عدنان سے شادی کا پوچھا تو بتایا گیا کہ تین ماہ ہو گئے ہیں۔ پھر وہ بزرگ آنکھیں بند کر کے کسی گہری سوچ میں متفرق ہو گئے۔ دس منٹ کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں اور گویا ہوئے اور کہنے لگے کہ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے خالدہ کی ماں سے پوچھا کہ خالدہ کی عدنان سے شادی سے پہلے کوئی رشتہ خالدہ کے لیے آیا تھا؟ تو خالدہ کی ماں نے جواب دیا کہ آٹھ نو مہینے پہلے کی بات ہے کہ ایک پرویز نائی لڑکے کا رشتہ آیا تھا خالدہ کے لیے۔ ایک مہینہ تک بات چلتی رہی پھر خالدہ کے باپ نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔“

بزرگ نے بھی انداز میں سوال کیا کہ انکار کیا وجہ تھی؟ تو خالدہ کی ماں نے بتایا کہ ایک تو لڑکے کی عمر بہت زیادہ تھی، دوسرا اس کا چال چلن بھی ٹھیک نہیں تھا، تیسرا لڑکے کے کوئی ڈھنگ کا روزی کا ذریعہ نہ تھا اور چوتھا لڑکے کے گھر والوں نے بہت سی جھوٹی باتیں بتائی تھیں تو اس بنا پر خالدہ کے باپ نے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد عدنان کا رشتہ آیا جو کہ ہمیں بہت اچھے مناسبت اور مہوروں لگا تھا تو قبول کر لیا گیا

دو دن پہلے میری بیوی اپنے لیے جو کہ بچاؤ گلو میٹر اور ایک شہر میں تھا ایک ہفتے کے لیے وہاں گئی تھی۔ تو آج اچانک یہ واقعہ پیش آ گیا تھا۔

ہم کچھ دیر عدنان کے گھر بیٹھے رہے پھر عدنان سے کہا کہ خالدہ کو لے کر ہمارے ہاں آ جاؤ۔ اس طرح پوری رات خالدہ ہمارے گھر رہی۔ امی نے اسے اپنے گھر لے کر گیا اس پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ اس صورت حال سے عدنان بری طرح گھبرا گیا۔ اس نے خالدہ کو گاؤں لے جانے کی بجائے فون کر کے اپنی ماں اور بہن کو شہر بلا لیا تاکہ وہ اس کی دیکھ بھال کر سکیں مگر اب یہ ہونے لگا کہ خالدہ کی حالت دن بدن خراب ہونے لگی۔

عدنان ڈاکٹری علاج کے ساتھ ساتھ کئی آستانوں کے چکر بھی لگا چکا تھا مگر خالدہ کی حالت سنبھلنے یا بہتر ہونے کے بجائے دن بدن بگڑنے لگی۔ اب تو خالدہ اپنے کپڑے پھاڑ دیتی۔ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو جاتیں وہ منہ سے مغلظات کہنے لگتی۔ جو چیز اس کے ہاتھ میں آتی وہ توڑ دیتی۔ اسے زیادہ تر نیند کی دواؤں کے زیر اثر رکھا جاتا مگر جیسے ہی دوائی کا اثر ختم ہوتا خالدہ ہڈیاں کہنے لگتی۔ عدنان اور اس کی ماں خالدہ کو گاؤں میں لے کر نہیں جانا چاہتے تھے کیونکہ برادری ان کے بہت شریک اور بدخواہ تھے اس لیے انہوں نے خالدہ کی اس حالت کو پوشیدہ رکھا اور جس نے جو علاج بتایا وہ کرتے رہے مگر خالدہ کی حالت میں ذرا بھی بہتری نہ آئی۔

خالدہ پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ دن بدن اس کی حالت بگڑنے لگی۔ اس کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور وہ بہت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ عدنان اور اس کی ماں خالدہ کو لے کر کئی ہیروں، فقیروں کے ڈیرے پر لے گئے مگر اس کی حالت جوں کی توں رہی۔ میری بیوی بھی میکے سے واپس گھر آ چکی تھی۔ وہ بھی خالدہ کی اس حالت پر بہت متفکر تھی۔

کچھ دن گزرے تو میری بیوی کو یاد آیا کہ اس کے میکے میں ایک لڑکی کے ساتھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا تھا تو

مشہور کے مقبول ترین ناول

800/-	ایم اے راحت	جادو
300/-	شازیہ اعجاز شازی	تیری یادوں کے گلاب
500/-	غزالہ جلیل راؤ	کارنل کے بھول
500/-	غزالہ جلیل راؤ	دیا اور جگنو
500/-	غزالہ جلیل راؤ	اناتیل
500/-	فصیحہ آصف خان	جیون جھیل میں چاند کریم
500/-	فصیحہ آصف خان	عشق کا کوئی انت نہیں
500/-	عطیہ زاہرہ	سلگتی دھوپ کے صحرا
300/-	محمد سلیم اختر	یہ دیا بھنے نہ پائے
400/-	ایم اے راحت	وش کنیا
300/-	ایم اے راحت	درندہ
200/-	ایم اے راحت	تختی
200/-	ایم اے راحت	بھرم
400/-	خاقان ساجد	چیمپون
300/-	فاردوس انجم	دھواں
300/-	فاردوس انجم	دھڑکن
700/-	انوار صدیقی	درخشاں
400/-	اعجاز احمد نواب	آشیانہ
500/-	اعجاز احمد نواب	جزیرہ
999/-	اعجاز احمد نواب	ناگن

نواب سنز پبلی کیشنز

1/92، کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ

کمپنی چوک راولپنڈی 051-5555275 Ph:

لکھاری، ہمیں اپنا ناول شائع

کروانے کے لیے رابطہ کریں

0333-5202706

سچی کہانیاں 109

اور جلد ہی شادی ہو کر دی۔
بزرگ نے پوچھا کہ خالدہ کا باپ کدھر ہے۔ تو
خالدہ کی ماں نے ایک ٹھنڈی آدھ بھر کر کہا۔
”محترم وہ تو پچھلے ایک ماہ سے اسپتال میں ہیں۔
ڈاکٹر ابھی تک ان کا مرض معلوم نہیں کر سکے۔ پہلے
خالدہ کے باپ کی پریشانی تھی۔ اب خالدہ کے ساتھ یہ
بات ہو گئی ہے کہ میری ایک بی بی ہے۔ جس کا بڑے
چاؤ سے بیاہ کیا ہے۔ اب اس کی یہ حالت ہو گئی ہے
دوسرا اس کا باپ اسپتال میں ہے۔ میری تو راتوں کی
نیندیں اڑ گئی ہیں کیا کروں کہاں جاؤں؟“
تو بزرگ کہنے لگے۔ ”مایوسی گناہ ہے پریشان نہ
ہوں، اللہ کرم فرمائے گا، انشاء اللہ خالدہ اور اس کا باپ
ٹھیک ہو جائیں گے۔“
بزرگ نے حوصلہ اور تسلی دی پھر خالدہ کی ماں سے
پوچھا کہ جب پرویز کے رشتے سے انکار کر دیا تھا تو اس
کے بعد کوئی واقعہ رونما ہوا یا کوئی خاص بات ہوئی تھی؟
خالدہ کی ماں کچھ دیر سوچتی رہی پھر بتانے لگی۔
”جب عدنان سے خالدہ کا رشتہ ٹکا ہو گیا تو اس کے بعد
خالدہ کے ابو کا کاروبار خسارے میں جانے لگا اور آئے
روز کوئی نہ کوئی نقصان ہونے لگا۔
جب خالدہ کی رخصتی کر دی تو کچھ دنوں کے بعد
ہمیں اپنے مکان کے باہر دیوار پر خون کے چھینٹے نظر
آئے تھے پھر اس کے بعد ہمارے گھر میں خون کے
لوٹھروں کے ساتھ کسی پرندے کے چھوٹے چھوٹے
اٹے بھی گرنے لگے۔ میرا تھا اسی وقت ٹھٹھا تھا کہ
ضرور کوئی بات ہے۔ میں نے خالدہ کے والد سے کہا
کہ کسی بزرگ سے مل کر اس کا توڑ کرائیں لیکن وہ تعویذ
گنڈوں کو نہیں مانتے۔ چند دن گزرے تو خالدہ کے
والد کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔ بیماری سے پہلے وہ
کچھ چیز چڑے ہو گئے تھے۔ بات بات پر کاٹ کھانے کو
دوڑتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی طبیعت زیادہ
مکڑنے لگی اور پھر یہاں تک نوبت آ گئی کہ انہیں
اسپتال میں داخل کر دانا پڑا جہاں ان کے کئی مہینے
ٹھیک، الزائماؤٹ وغیرہ ہوئے مگر ان کا کسی ڈاکٹر کو
سمجھ نہیں آ سکا۔ ان کا وزن یکسخت بند رہا جس سے ان کا

کے بعد تھوڑا تھوڑا مالی خالہ کو پلا تے رہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اسی شہر میں کسی قریب ترین ہوٹل میں آج کا بانی دن اور رات قیام کر لیں، انشاء اللہ اول تو کچھ نہیں ہوگا اگر خدا نخواستہ خالہ کی حالت یا طبیعت بگڑنے لگے تو فوراً انہیں اطلاع دی جائے۔ یہ کہہ کر انہوں نے اس خاندان کو رخصت کیا اور دوسرے لوگوں کی داوڑی میں مشغول ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ بزرگ جن کا شمار خدا کے برگزیدہ بندوں میں ہوتا تھا وہ حقیقی اور خالصتاً اللہ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کے لیے مخلوق خدا کی مدد کرتے اور اللہ سے روبرو کر دے اور فریاد کرتے کہ سب کی مشکلیں آسان ہوں، تمام بیماروں کو شفا ملے۔ پریشان حال لوگوں کی پریشانیاں دور ہوں، بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ ہدایت نصیب ہو۔ انہوں نے اس ذات خالہ اور اس کے باپ کے لیے تعویذ لکھنے سے پہلے مراقبہ کیا تو کچھ عجیب طرح کی صورت حال ان کے سامنے آئی۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک ٹانگے میں چھ یا سات لڑکیاں لپکتی جا رہی ہوتی ہیں۔ گھوڑا سر پٹ بھاگ رہا ہے کہ اچانک ایک گہرے کھدے میں ٹانگے کا پھیر جاتا ہے اور اگلے ہی لمحے ٹانگہ الٹ جاتا ہے۔ لڑکیاں شور مچانے لگ جاتی ہیں۔ کوچوان بری طرح زخمی ہو جاتا ہے۔ گھوڑا بھی بے سدھ پڑا ہوتا ہے تو اسی اثناء میں ایک خیل اور گدھ نما بہت بڑا پرندہ تیزی سے آتا ہے اور ایک لڑکی پر جھپٹ پڑتا ہے اور اس کے سر پر لگا کچر اتار کر لے جاتا ہے اور دوسرا حملہ کوچوان پر کرتا ہے اور اپنے نوکیلے پنجوں سے اسے اور زخمی کر دیتا ہے۔ پھر چاروں طرف سے خون کے چھینٹے پڑتے ہیں اور ساتھ ہی فضا میں گہرا گرد و غبار پھیل جاتا ہے۔ اس مراقبہ کے بعد انہوں نے کافی دیر غور و خوض کیا پھر تین تعویذ لکھے اور ذکر اذکار و وظائف کے بعد سو گئے۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن مقررہ وقت پر وہ لوگ خالہ کو لے کر آ گئے۔ پچھلے دن اور رات سکون سے گزری تھی۔ خالہ

گھٹ گیا۔ جسم سوجھتا جا رہا ہے۔ وہ ہر وقت خلاؤں میں گھورتے رہتے ہیں اور اچانک ان پر کچی، گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ سخت بے چینی اور بے قراری کی کیفیت میں بھی بیٹھ جاتے ہیں، کبھی لیٹ جاتے ہیں، کبھی اٹھ کر باہر کو دوڑنے لگتے ہیں اور کبھی کبھی انتہائی غصے میں آ کر مارنے کو دوڑتے ہیں۔ ہمارا تو سب کچھ اجڑ گیا ہے، کاروبار تباہ ہو گیا، اب اوپر سے خالہ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ کیا بنے گا ہمارا۔ اتنا بتا کر خالہ کی ماں زار و قطار رونے لگی اور روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

بزرگ فرمانے لگے۔ ”بی بی! اللہ سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ وہ قادر منطوق مسبب الاسباب، قاضی الحاجات ہے۔ آپ رونا بند کرو، انشاء اللہ سوہنے رب کے کرم سے خالہ اور اس کا باپ دونوں بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔“ بزرگ اب خالہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

خالہ جو کہ بے انتہا حسین و جمیل اور بلا کی خوب صورت تھی۔ گورا چنارنگ چہرے پر انتہائی معصومیت اور سادگی تھی مگر اس وقت وہ اس حال میں تھی کہ بار بار سر سے دوپٹا اتار پھینکتی سر کے بال جھاڑ جھٹکار ہو گئے تھے۔ ایک پاؤں کی شلوار پٹنلیوں تک اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ بزرگ نے براہ راست خالہ کو مخاطب کیا۔ ”بیٹی میری آواز سن رہی ہو؟ خالہ یہی کیسی طبیعت ہے۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے؟“

مگر خالہ کسی بھی بات کا جواب دینے کی بجائے ان کے چہرے کی طرف تکتے لگی۔ بزرگ نے خالہ کے سر پر ہاتھ رکھا تو اگلے ہی لمحے اس نے نظریں جھکا لیں۔ بزرگ نے دعا کے لیے اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا دیے اور رب کے حضور خالہ اور اس کے باپ کی صحت یابی کے لیے دعا کی۔ پھر خالہ کو دم کیا اور پانی کی ایک بوتل منگوائی۔ پانی پر دم کیا اور ہدایت کی کہ سب سے پہلے فوراً اللہ کی راہ میں صدقہ خیرات کریں اور آج کی رات اسی شہر میں رک جائیں۔ کل صبح دس بجے کے بعد آئیں اور پانی کی بوتل ساتھ لے جائیں اور ہر گھنٹے

پرسکون اور ناراض رہی اس پر دیوانگی کا کوئی دورہ نہ ہوا تھا۔ بزرگ نے خالدہ کو دم کیا اور تعویذ دیا کہ اسے خالص چاندی کے خول میں پیک کر دیا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے مگر تعویذ ڈالنے سے پہلے خالدہ کو دم کیے ہوئے پانی سے اچھی طرح نہلایا جائے اور نیا سوٹ پہنا دیا جائے اس کے زیر استعمال کپڑے خیرات کر دیے جائیں۔ ساتھ انہوں نے چینی اور پانی دم کر کے دیا کہ سات روز تک دن میں تین بار چٹکی بھر چینی کھلائی جائے اور تھوڑا تھوڑا پانی پلایا جائے۔ دوسرا تعویذ خالدہ کے والد کے لیے تھا کہ انہیں اسپتال سے گھر لے آئیں اور ان کے گلے میں تعویذ ڈال دیں اور ان کے لیے بھی چینی پانی دم کر کے دیا۔ تیسرا تعویذ خالدہ کے والد کے کاروبار کے لیے دیا کہ آئندہ کے لیے کوئی نقصان نہ ہو اور دوبارہ سے کاروبار چل پڑے اور اس کے لیے ہدایت کی کہ اسے کسی کے علم میں لائے بغیر یا تو دریا میں بہا دیا جائے یا پھر کسی کنویں میں ڈال دیا جائے۔ جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں۔

خالدہ اپنے خاوند عدنان کے گھر میں رہے اور اس کا والد بھی اپنے گھر میں رہے اس ضمن میں مکمل خاموشی اور احتیاط رکھی جائے۔ اس دوران اگر خدا نخواستہ کوئی غیر معمولی صورت حال یا واقعہ رونما ہو تو فوراً ان بزرگ کو تفصیلاً مکمل حالات سے آگاہ کیا جائے۔

چنانچہ ان ہدایات کے ساتھ ان کو جانے کی اجازت دے دی۔

☆.....☆.....☆

آنے والے چند دنوں میں حالات نے پلٹا کھایا اور اللہ رب العزت کے خاص فضل اور لطف و کرم سے سات دن کے اندر خالدہ مکمل طور پر ٹھیک ہو گئی اور اس کا باپ بھی بھلا چٹکا ہو گیا۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ یا صورت حال رونما نہ ہوئی۔ جب دوبارہ ان بزرگ سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ رب کے حضور شکرانے کے نوافل ادا کریں۔ دل کھول کر صدقہ خیرات کریں۔ دونوں خاندانوں کے تمام افراد نماز، بیگانہ کی پابندی کے ساتھ تلاوت کلام کا روزانہ کا معمول اپنا کریں اور شریعت کے وضع کردہ اصولوں اور

ہدایت پر سختی سے کاربند رہیں۔

اگلے ایک مہینے کے اندر خالدہ نہ صرف مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی بلکہ حاملہ بھی ہو گئی۔ اسی طرح اس کا باپ بھی تندرست ہو گیا اور اس کا کاروبار بھی چلنے لگا۔

کافی اصرار کے بعد ان بزرگ سے ان معاملات کی بابت پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ جب پرویز کو خالدہ کا رشتہ دینے سے انکار کیا گیا تھا تو اس نے اپنے دل میں کینہ اور بغض رکھ لیا اور انتقام کے طور پر کسی جادو گر ٹائپ خبیث شیطان کے چیلے سے کافی رقم دے کر گندہ عمل کروایا تا کہ خالدہ کا گھر نہ بے اس کا والد بھی تباہ و برباد ہو جائے۔

پھر قدرت کی بے آواز لاشی حرکت میں آئی اور ہوا یوں کہ جو کنواں پرویز نے خالدہ اور اس کے باپ کے لیے کھودا تھا وہ خود اس میں گر گیا۔ اس کی دو بیٹیسیں تھیں جو کہ وافر مقدار میں دودھ دیتی تھیں یکے بعد دیگرے سانپ کے ڈسنے سے مر گئیں۔ اس کی فصل تباہ ہو گئی۔ وہ ٹی بی کے مرض کا شکار ہو گیا اور مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے خون تھوکتا پھرتا ہے اور آج تک اس کی شادی نہ ہو سکی ہے۔ جب کہ خالدہ اپنے گھر میں بہت خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں اس کے والد کا کاروبار پھر سے چل نکلا۔ اللہ نے اتنی برکت ڈالی کہ ہر طرح سے خوش حالی ہی خوش حالی ہے۔ خالدہ کی ماں اور باپ نے حج ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ خالدہ کے باپ نے خالدہ اور عدنان کو عمرہ کروایا اب عدنان نے شہر میں مکان بنانے کے لیے دس مرلے کا پلاٹ بھی لے لیا ہے۔

پرویز اپنی بد فطرتی، حسد، کینہ اور انتقام لینے کی کوشش میں انجام بد سے دوچار ہو کر دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بن چکا ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ گندم بیج کر چٹا نہیں کاٹ سکتے جو لوگ اپنی اصلاح کرنے کی بجائے دوسروں کا برا سوچنے اور کرتے ہیں ان کا انجام ہمیشہ برا اور عبرت ناک ہوتا ہے۔

پراسرار نمبر کی آنٹھویں خاص کہانی

وہ چٹکبری بلی

نادیہ ملک



ان قارئین کے لیے پراسرار نمبر کی سوغات جو بلیوں سے بہت عقیدت رکھتے ہیں

لیکن بھی نہ بھی ہم مل ہی لیتے تھے۔ ہمارے درمیان وقتاً فوقتاً خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ آج سے دو سال قبل اس نے مجھے لکھا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔ اس وقت وہ چالیس سال کا ہو رہا تھا اور میری ہی مانند گنوار رہنے کا عزم کیے ہوئے تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی ہونے والی بیوی اس سے کوئی بیس سال چھوٹی تھی۔ بہر حال مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی اور میں نے اسے شادی پر ایک تحفہ بھی بھیجا تھا۔ بلال کے خط سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وہ ایک بدیسی لڑکی تھی۔ اپنی فرم کی طرف سے وہ جب انگلستان گیا تھا تو وہ لڑکی اسے وہیں ملی تھی اور محض اتفاق سے ان دونوں کی ملاقات ہو گئی اور اس طرح وہ اسے لے کر یہاں آ گیا تھا۔ بظاہر بلال کو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت تھی اور وہ اس کا دم بھرتا ہوا نظر آتا تھا۔

پہلے سال میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ بلال ایک تعمیراتی کمپنی میں انجینئر ہے۔ ان دنوں وہ تاحیلا کے علاقے میں ایک ڈیم پر متعین تھا۔ جب مجھے بلال کا خط ملا اس نے مجھے تاحیلا کا دورا میں لانے کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ

”میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھ سے ملنے کے لیے اتنی تکلیف اٹھائی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایک معروف وکیل ہو اور تم نے محض میرے لیے اپنا وقت خراب کیا۔ حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے کیس میں کچھ جان نہیں۔ مگر میں کیا کروں مجھے معلوم ہے کہ جھوٹ بولنے والا نہیں نہ کہیں چوکنہ ضرور ہوتا ہے اور میں اسی لیے کوئی من گھڑت کہانی نہیں سنانا چاہتا۔ میں نے اپنے وکیل مسز حامد سے بھی یہی کہا تھا اور یہ کہانی میں تمہیں بھی سنا رہا ہوں کیونکہ اس میں کوئی جھوٹ شامل نہیں ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں قابل یقین ہو یا نہ ہو لیکن بالکل صحیح ہے۔ میں نے صرف ایک بار فائر کیا تھا صرف ایک بار اور وہ بھی ایک بلی پر۔۔۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک بلی کو مارنے پر کسی کو پھانسی دے دی جائے۔“

بلال سے میری دوستی سکول کے زمانے سے تھی اور ہم بڑے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ جنگ کے بعد سے میری اور اس کی ملاقاتیں تقریباً بند ہو گئی تھیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ملک کے دوسرے گوشے میں کہیں تھا

Downloaded From Paksociety.com

ہو کر سگریٹ پینے لگا۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد مجھ پر
اُبھرن طاری ہونے لگی۔ کپھار ٹمنٹ میں کہیں نہ کہیں
کوئی بلی ضرور موجود تھی اور یہ بات میری چھٹی حس
مجھے بتا رہی تھی۔ یہاں تم یہ جان لو کہ میں اُن لوگوں
میں سے ہوں جو بلی کی موجودگی کو قطعی برداشت نہیں
کر سکتے۔ حالانکہ یہ بات مضحکہ خیز ہی ہے مگر بس
نجانے کیوں اس جانور کی موجودگی میرے لیے
اُبھرن کا باعث ضرور بن جاتی ہے۔

جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ بڑی بی نے کسی جھابے
میں کوئی بلی ضرور رکھ چھوڑی ہے۔ جی میں آیا کہ گارڈ کو
بلا کر اسے یہاں سے نکلاؤں مگر پھر اس مضحکہ خیز
خواہش کو سختی سے دبا اور اس خیال کو ذہن سے ہٹانے
کی بجائے نوجوان لڑکی کی سمت دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ

اس کی بیوی فلانس مجھ سے ملنے کی بے حد مشتاق ہے۔
گاؤں کے سرائے میں ہی اس نے کچھ کمرے لے
رکھے تھے۔ تاخیرا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن وہاں
کچھ مقامات سیاحوں کی لیے پُرکشش ضرور ہیں جس
کے باعث وہ جگہ آس پاس کی جگہوں سے کچھ ترقی یافتہ
ضرور ہے۔ ان دنوں میں بھی شہری زندگی سے اکتا سا
گیا تھا لہذا میں نے ہفتہ بھر کی لیے چھٹی لی اور تاخیرا کی
لیے چل پڑا۔ ٹرین میں میرے ڈبے میں صرف دو
اشخاص اور سفر کر رہے تھے۔ ایک ملٹری کا جوان اور ایک
بڑی بی، جن کے ساتھ بہت سے جھابے اور تھیلے تھے۔
صبح سات بجے کے قریب جب میں ڈانگ کار
سے لوٹا تو ملٹری کا جوان موجود نہیں تھا البتہ ایک نئی
جوان عورت ضرور موجود تھی۔ میں اپنی برقعہ پر نیم واز

لڑکی تھی بھی ایسی ہی بے حد پُرکشش، سذول اور سفید رنگت والی اس کی آنکھیں واقعی بے حد خوبصورت اور سیاہ تھیں۔ ایسی آنکھیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے اندر کوئی الاؤ سا آہستہ آہستہ دھک رہا ہو۔ چند لمحوں تک تو میں اس لڑکی کے حسن میں گم سا رہا مگر اچانک پھر مجھ پر پہلے والی اُبھرن طاری ہو گئی۔ یہ بات میں تمہیں صرف اس لیے بتا رہا ہوں تاکہ تم میری بقیہ داستان اچھی طرح سمجھ سکو۔ تمہیں اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکے گا کہ میں نے ریوالور کیوں خریدا تھا۔ جو شخص ایک بند بلی کی موجودگی سے اس قدر الجھ سکتا ہو وہ بھلا آزاد بلیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی لیے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ نقطہ اہم ہے اور اسی لیے میں نے اس کی وضاحت کی ہے۔

ترکے ہی تھے اور یہاں کے باشندے دقیانوسی وضع کے لباس میں ملبوس تھے۔ اس کے چوک میں چند دکانیں بھی تھیں اور سیاحوں کے باعث ایک نئی قسم کا کیفے بھی موجود تھا۔ بلال کا ڈیم یہاں سے چند کلومیٹر دور بتایا جا رہا تھا۔

ہم جب لوٹے تو رات کے کوئی نو بج رہے تھے اس وقت سرائے کا مالک اپنے چائے خانے کو بند کر رہی رہا تھا۔ یہ ایک موٹا سا شخص تھا اور اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے قطعی عاری لگتا تھا۔ اس کی بیوی ڈبلی چلی عورت تھی اور اس کے ہونٹ بھینچے بھینچے تھے اور دہانہ بھی غالباً بے حد تنگ ہی تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے سرائے کا مالک کسی خاص وجہ سے اپنی بیوی سے خوفزدہ ہی رہا کرتا تھا۔ جس دن میں پہنچا تھا وہ عورت پورج میں بیٹھی ہوئی تھی اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت تک گوارا نہ کی۔ بظاہر وہ کچھ اچھی عورت نہ لگتی تھی البتہ ایک بات ضرور تھی کہ وہ سرائے کو بے حد صاف ستھرا رکھتی تھی۔

مجھے رہنے کی لیے بڑا اچھا کمرہ دیا گیا تھا۔ اس کی ایک کھڑکی باغیچے میں کھلتی تھی۔ میرے بستر پر جو چادر پھیلتی تھی اس میں سے لیونڈر کی خوشبو آ رہی تھی اس پر لیتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ آخر میں تھکا ہوا تھا۔

کچھ رات گزرنے کے بعد میری نیند ٹوٹ سی گئی۔ اچانک مجھے گری محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی پوری طرح کھول دی اور وہیں رُک کر ہوا کھانے لگا۔ پورا باغیچہ اس وقت چاندنی میں نہایا ہوا کھڑا تھا۔ لان کے درمیان مجھے کوئی شے بار بار حرکت کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ادھر غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ دو بلیاں تھیں۔ اتنے فاصلے سے بہر حال مجھے ان سے کوئی خطر نہ تھا۔ میں انہیں دیکھتا رہا وہ چند لمحوں

لڑکی تھی بھی ایسی ہی بے حد پُرکشش، سذول اور سفید رنگت والی اس کی آنکھیں واقعی بے حد خوبصورت اور سیاہ تھیں۔ ایسی آنکھیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے اندر کوئی الاؤ سا آہستہ آہستہ دھک رہا ہو۔ چند لمحوں تک تو میں اس لڑکی کے حسن میں گم سا رہا مگر اچانک پھر مجھ پر پہلے والی اُبھرن طاری ہو گئی۔ یہ بات میں تمہیں صرف اس لیے بتا رہا ہوں تاکہ تم میری بقیہ داستان اچھی طرح سمجھ سکو۔ تمہیں اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکے گا کہ میں نے ریوالور کیوں خریدا تھا۔ جو شخص ایک بند بلی کی موجودگی سے اس قدر الجھ سکتا ہو وہ بھلا آزاد بلیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی لیے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ نقطہ اہم ہے اور اسی لیے میں نے اس کی وضاحت کی ہے۔

ٹرین نے مجھے جب سلسرام اسٹیشن پر پہنچایا تو میں اتر گیا کیونکہ وہاں سے تاخیلا کا گاؤں چند میل کے فاصلے پر تھا۔ پلیٹ فارم پر بلال موجود تھا وہ فوجوان لڑکی جو میری مسافر تھی وہ بھی اسی اسٹیشن پر اترتی نظر آ رہی تھی۔ ابھی میں نے مشکل سے اپنا سامان اتارا تھا کہ بلال دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچا اور مجھ سے پلٹتا ہوا بولا۔

”ہیلو! کتنا عجیب اتفاق ہے! کیا تم دونوں آپس میں متعارف ہو چکے ہو؟“

اس لمحے مجھے پتا چلا کہ وہ پُرکشش لڑکی ہی مسز بلال تھی یعنی فلائس بلال۔ اتفاق سے وہ بھی قریبی شہر چلی ہوئی تھی شاید کچھ شاپنگ کی لیے اور اس طرح ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی خاصا لمبا سفر طے کیا تھا پھر ہمارے درمیان چند ابتدائی کلمات کا تبادلہ ہوا۔

کار میں مسز بلال پیچھے جا بیٹھی جب کہ میں بلال کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راستے میں بلال نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں کی زندگی سے بے حد مطمئن ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فلائس کو شہری آب و ہوا اس نہیں آئی تھی اور وہ یہاں خود کو نہایت خوش و خرم اور تندرست محسوس کرتی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ صحت مند ہے مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں خاصی خراب تھی وہ قدرے ڈبلا اور نروس سا نظر آ رہا تھا۔

بڑھ رہی تھی ہیں محسوس کر رہا تھا جیسے فلائس دن یہ دن
مستند ہوتی جا رہی ہو۔ اس کے رخسار اتاری ہو رہے
تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے وجود کے اندر کی
توانائی سے فروزاں ہوئی جا رہی ہو۔

بلال سارا دن کام کے سلسلے میں باہر ہی رہتا تھا اور
یہ کام اس کی صحت پر اثر انداز ہو رہا تھا میں نے اس سے
دریافت کیا کیا تمہیں رات میں نیند نہیں آتی تو اس کے
جواب میں اس نے بتایا کہ بات دوسری ہی ہے وہ ایسا
سوتا ہے کہ اسے اپنا ہوش ہی نہیں رہتا۔ اسے اس نیند
میں خواب تک نظر نہیں آتے تھے۔ اکثر سارا سارا دن
میں اور فلائس ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے پورا ہفتہ میرا
وہاں بے حد اچھا گزرا۔ اور اگر وہاں بلیاں نہ ہوتیں تو
میں سمجھتا ہوں کہ مجھے وہاں کسی قسم کی تکلیف نہ تھی۔ یوں
لگتا تھا جیسے ہر رات باغیچے میں بلیاں ہی بلیاں آکھرتی
ہوں خصوصاً سے وہ چٹکبری بلی جسے میں نے پہلے دن
دیکھا تھا اور دو مزید بلیاں در دسرا بنی ہوئی تھیں۔ ایک
رات تو مجھے وہاں کوئی پندرہ عدد بلیاں نظر آئی تھیں۔
مجھے اپنی کھڑکی ساری رات بند ہی رکھنی پڑی تھی کیونکہ
اس چٹکبری بلی نے میری کھڑکی پر اچھل پھاند کو گویا
دستور بنا رکھا تھا۔ مجھے دروازہ بھی بند ہی رکھنا پڑتا تھا
کیونکہ جب میں دوسرے کمرے میں کسی ضرورت سے
گیا تھا واپسی پر وہی چٹکبری بلی مجھے اپنے بستر پر
بڑا جھان نظر آتی تھی مجبوراً مجھے اسے مار کر بھگانا پڑا۔

میں نے بلیوں کے سلسلے میں سرائے کی مالک سے
رجوع کیا تو اس نے نہایت بدتمیزی سے کہا کہ سرائے
میں کوئی بلی نہیں رہتی اور یہ حقیقت بھی تھی کیونکہ دن کی
روشنی میں مجھے وہاں بھی کوئی بلی نظر نہیں آئی تھی۔ وہاں
ایک روز شام کے وقت میں نے سرائے کے مالک کو
ضرور جا پکڑا تھا۔ وہ اس وقت ایک بھورے رنگ والی
بلی کو شانے پر بٹھائے ہوئے اسے کچھ کھلانے میں
مشغول تھا۔ پھر میں اس سے اُلجھ پڑا۔ میں نے اس
سے یہ بھی کہا کہ وہ مجھے کوئی اور کمرہ دے دے تاکہ
بلیوں سے نجات ملی رہے۔ جواب میں اس نے مجھے یہ
کہہ کر ٹخا دیا کہ وہ اپنی بیوی سے پوچھ کر بتائے
گا۔ اس عرصے میں موسمِ ماہِ گرم ہو چلا تھا اور دن میں

تک پاس ہی پاس بیٹھی رہیں پھر اُٹھ کر دوڑنے
لگیں۔ آگے پیچھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گھاس پر خود
اپنے سائے کا تعاقب کر رہی ہوں۔ یہ سب کچھ گویا کسی
رقص کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ اسی لمحے غالباً کسی کھٹکے
نے ان کو چونکا دیا اور وہ بھاگتی ہوئی غائب ہو گئیں۔

میں دوبارہ بستر پر جا لیٹا البتہ نیند میری آنکھوں
سے رخصت ہو چکی تھی میرے کان ان آوازوں پر لگے
ہوئے تھے جو متواتر باغیچے میں سے آرہی تھیں۔ بد قسمتی
سے یہ آوازیں میرے کمرے کی دیواروں کے بہت ہی
قریب سے آرہی تھیں اور پھر یوں لگا جیسے کوئی شے
اچھل کر آواز کے ساتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر آئی ہو۔
میں نے ہلٹ کر دیکھا وہاں چوکھٹ پر ایک بڑی سی
چٹکبری بلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سر اونچا کر رکھا
تھا اور بڑے اطمینان سے اپنے کانوں کو سلاخ سے مس
کر کے کھجائے لگی تھی۔

ظاہر ہے میرے لیے یہ صورتحال ناقابلِ
برداشت تھی۔ میں نے اسے ہشکارا اور وہ اطمینان سے
بیچے کو کر باغیچے میں چلی گئی۔ پھر گزی کی پروانہ کرتے
ہوئے میں نے اٹھ کر کھڑکی اچھی طرح بند کر دی اور
بستر پر گر کر سو گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن بلال مجھے اور فلائس کو ڈیم دکھانے
لے گیا۔ وہاں جا کر مجھے بتا چلا کہ جس بیماری کا ذکر
ایک بار بلال نے اپنے خط میں کیا تھا وہ فلائس میں ہنوز
موجود تھی۔ ہوا یوں کہ بلال نے ہمیں ایک ایسے چشمے پر
لے جانا چاہا جو کچھ زیادہ چوڑا نہ تھا اور جس پر لکڑی کے
تختوں کا ایک ڈھیلہ ڈھالا ہل بنا ہوا تھا اور جب فلائس
نے اس پر سے گزرنے سے صاف انکار کر دیا۔

مزید اصرار پر وہ چپخنے لگی تھی اور مجبوراً ہم لوگوں
نے ادھر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بعد میں فلائس نے
معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں ایک بار بچپن میں دریا
میں گر گئی تھی اور تب سے پانی کا خوف میرے ذہن میں
بیٹھ گیا ہے۔ اس غصی کا فیکلس کے سوا مجھے فلائس کی
صحت قابلِ رشک حد تک اچھی محسوس ہوئی تھی۔ میں
وہاں کوئی ہفتہ بھر تک رہا تھا اور جوں جوں یہاں گرمی

ایک لمحے میں درآئی ہو۔ یہ بات کم از کم مجھے پریشان کرنے کی لیے کافی تھی بارش کے باعث جس شدید ہو گیا تھا اور پھر میں نے مجبور ہو کر کھڑکی کھول دی۔ وہاں رُک کر میں نے اپنی قمیض کے بٹن کھول دیئے اور کھڑکی کے پاس ہی بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ویسے میری چھٹی حس اس وقت صاف بتا رہی تھی کہ باغیچے بلیوں سے ضرور بھرا ہوا ہے کوئی گیارہ بجے رات کے وقت اس بات کی تصدیق ہو گئی۔

بلا مبالغہ وہاں اس رات کوئی پچاس بلایا ضرور ہوں گی۔ کچھ ہی دیر میں انہوں نے ایک مخصوص قسم کا ناچ شروع کر دیا۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہری دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور تب سوچنے پر سہاگہ یہ ہوا کہ میں نے دیکھا کہ ایک بلی نہ جانے کس طرح اندھیرے میں اندر آگئی اور اب وہ میرے بالکل قریب موجود تھی میں نے ایک بے تحاشا قسم کی چیخ کے ساتھ اسے زور سے جھڑکا پھر وہ اچھل کر کھڑکی سے نیچے کود گئی۔

چند لمحوں کے لیے باغیچے میں بلیوں نے زور کا شور بلند کیا اور پھر ایک دم خاموشی سی چھا گئی۔ اسی وقت آسمان پر ایک زور کی کڑک کے ساتھ بجلی چمکی اور اس روشنی میں میں نے دیکھا کہ باغیچے کی آخری دیوار پر بہت سی بلایاں قطار در قطار بیٹھی ہوئی ہیں جب دوسرا جھماکا ہوا تو وہ دیوار مجھے یوں خالی نظر آئی جیسے وہ بلایاں سرے سے رہی ہی نہ ہوں۔ وہ دیوار بالکل سنسان پڑی تھی۔

کوئی دو بجے بارش شروع ہو گئی۔ اس سے تین گھنٹے پہلے سے میں اپنی کھڑکی سے چپکا بیٹھا ہوا تھا۔ بارش شروع ہوئی تو گرمی میں ذرا کمی محسوس ہوئی۔ گاہے بگاہے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کچھ قطرات میرے چہرے پر بھی آرہے تھے میں نے راہداری کے دوسرے سرے پر کسی کمرے کی کھڑکی بند کیے جانے کی آواز بھی سنی مگر میں بدستور وہیں بیٹھا رہا۔

بارش گرج چمک کے ساتھ جاری تھی۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے اس گرج میں کوئی اور آواز بھی آرہی ہے۔ کوئی میرے کمرے کے دروازے پر دستک دے

مسز بلال سے میرے تعلقات معمولی اور دوستانہ نوعیت کے ہی تھے ہم دونوں بلال کی عدم موجودگی کے باعث زیادہ تر وقت ساتھ ضرور گزارتے تھے لیکن ہمارے درمیان کوئی خاص گفتگو نہ ہوتی تھی۔ فلائس خود بھی ایک خاموش طبع عورت تھی۔ وہ عموماً گفتگو پر دھوپ میں بیٹھ کر جسم سینکے کو ترجیح دینے کی قائل تھی۔ شام کو وہ البتہ کچھ دیر بیٹھ کر گفتگو میں حصہ لیا کرتی تھی لیکن وہ سونے کی لیے ہمیشہ جلدی ہی اٹھنے کی قائل تھی۔

ریوالور کے بارے میں ہاں یہ ریوالور میں نے وہاں پہنچ کر کوئی ایک ہفتہ بعد خریدا تھا میں نے ایک کباڑی سے جو سیکنڈ ہینڈ سامان کی دوکان رکھے ہوئے تھا۔ دوکاندار کے پاس یہ ریوالور کسی نے گروی رکھ دیا تھا اور پھر روپیہ ادا نہ ہونے کی صورت میں اس نے اسے فروخت کر دیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا اس بے چارے کو خود بھی اسلحہ کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہ تھیں۔ اس ریوالور کے ساتھ دس عدد کارتوز بھی تھے اور اس نے شاید اسی لیے لائسنس وغیرہ کے چکر میں پڑے بغیر اسے میرے سپرد کر دیا۔ باتوں کے درمیان میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ میں یہ دراصل بلیوں کو ختم کرنے کی لیے لے جا رہا ہوں۔ میری بات پر وہ کچھ چونک کر مجھے دیکھنے لگا تھا پھر اس نے پوچھا کہ میں کہاں مقیم ہوں اور جب میں نے اسے سرائے کا نام بتایا تو اس نے کہا

”محتاجا رہیے گا جناب“ کہا جاتا ہے کہ وہاں کی بلیوں کو مارنے والا مصیبت میں مبتلا ہوئے بنائیں رہتا۔“

اس کے بعد اس نے کچھ اور باتیں کہیں جو میری سمجھ میں نہ آسکیں غالباً وہ کسی چاندی کی گولی وغیرہ کے سلسلے میں بولنے لگا تھا۔ جس وقت میں ریوالور لے کر جا رہا تھا تو میں نے محسوس کیا جیسے وہ مجھے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔

اس رات بڑی زبردست گرج چمک کے ساتھ بارش ہوئی تھی۔ بلال اور فلائس دونوں ہی بارش سے کچھ زیادہ مایوس نظر آ رہے تھے خود میرا حال بہتر نہ تھا۔ بلکہ اس رات انہوں نے لگ رہا تھا جیسے بلیوں کی پوری فوج

رہا تھا میں نے اُنھ کو دروازہ کھولا تاہم بلال ایک موم بتی ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اس کے پیرے سے تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔

”فلاس کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ”وہ جاگ ہی نہیں رہی ہے۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“

پھر میں اس کے ساتھ ہی راہداری میں چل پڑا۔ اس کے کمرے میں دو بستر موجود تھے۔ چھوٹا والا بستر خالی پڑا تھا اور اس کے کپڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ غالباً بلال اسی سے اُنھ کر گیا تھا۔ دوسرے بستر پر مسز بلال لیٹی ہوئی تھی۔ وہ غالباً مکمل طور پر عریاں تھی۔ ویسے سینے تک اس کا جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا وہ حیت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے لمبے بال دو حصوں میں بٹے ہوئے اس کے سینے پر پڑے تھے۔ اس کا چہرہ پیلا اور منجمد نظر آ رہا تھا۔ اس کی نبض بھی بے حس تھی اور پہلی بار دیکھنے پر وہ زندہ محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی سانسیں بھی بے حد آہستہ سے چل رہی تھیں۔ میں نے اسے بلا کر بیدار کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ میں نے اس کے پیرے اُلٹ کر دیکھے تو وہاں سوائے سفیدی کے کچھ نظر نہ آ سکا۔ اس کی آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔

بلال نے مجھے بتایا کہ گری کی وجہ سے اس نے وہی بستر چنا تھا جو کھڑکی کے قریب تھا۔ بارش کے باعث جب بوجھار اندر آئی تو وہ جاگ گیا۔ پھر وہ اُٹھا اور کھڑکی بند کر دی۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے فلاس سے دریافت کیا کہ کیا وہ آرام سے سو رہی ہے لیکن وہاں سے اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے ایک موم بتی جلائی اور پھر اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے پریشان کرنے کی لیے کافی تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی وہ مجھے بلانے چلا گیا تھا۔

میں نے بلال کی داستان سن کر اسے صبر کی تلقین کی اور پھر لیٹی ہوئی عورت کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگا بس یوں سمجھے کہ وہ سوائے سانس کے اتار چڑھاؤ کے بالکل کسی مردے کی مانند لگ رہی تھی میں

نے بلال سے کہا کہ وہ کسی ردِ حال وغیرہ سے مریمہ کے بیڑوں کی مالش کرے۔ پھر ہم دونوں اس کام میں جست گئے۔ اچانک ہمیں احساس ہوا جیسے کوئی دبے قدموں کہیں قریب چل رہا ہو میں نے موم بتی اُٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر شیشوں کے پیچھے وہی چتکبری بلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا تمام جسم بارش سے بھگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھے اپنی سمت گھورتی ہوئی لگیں اس کا منہ احتجاج کے طور پر کھلا ہوا تھا۔ پھر وہ غرا کر کھڑکی کی سلاخوں کو کھرچنے لگی۔ گویا اندر آنے کے لیے بیتاب ہو۔

میں موم بتی رکھ کر دوبارہ فلاس کی سمت مڑا تو بلی نے باہر سے ایک اونچی غراہٹ بلند کی جو کسی چیخ سے مشابہہ تھی۔ میں نے بلال سے کہا کہ وہ جا کر سرائے کے مالک سے کچھ گرم پانی لے آئے۔ بلال فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور میں دوبارہ مریمہ کی سمت متوجہ ہو گیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ خود میرے اپنے فلاسک میں کچھ چائے پڑی ہوئی ہے۔ میں فوراً اسے لینے کی لیے دوڑ پڑا۔ مجھے باہر نکلتے دیکھ کر غرائی ہوئی بلی اچانک خاموش ہو گئی۔ پھر جس وقت میں اندھیرے میں اپنا فلاسک ٹول رہا تھا میں نے ایک زور کی دھپ کی آواز سنی اور پھر میں نے دیکھا کہ وہی چتکبری بلی کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں آ کوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دوڑتی ہوئی دروازے سے راہداری میں غائب ہوئی میں جس وقت فلاسک لے کر فلاس کے کمرے میں پہنچا تو مجھے بلال اور سرائے کا مالک دونوں زینوں پر ہی مل گئے۔

ہم ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اسی وقت فلاس کے غافل اور ساکت جسم میں کچھ حرکت سی ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اُنھ بیٹھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بالکل ہی ٹھیک ہو۔

☆☆☆

دوسرے دن موسم خوشگوار ہو چکا تھا اور گری واقعی بہت کم ہو گئی تھی۔ مجھے پتا نہیں بلال نے اپنی بیوی سے کیا کہا۔ ویسے ہم میں سے کسی نے بھی رات کے واقعے کی تشہیر نہیں کی۔ مسز بلال ہر طرح سے اچھی اور مستحکم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



نظر آئی تھی اس دن بلال کام پر نہیں گیا اور ہم تینوں پکنک منانے نکل گئے۔ ہم لوگوں کے مراسم انتہائی خوشگوار تھے تم اس کی تصدیق بلال سے کر سکتے ہو۔ ہمارے درمیان کوئی گنجائش نہ تھی مجھے یقین ہے کہ تمہارے سوال کا وہ بھی یہی جواب دے گا تم جب چاہو اس سے پوچھ سکتے ہو۔

اس قصبے میں ۲۴ تاریخ کی بہت اہمیت ہے۔ ۲۴ جون میں اب کچھ اور تفصیل نہیں بتا سکتا کیونکہ تمام ضروری باتیں میں کہہ چکا ہوں پکنک سے واپس ہو کر ہم نے کھانا کھایا۔ پھر خوشگوار موڈ کے ساتھ ہی ہم لوگ اپنے اپنے کمرے میں سونے کی لیے رخصت ہو گئے۔ اس روز بادل نہیں تھے اور آسمان پر پورا چاند موجود تھا۔ وہ پہلی رات تھی جس میں بلیوں سے نجات رہی۔ شاید اسی لیے میں نے کھڑکی کو بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ دروازہ بھی کھلا ہی تھا سونے سے پہلے ریوالور رکھنے کا بھی کوئی خاص مقصد نہ تھا سوائے اس کے کہ میں اس سے کام لینا چاہتا تھا۔

میں خاصا تھکا ہوا تھا لیکن خلاف توقع مجھے نیند نہیں آئی۔ میں خاصی دیر تک جاگتا رہا اور باہر کی چاندنی کا لطف اٹھاتا رہا۔ کوئی گیارہ بجے رات کے قریب مجھے ایک مخصوص قسم کی سرسراہٹ کی آواز سنائی دی اور میں سمجھ گیا کہ یقیناً کوئی بلی کھڑکی کے اوپر آ رہی ہے۔ مجھے اپنے اعضاء تنے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہب کی آواز سنائی دی اور وہی چتکبری بلی حسب دستور کھڑکی کی چوکھٹ پر آ بیٹھی۔ اس نے مخصوص انداز میں سر اٹھا کر اپنی دم ہلائی اور کھڑکی کی سلاخوں سے اپنے بدن کو رگڑ کر کھجانے میں مصروف ہو گئی۔

میں نے بلا تامل ریوالور سیدھا کیا۔ نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔

اس جانور کے منہ سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ وہب سے کمرے میں فرش پر آ گری۔

میں اُچھل کر بستر سے نکل آیا۔ فائر کی آواز نے عمارت کے کتبے کو گونجوا کر رکھ دیا۔

مجھے کافی دور سے کسی کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ زخمی بلی کرتے ہی اٹھ کر بھاگی اور میں بھی وقت کھوئے بغیر اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور ہنوز دبا ہوا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس منحوس جانور کو ختم کر کے چھوڑوں گا۔ راہداری میں بلی کے پیچھے دوڑتا ہوا میں بلال کے کمرے تک جا پہنچا۔ وہیں میں نے کمرے کے دروازے پر فلائس کو کھڑے پایا وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے دروازے کو تھامے کھڑی تھی۔ اس کا سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ یکا یک ایک جھکولے کے ساتھ وہ فرش پر گر پڑی میں نے دیکھا اس کا ننگا سینہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور جس وقت میں ریوالور پر گرفت مضبوط کیے اسے دیکھنے میں منہمک تھا بلال کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے ہم دونوں کو اسی حالت میں دیکھا۔

تو یہ ہے میری کہانی۔ تم یقین کرو اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ عدالت میں اس داستان پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ لیکن میں اور کہہ بھی کیا سکتا ہوں! خون کے قطرات میرے کمرے سے لے کر بلال کے کمرے تک راستے بھر موجود تھے۔ زخمی بلی یقیناً اسی راستے پر دوڑی ہوگی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے صرف بلی پر گولی چلائی تھی مجھے کچھ پتا نہیں مسز بلال پر کس نے فائر کیا اور کیوں سرائے کے لوگ اگر یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے وہاں بھی کوئی چتکبری بلی نہیں دیکھی۔ تو بھلا میں کیا کروں! تم بلال سے پوچھو اس نے تو ایک رات وہ بلی خود بھی دیکھی تھی۔ مجھے یقین ہے وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ پوری عمارت کو اچھی طرح کھنگالو اب یہ ایک کام ہے جو تم کر سکتے ہو۔ پوری عمارت کے کونے کھدو رے کی تلاشی لو۔ مجھے اُمید ہے تمہیں اس چتکبری بلی کی لاش کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔ تمہیں اس کی لاش میں میری گولی ضرور موجود ملے گی۔

میں اس داستان کو سن کر انہونی کے احساس کو لیے باہر چل پڑا۔ فلائس ہی وہ چتکبری بلی تھی میں یہ سوچ کر لرز جاتا ہوں اور خدائی مخلوق کی اقسام پر غور کرتا جاتا ہوں۔ واہ رے مولا..... تیری قدرت۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From
Paksociety.com

پہاڑیوں کا دل

خمسارہ

شمینہ طاہر بٹ

کھیل ہی کھیل میں پڑنے والی افتاد نے اس خاندان پر زندگی ہی تنگ کر دی تھی

اوائل جون کی تپتی دو پہر تھی۔ گرمی کا وہ عالم،
جیل بھی انڈہ چھوڑ کر بھاگ جائے۔ سڑکیں سنسان
اور گلیاں جیسے ایکدم ویران ہو گئی تھیں۔ انسان تو
انسان۔۔۔ چرند پرند بھی اس جلتے جلتے موسم کی سختی اور

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

جگہ پر کھیلنے کا پروگرام مرتب ہوا۔ مگر تم لوگوں نے میری ایک نہیں سنی۔ اب دیکھنا، ہو گیا ناں شاہ میرکم۔ اب ہم پھوپھو کو کیا جواب دیں گے۔۔ ہائے۔۔ میری تو کبھی کوئی سنتا ہی نہیں۔۔ اور ای۔۔ ابو۔۔ تایا ابو۔۔ ہائے میرے اللہ۔۔ امی تو میرا قید بنا دیں گی۔ اب میں کیا کروں۔۔ یہ سب سے بڑا ہونا بھی نرا عذاب ہی ہے۔ اب ان سب کے سوالوں کے جواب بھی مجھے ہی دینے پڑیں گے اور سب سے زیادہ مار بھی مجھے ہی کھانی پڑے گی۔۔ میرے اللہ۔۔ شاہ میر کو واپس بھیج دے۔۔ ورنہ میرے خیر نہیں!!

"شاہ میر کی گمشدگی نے سب سے زیادہ ربیعہ کے ہاتھ پر پھلائے تھے۔ وہ ان سب کزنز میں سب سے بڑی تھی۔ اور جتنی بڑی تھی، اتنی ہی ذرا اور شرمیلی بھی تھی۔ ماں کو سب سے زیادہ رعب بھی اس پر ہی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ چھوٹے بہن بھائیوں کی بہت سی ذمہ داریاں بھی اسی کے سر تھیں۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی اسے سے بہت مختلف اور شرارتی تھے۔ ربیعہ بیچاری اکثر اب سب کی شرارتوں کی بھیٹ چڑھ جاتی اور پھر بیچتا ماں کی صلواتیں دھمو کے اس کا مقدر بنے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی شاہ میر کے اچانک غائب ہو جانے پر وہ سب سے زیادہ حواس باختہ ہو رہی تھی۔

"عرفان۔۔ ہارون۔۔ خدا کے واسطے ڈھونڈو کہیں سے شاہ میر کو۔۔ اگر وہ نہ ملا تو ماموں، ماما جان تو بعد میں کوئی ایکشن لیں گے۔ امی تو یہ خبر سننے ہی بیہوش ہو جائیں گی۔ اور پھر ابو۔۔ ابو ہمیں کبھی بھی فیصل آباد نہیں آنے دیں گے۔ اوہ خدایا۔۔ ہم کیا کریں اب۔۔ ارے۔۔ کچھ تو کرو تم لوگ۔۔ اب ایسے کیوں کھڑے ہو گئے ہو بت بن کر۔۔!!" ربیعہ کا داویلا ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ماہ رخ دہائیاں دینے لگی۔ اس کا حال بھی کچھ ربیعہ جیسا ہی تھا۔ بڑی بہن ہونے کے ناتے شاہ میر جیسے چلبے بھائی کی ذمہ داری خود بخود ہی اس کے ناتواں شانوں پر آکر اڑی تھی۔ اور اسی لیے زیادہ پاجھانے لگی تھی اسی

وجوہ کی تپش ہے بچے کے لیے کونوں کھڑوں میں پناہ لے چکے تھے۔ ایسے میں بڑے سے بڑا جگرے والا بھی قبرستان کے نام پر ہی ہول اٹھتا ہوگا۔ مگر بچپن تو پھر بچپن ہی ہے۔ اسے نہ کسی کا ڈر۔۔ نہ کسی کا خوف۔۔ نہ آنے والے وقت کا خیال۔۔ اور نہ ہی گذرتے وقت کی پروا۔ اس تپتی، سسلتی دوپہر میں شہر کے سب سے پرانے اور بڑے قبرستان میں ایک طرف الگ تھلگ سے بنے احاطے میں چند بچے چھپ چھپائی کھیلنے میں مشغول تھے۔ یہ احاطہ قبرستان سے ذرا ہٹ کے بنا ہوا تھا۔ ہیشمار گھنے درختوں کے جھنڈوں کی وجہ سے یہاں قدرے سکون تھا۔ اچھا گرم ترین موسم میں بھی یہاں اچھی خاصی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ بچے ہر طرف سے بے نیاز ہو کر اپنے کھیل میں مگن نظر آ رہے تھے۔ وہ قریبی محلے کے رہائشی شبیر صاحب کے خاندان کے بچے تھے۔ شبیر صاحب کی اکلوتی چھوٹی بہن لاہور بیاہی ہوئی تھی۔ بچوں کو جیسے ہی گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں، یا تو وہ بچوں کے ساتھ اپنے دونوں بھائیوں کی طرف فیصل آباد چلی آتیں۔ یا پھر ان کے بھتیجے۔ بھتیجیاں ان سے ملنے لاہور چلے جاتے۔ شبیر صاحب، اور پھر سب مل کر خوب دھاچو کڑی بچاتے۔ اور یہ ان سب کا برسوں پرانا معمول تھا۔ اس بار بھی ناہید بچوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی تھیں۔ اور اس وقت وہ سب بچے ماؤں سے نظر بچا کر کھلنے کودنے کو قبرستان آن وھیکے تھے۔

"شاہ میر۔۔ شاہ میر۔۔!! باہر آ جاؤ یا ر۔۔ ہم ہار گئے، تم جیت گئے۔۔ بس اب فوراً باہر آ جاؤ۔!!" عرفان اپنے پھوپھو زاد شاہ میر کو ڈھونڈنے کی ہر کوشش میں ناکام ہونے کے بعد با آواز بلند اپنی شکست کا اقرار کرتے ہوئے پکارا تھا، تاکہ وہ جہاں کہیں بھی ہو، جیت جانے کی خوشی اسے باہر کھینچ لائے۔ مگر اس کے تمام کزنز سمیت اس کی یہ کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی تھی کیونکہ شاہ میر کہیں سے بھی آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"دیکھا۔۔ میں نے تم لوگوں کو پہلے ہی منع کیا تھا ناں کہ اس بھری دوپہر میں اس سنسان، ویران

ہے ہوتی تھی۔ "ارے بچو۔۔۔ آج پھر تم لوگ آگئے اُدھر شور مچانے کے لیے۔۔۔؟؟" منع کیا تھا ناں تم لوگوں کو کہ اُدھر مت آنا۔ لیکن تم لوگ بھی ناں۔۔۔ باز نہیں آتے شرارتیں کرنے سے۔۔۔ لگاتا ہوں میں تم لوگوں کی شکایت بڑے میر صاحب سے۔۔۔ اب وہ ہی تم لوگوں کو ٹھیک کریں گے۔۔۔ میری تو ایک نہیں سنتے ہو تم لوگ۔" قبرستان کے پرانے رکھوالے منگو بابا نے انہیں پریشان حال اُدھر سے اُدھر دوڑتے دیکھا تو ان کی گوثالی کرنے ان کے سر پر جا پہنچے اور بغیر کچھ دیکھے انہیں ڈانٹنے لگے۔۔۔ اسی اثنا میں ان کی نظر ردی ہوئی ربیعہ اور ماہ رخ پر پڑی تو وہ چونک گئے۔۔۔

ارے بیٹا۔۔۔ تم دنوں رو کیوں رہی ہو۔۔۔؟؟ کیا ہوا۔۔۔؟؟ کہیں چوٹ ووٹ تو نہیں لگوا لی تم نے۔۔۔!!" منگو بابا ربیعہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تشویش بھرے انداز سے پوچھا تو وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگی۔۔۔

نہیں بابا۔۔۔!! چوٹ تو نہیں لگی ابھی۔۔۔ لیکن لگے گی ضرور۔۔۔ اور وہ بھی بہت زیادہ۔۔۔ ظاہر ہے جب ہم لوگ شاہ میر کے بغیر گھر واپس جائیں گے تو اکی اور مامیوں کے سوالوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور جب ہمارے پاس کوئی جواب ہی نہیں ہوگا تو پھر ہمیں ان کی ڈانٹ بجھی کھانی پڑی گی اور مار بھی۔۔۔ تو پھر چوٹیں تو بہت آئیں گی ناں۔!!" ربیعہ کی جگہ ماہ رخ نے بسورتے ہوئے معصومیت سے منگو بابا کو جواب دیا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔۔۔

"کیا مطلب۔۔۔؟؟ شاہ میر کہاں گیا۔۔۔؟؟" بابا نے پریشانی سے اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ان سے استفسار کیا تو سب کے سر جھک گئے۔۔۔

"بابا۔۔۔ شاہ میر گم ہو گیا ہے۔ ہم نے اسے ہر جگہ دیکھ لیا۔۔۔ مگر اس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں مل رہا۔۔۔ ہمیں بہت ڈر لگ رہا ہے بابا۔ اگر وہ نہ ملا تو۔۔۔؟؟؟" عرفان نے فکر اور پریشانی سے کہا تو ربیعہ اور ماہ رخ کے رونے کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ بابا ساری صورت حال جان کر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے

بے سبب جیوں کو ساتھ لیا اور ایک بار پھر شاہ میر کی تلاش میں قبرستان میں بھاگ دوڑ شروع کر دی۔۔۔ وہ سب دو دو کی ٹولیوں میں بیٹ گئے اور یہاں وہاں شاہ میر کو آوازیں دیتے، گھومنے لگے۔ انہیں اس طرح بھاگتے دوڑتے کافی دیر ہو چکی تھی۔۔۔ اور جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا، ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شاہ میر کے نہ ملنے کی پریشانی کے ساتھ ساتھ اب انہیں اپنی اپنی ماؤں کے جاگ جانے کا خوف بھی ستانے لگا۔ منگو بابا کی فکر اور پریشانی کا عالم ہی جدا تھا۔ انہیں کسی انہونی کے ہونے کا احساس شدت سے ستا رہا تھا۔ مگر وہ کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس لیے میر د کے بغیر عافیت مل جانے کی دعائیں کرتے اسے تلاش کر رہے تھے۔

کافی دیر کی دوڑ دھوپ کے بعد آخر کار انہیں شاہ میر مل ہی گیا۔ وہ احاطے کے باہر، کافی دور درختوں کے جھنڈ کے پاس گھٹنوں میں سر دیئے چپ چاپ بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اسے اس طرح اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب اتنے خوش ہوئے کہ اس سے یوں پراسرار انداز میں غائب ہو جانے اور پھر آپوں آپ ہی مل جانے کے بارے میں اس سے کچھ پوچھنا انہیں یاد ہی نہیں رہا۔ مگر منگو بابا اسے اس طرح۔۔۔ اور اس جگہ دیکھ کر حد سے زیادہ پریشان نظر آنے لگے تھے۔

"شاہ میر پھر۔۔۔!! تم یہاں کیسے آ گئے۔۔۔؟؟" ابھی تو ہم یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔۔۔ تم کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اور اب اس طرح۔۔۔ اچانک۔۔۔ کہاں تھے تم بیٹا۔ تمہیں ہماری آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں کیا۔۔۔؟؟" منگو بابا نے شاہ میر کا بازو پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے حیرت اور پریشانی سے پوچھا تو وہ سر اٹھا کر انہیں عجیب خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی سرخ ہو رہی تھیں۔ اور چہرہ بھی لال بجموکا ہو رہا تھا۔ بال اور کپڑے اس طرح بھیکے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی کیڑوں سمیت نہا کر آیا ہو۔ منگو بابا اس کی حالت دیکھ کر چونک گئے۔ انکے ماتھے

رائیگاں جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ میری حالت کسی طرح بھی سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ وہ چپ چاپ صم صم سا بیٹھا خلاؤں میں جانے کیا ڈھونڈتا رہتا تھا۔ لیکن جب اسے دورہ پڑتا، تو وہ کسی کے قابو میں آتا تھا۔ چلا چلا کر سارا ہاسپٹل سر پر اٹھا لیتا۔ نہ ڈاکٹرز کے قابو آتا اور نہ ہی پیرامیڈیکل اسٹاف اسے سنبھال پاتے۔ اس گیارہ سالہ لڑکے کے وجود میں جیسے چالیس آدمیوں کی طاقت بھر جاتی۔۔۔ نہ اس پر کوئی دوائی اثر کر رہی تھی اور نہ ہی کسی انجیکشن کا کوئی ری ایکشن ہو پارہا تھا۔ اس کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ ہاسپٹل کا عملہ بھی اس کی حالت دیکھ دیکھ کر حد سے زیادہ پریشان ہو چکا تھا۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہ اس کی بیماری آرہی تھی اور نہ ہی کوئی علاج بچھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹرز کے بورڈ روز اس کا تفصیلی معائنہ کرتے، مختلف ٹیسٹ اور دوائیں تجویز کرتے۔۔۔ مگر سب بے سود۔۔۔ میری دم ہو کر خود ہی بیہوش نہ ہو جاتا، کوئی غمہ حال اور بے دم ہو کر خود ہی بیہوش نہ ہو جاتا، کوئی اسے قابو نہ کر سکتا تھا۔ رضا میرا اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ ناہید اور ماہ رخ کا بھی پریشانی اور فکر کے مارے برا حال ہو چکا تھا۔ ان سب کی زندگیوں کا رخ ایک دم تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ شاہ میر سب کی آنکھ کا تارہ تھا۔ سب کا بے حد لاڈلا اور چلبلا سا لڑکا، جو نہ صرف انکے لیے بلکہ پورے میر خاندان کے لیے خاص مقام رکھتا تھا۔ وہ پورے خاندان کی رونق اور جان تھا۔ اور اب اس کی یہ روی حالت دیکھ کر وہ سب ہی بے جان ہوئے جارہے تھے۔۔۔

"رضا میر صاحب۔۔۔!! ہم سے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا ہم کر چکے۔ اب اس سے آگے ہماری ڈاکٹری، ہماری سائنس۔۔۔ سب بے بس ہو چکی ہیں۔۔۔ آپ شاہ میر بیٹے کو گھر لے جائیں۔ اس کے لیے دعا کریں کہ دعا میں بڑی طاقت ہے۔ ہم بھی آپکے بیٹے کے لیے دعا گو ہیں کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے۔۔۔ مگر ہم اب اس سے زیادہ آپکی مدد نہیں کر سکتے۔!! "پندرہ دن تک ہر طرح کو ناکام کوششیں کرنے کے بعد

پر تفکر کی بکیریں ابھر آئیں۔ وہ پریشانی کے عالم میں بار بار احاطے کی طرف دیکھتے اور پھر میر کو دیکھ کر تاسف سے سر جھٹکتے۔ سب بچے شاہ میر کے مل جانے کی خوشی سے پھولے نہ سمارے تھے اس لیے اس کی ظاہری حالت کی تبدیلی کا کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا، اور اسے ساتھ لیے خوشی خوشی اچھلتے کودتے گھر واپسی کی راہ لی۔۔۔

"ربیعہ پتر۔۔۔!! مجھے کچھ اچھے آثار نظر نہیں آ رہے۔۔۔ میں اسی لیے تم لوگوں کو منع کرتا تھا کہ بھری دو پہروں میں یہاں مت آیا کرو۔۔۔ مگر تم لوگ بھی ناں۔۔۔ اللہ خیر ہی کرے۔۔۔ اب جانے کیا ہونے والا ہے۔۔۔ مجھے شاہ میر پتر کی بہت فکر ہو رہی ہے۔۔۔ میں بڑے میر صاحب سے بات کرتا ہوں۔۔۔ مجھے خطرے کی بو آرہی ہے بیٹا۔۔۔ اللہ تم سب کو اپنی انان میں رکھے۔۔۔ اب تم لوگ اپنے گھر جاؤ۔۔۔ اور آئندہ ادھر مت آنا۔۔۔ سچھی!!" شاہ میر کی خالی خالی اجنبی نگاہیں دیکھ کر بابا نے اپنی پریشانی کا اظہار ربیعہ سے کچھ اس طرح کیا کہ وہ بھی پریشان ہو گئی۔ بابا کی باتوں نے اس کے دل میں خوف سا بھر دیا تھا۔ وہ سب کو ڈانٹتی ڈھکی واہیں گھر لے گئی۔

☆☆☆

جلد ہی منگو بابا کے خوف نے پوری میر فیملی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شام تک شاہ میر سخت بخار میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس کا جسم ایسے جل رہا تھا جیسے بھٹی۔ سارے گھر والے اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو چکے تھے، اور اسے پریشانی میں شبیر میر صاحب نے لاہور فون کر کے رضا میر صاحب کو بھی مطلع کر دیا۔ رضا میر کو اپنے دونوں بچوں سے شدید قسم کی محبت تھی۔ انہیں جیسے ہی میر کی خرابی صحت کی اطلاع ملی، وہ فوراً بھاگے چلے آئے۔ انہوں نے جب بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو ان کا دل جیسے کسی نے مٹی میں جکڑ لیا۔ انہوں نے اسی وقت شاہ میر کو گاڑی میں ڈالا اور واپس لاہور بھاگے۔ پھر شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں شاہ میر کو ایڈمٹ کروا دیا گیا۔ مگر مرض بڑھتا گیا، جون جوں دوا کی۔۔۔ کے مصداق ہر کوشش

ڈاکٹرز کے بورڈ نے ایک طرح سے انہیں جواب دے دیا تھا۔ اور اس خبر نے تو میری دل کے صبح معنوں میں ہوش اڑا دیئے تھے۔ ناہید اور ماہ رخ کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اور رضا میر کو تو ایسے لگتا تھا کہ جیسے ان کی کمرہ ہی ٹوٹ گئی ہو۔ خاندان کے چھوٹے بڑے سب میر کے لیے جہاں دل سے دعا گو تھے۔ اور وہیں انہیں تسلی دلا سے بھی دیتے تھے۔ مگر میر کی حالت دیکھ دیکھ کر وہ تینوں دن بدن بچتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

"اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔ مجھے معاف کر دے اللہ۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔۔۔ معافی۔۔۔ معافی۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔!!" شاہ میر کی چیخوں سے سارا گھر گونج رہا تھا۔ دو ماہ سے اوپر ہو چکے تھے، ہر طرح کا علاج کروایا جا چکا تھا۔ دم درود۔۔۔ جھاڑ پھونک۔۔۔ تحوید دھاگے۔۔۔ مگر سب بے سود۔۔۔ کچھ بھی کام نہیں آ رہا تھا۔ شاہ میر کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر سب کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ اور تو اور ماہ رخ سمیت خاندان کے سارے بچے اپنی چوڑیاں بھول چکے تھے۔ شاہ میر کے جنون اور دیوانگی نے ان سے جیسے ان کی ساری شوخیاں۔۔۔ ساری شرارتیں ہی چھین لی تھیں۔ میر فیملی میں ہر طرف ڈر اور خوف کا راج سا ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی رضا میر صاحب جمعہ کے نماز ادا کر کے مسجد سے آئے تھے اور بے حد مایوسی کے عالم میں سر جھکائے بے مندہ لینے شاہ میر کے سرہانے بیٹھے تھے۔ اس کے دوسری طرف ناہید بیٹھی تلاوت کر رہی تھیں، اور اسی کمرے کے ایک کونے میں ماہ رخ جائے نماز بچھائے، رو رو کر اللہ سے اپنے چھوٹے بھائی کی زندگی، تندرستی اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

"بھائی جان۔۔۔!! کھانا پیئیں لے آؤں یا ڈائینک ٹیبل پر لگا دوں۔۔۔؟" ان کی پرانی خالہ بی بی نے (جنہیں بچے خالہ بی بی کہتے تھے) نے اندر آ کر رضا میر صاحب سے پوچھا تو انہوں نے ہنسی

میں سر ہلا کر منع کر دیا۔
"کیون۔۔۔ بھائی جان۔۔۔!! باجی نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا۔۔۔ اور ماہ رخ پجاری تو۔۔۔!!!"
"اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔ معافی۔۔۔ اللہ معاف کر دے۔۔۔ اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔!!" ابھی خالہ بی بی کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ شاہ میر کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے کمرے میں جا بھاگے قرآنی آیات کے قطعوں اور خطاطی کی اعلیٰ پینٹنگز کے سامنے جھکتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے اسی گریہ وزاری میں اضافہ ہو رہا تھا ویسے ویسے اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے خلق سے کر بنا کچھیں برآمد ہونے لگیں۔ اس کا جسم بستر سے دو دو فٹ اچھل رہا تھا۔ رضا میر اور ناہید کے ساتھ جیلہ بھی اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر بے سود۔۔۔ وہ ان تینوں کے بس میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا شور اور ناہید۔۔۔ ماہ رخ کی چیخیں سن کر گھر کے دوسرے ملازمین بھی بھاگے چلے آئے تھے۔ (یہ جیلہ کے شوہر منور اور بیٹا انور تھے)۔ اب وہ دونوں بھی ان کے ساتھ مل کر میر کو قابو کرنے کی کوششیں کرنے لگے، مگر اس میں جانے اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ سب اس کے سامنے بے بس نظر آ رہے تھے۔ اس کی حالت نے ناہید اور ماہ رخ سمیت جیلہ بی بی کی بھی چیخیں نکلوا دی تھیں۔ وہ تینوں بڑی طرح سے روتے ہوئے میر کو تڑپا دیکھ رہی تھیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سرا یکدم پورے کا پورا گھوم گیا۔ اس طرح کہ اس کا چہرہ اس کی پشت کی طرف چلا گیا اور بالوں سے بھری گدی سینے کی طرف آگئی۔ ایسے۔۔۔ جیسے وہ کوئی انسان نہیں چابی والا کھلوتا ہو۔ شاہ میر کی یہ گت دیکھ کر ناہید اور ماہ رخ کی دلدوز چیخیں نکلیں اور پھر وہ دونوں وہیں بیہوش ہو کر گر گئیں۔ جیلہ بی بی کا بھی خوف کے مارے برا حال تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں، مگر جی کڑا کر کے خود کو سنبھالتی فوراً ناہید اور ماہ رخ کی طرف لپکی تھیں۔ رضا میر، منور اور انور اس افتاء پر خوف اور دہشت کے ساتھ ساتھ عجیب طرح کی اذیت میں بھی مبتلا ہو چکے تھے۔ مگر پھر بھی خود کو کمزور کرتے ہوئے اسٹیل میر کو

سنجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔
 "انہیں چھوڑوں گا۔۔۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ ایک ایک سے بدلہ لوں گا۔۔۔ چن چن کر ماروں گا تم سب کو۔۔۔ کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔!!"
 گیارہ سالہ شاہ میر کے منہ سے نکلنے والی آواز، ہرگز بھی گیارہ سالہ بچے کی تو نہیں تھی۔

"کون ہو تم۔۔۔؟؟ اور کیا بگاڑا ہے میرے بچے نے تمہارا۔۔۔؟؟ کیوں پیچھے پڑ گئے ہو اس معصوم کے۔۔۔؟؟ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے جان چھوڑ دو ہماری۔۔۔ ارے۔۔۔ ہماری تو کسی انسان سے بھی کبھی کوئی دشمنی نہیں رہی تو پھر کسی دوسری مخلوق سے دشمنی کیسے مول لے سکتے ہیں ہم بھلا۔۔۔؟؟"
 "رضا میر سے تو پہلے ہی بیٹے کی حالت نہیں دیکھی جا رہی تھی، اس پر یہ نئی افتاد۔۔۔ انکے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز ہی ہو گیا اس لیے وہ ہاتھ جوڑ کر روئے ہوئے پھٹ سے پڑے تھے۔

اب کیوں معافیاں مانگ رہے ہو۔۔۔؟؟ پہلے تو اپنے بچوں کو کھلی چھوٹ دیتے ہو۔۔۔ انہیں تمیز تہذیب سکھانے کی بجائے، التالاؤ پیار میں اس قدر بگاڑ دیتے ہو کہ یہ چھوٹے بڑے کی تمیز ہی بھول جاتے ہیں۔ ناقربانیاں کرنے لگتے ہیں۔ بے ادب، بدتمیز اور بیہودہ ہو جاتے ہیں۔ اور تم لوگ۔۔۔ تم لوگ ان کی ایسی حرکتوں کو ان کی معصوم شرارتیں سمجھ کر خوش ہوتے رہتے ہو۔۔۔ ارے واہ۔۔۔ کسی جان مانی اور آپکی ادا ٹھہری۔۔۔؟؟ بس۔۔۔ بہت کر لیا میں نے برداشت۔۔۔ مگر اب۔۔۔ اب اور نہیں۔ اب تو سزا ملے گی۔ اور مل کر ہی رہے گی۔ اس لڑکے کو تو میں نے نہیں چھوڑنا۔ اور اس کے بعد اب سب بچوں کی باری بھی آئے گی جو بھری دوپہروں میں سنسان قبرستانوں کو کھیل کا میدان سمجھ کر کد کڑے لگاتے پھرتے ہیں۔!!"

"بس۔۔۔ عبدالجلال بس۔۔۔!! بہت ہو گیا۔ ان بچوں کی غلطی سے زیادہ تم انہیں سزا دے چکے ہو۔ اب کیا جان لو گے ان معصوموں کی۔۔۔؟؟" اسی بھاری آواز میں شاہ میر کے منہ سے نکلنے والے

بولناک انکشافات سننے رہتا میر کی پریٹ میں سننا ہستی روزا کی تھی۔ ابھی وہ اس محلے سے سنبھلے بھی نہ تھے کہ دروازے کی جانب سے ابھرنے والے آواز نے انکے ساتھ ساتھ سب کا رخ دروازے کی جانب موڑ دیا۔ شاہ میر نے بھی چونک کر کھلے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ شاہ میر کے دونوں ماموں، شیر میر اور رشید میر دلہیز سے چند قدم آگے کھڑے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ ایک وراز قد جوان کھڑا تھا۔ جس نے آسانی رنگ کا سادہ سا لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید عمامہ باندھا ہوا تھا اور اس کی سیاہ کھنی داڑھی اس کے نورانی چہرے پر جی تھی۔ اس نو جوان کے پورے وجود سے نور کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔۔۔ خصوصی طور پر اس کی روشن چمکدار آنکھیں۔۔۔ جن سے نکلنے والی روشنی کی لہر نے شاہ میر کو پریشان سا کر کے رکھ دیا تھا۔

"اودہ۔۔۔ عبدالکریم۔۔۔!! تو آ ہی گئے تم پھر میرا راستہ کاٹنے کے لئے۔۔۔ منع کیا تھا ناں میں نے تمہیں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔۔۔ میں کسی کو بھی معاف نہیں کرنے والا۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔!!" عبدالکریم کے سنجیدہ انداز سے کئے گئے سوال کے جواب میں۔ شاہ میر کے منہ سے پھر وہی گھن گرج سے پھر پور بھاری آواز برآمد ہوئی تھی۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی شاہ کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ وہ بری طرح سے چیخ، چلا رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اچھل اچھل جا رہا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی گردن ایک بار پھر پیچھے کو جا گئی۔ اس کی حالت نے ایک بار پر سب کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ ناہید اور ماہ رخ جو چند لمحے پہلے ہی ہوش میں آئی تھیں ایک بار پھر چیخنے لگی تھیں۔

"بھائی جان میرا بچہ۔۔۔ ہائے میرا میرد۔۔۔ بھائی جان۔۔۔ میرے بچے کو بچالیں۔۔۔ بھائی جان۔۔۔!!" ناہید تڑپ تڑپ کر روتی ہوئی بھائیوں کی سمت لپکی تھیں اور پھر اسی طرح روتے کر لاتے ان کی بانہوں میں ہی جھول گئی تھیں۔ کچھ ہی حال ماہ

”محمد شبیر صاحب۔۔۔ آپ ان بیبیوں کا بھر لے جائیں۔ اور جب تک میں زندہ ہوں انہیں اندر مت بلائیے گا۔۔۔ اور ہاں۔ ایک گلاس پانی کا منگوا دیں مجھے۔۔۔“ عبدالکریم نای نو جوان نے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا تو شاہ میر نے بے چینی سے پہلو بدلا اور پھر بے حد غصے سے انہیں گھورنے لگا۔

”عبدالکریم۔۔۔ تم نے سنا نہیں۔۔۔؟؟ میں نے کیا کہا ہے تم سے۔۔۔ جاؤ، چلے جاؤ اور انہیں انکے حال پر چھوڑ دو۔ میں اپنا بدلہ لئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔!!“ عبدالجلال کی بھاری آواز اکیلا رہا۔ شاہ میر کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ مگر عبدالکریم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی اطمینان سے بیٹھنے اس پانی پر دم کر رہے تھے جو منور نے انہیں لا کر دیا تھا۔

”عبدالجلال۔۔۔!! ضد چھوڑ دو۔ کیا ملے گا تمہیں ان سے بدلہ لے کر۔۔۔؟؟ یہ بچے تو نادان ہیں۔ مگر تم تو سمجھدار ہونا۔۔۔ جانتے ہونا اچھی طرح سے کہ انتقام اور بدلے کی راہ کس قدر خطرناک ہوتی ہے۔ مسلمان ہونا تم بھی۔ اللہ اور اس کی نبی آخر الزمان کے ماننے والے۔۔۔ تو پھر تم اپنے پیارے نبی ﷺ کا فرمان کیسے بھول سکتے ہو۔؟؟ بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دینا سب سے اعلیٰ اور افضل عمل ہے۔۔۔ تو اب تم بھی ان کی نادانی کو بھول کر انہیں معاف کر دو۔ اور لو۔۔۔ یہ پانی پی لو۔۔۔ اس کی برکت سے تمہارا غصہ بھی کم ہو جائے گا اور تمہیں فیصلہ کرنے میں بھی آسانی ہو گی۔!!“ عبدالکریم نے دم کیا ہوا پانی شاہ میر کی طرف بڑھاتے ہوئے رسان سے کہا تو وہ بغیر پلک جھپکائے، اسی طرح غصے سے انہیں گھورتا چلا گیا۔

”عبدالجلال۔۔۔ غصہ تھوک دو۔ اور میرا کہنا مان لو۔۔۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ □□□□□ □□□□□ طرف سے کوئی جواب نہ پا کر عبدالکریم نے پھر کہا تو وہ بھڑک سا گیا۔

”نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ ان کی غلطی تھی ہی

معمولی نہیں تھی کہ میں اسے نادانی سمجھ کر بھول جاؤں۔۔۔ سزا تو میں انہیں دے کر ہی رہوں گا تا کہ یہ لوگ کچھ تو سبق سیکھیں۔“ عبدالجلال نے رضا میر اور انکے قریب کھڑے شبیر صاحب اور رشید میر کو بری طرح گھورتے ہوئے کہا تو وہ بے بسی اور تاسف کے عالم میں سر جھکا کر رہ گئے۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو عبدالجلال۔۔۔ مگر اکیلا میری بھی مان لو۔۔۔ کیونکہ یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ ہم انسانوں کی طرح تمہاری بھی کچھ حدود مقرر ہیں۔ اگر تم ان سے تجاوز کرو گے تو بلاشبہ نافرمانوں میں شمار ہو گے۔ اور تم ایک اچھے اور نیک قبیلے سے تعلق رکھتے ہو۔ نیکو کاروں میں شمار ہوتا ہے تمہارا اور تمہارے بزرگوں کا۔۔۔ تو کیا تم چاہو گے کہ ایک معمولی سے غصے اور انتقام کی وجہ سے تم دھتکار دیئے جاؤ۔ اور پھر تمہاری وجہ سے تمہارا قبیلہ بدنام ہو جائے۔؟؟ کیا تم ایسا پسند کرو گے عبدالجلال۔۔۔؟؟ بتاؤ مجھے۔ کیا یہ سب تمہیں اچھا لگے گا۔۔۔؟؟!!“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو عبدالکریم۔۔۔!! میں واقعی نہیں چاہتا کہ میں اپنی حدود سے تجاوز کر کے نافرمان اور گستاخ بن جاؤں۔۔۔ اپنے غصے اور انتقام کی آگ میں اپنے معزز قبیلے کا نام بدنام کر ڈالوں۔۔۔ مگر میں کیا کرتا۔۔۔؟؟ تم خود انصاف کرو عبدالکریم۔۔۔ میں نے کئی بار منع کیا تھا انہیں۔۔۔ منگو بابا کے ہاتھ کئی بار ان لوگوں کو پیغام بھجوئے کہ اپنے بچوں کو کنٹرول میں رکھیں۔۔۔ ان کا خیال رکھیں۔ منگو بابا نے ان بڑوں کو متنبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اب بچوں کو بھی کئی بار منع کیا تھا کہ یہ لوگ قبرستان میں کھیلنے کودنے مت آیا کریں۔۔۔ قبرستان کھیل کا میدان نہیں ہوتا۔۔۔ یہ تو جائے عبرت ہے، یہاں آ کر تو سب کی مستیاں، سب کی شرارتیں دم توڑ دیتی ہیں۔۔۔ مگر یہ بچے۔۔۔ یہ شرارتی اور نافرمان بچے کسی کی سنتے ہی نہیں۔۔۔ بلکہ، میں تو کہوں گا کہ ان بچوں کے ساتھ ساتھ انکے والدین کا بھی برابر کا قصور ہے۔۔۔ خاص طور سے ان کی مائیں۔۔۔ جو خود تو گرمیوں کی بھری دوپہروں میں کچے چلا کر، ٹھنڈے نیم تار ایک کمرے بند کر کے

ہی ہیں ناں۔۔۔ انہیں تو ہم معمولی سبز لٹیں کر کے چھوڑ دیتے ہو۔۔۔ تو پھر انہیں کیوں نہیں۔۔۔؟؟
 "عبدالکریم نے نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہا تو عبدالجلال (شاہ میر) انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

غلطی۔۔۔ تم اسے غلطی کہہ رہے ہو عبدالکریم۔۔۔؟؟ انہوں نے غلطی نہیں گناہ کیا ہے۔۔۔ گناہ۔۔۔ اور معافی صرف غلطی اور نادانی کی ملتی ہے۔۔۔ گناہ کی تو سزا ہوتی ہے۔۔۔ اور میں انہیں انکے گناہ کی سزا دینے ہی آیا ہوں۔۔۔ تم جو بار بار ان کی حمایت کرتے جا رہے ہو۔۔۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا ہے۔۔۔؟؟ ارے۔۔۔ یہ تو ہم بھی مانتے ہیں کہ بچے سب کے سانچے ہوتے ہیں۔۔۔ اور کھیلنا کودنا۔۔۔ شرارتیں کرنا۔۔۔ بچوں کا پیدا کنشی حق ہوتا ہے۔۔۔ اسی لئے ان کی معمولی شرارتوں اور کوتاہیوں کو ہم نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔۔۔ اپنے بچوں کی طرح انہیں بھی بچہ سمجھتے ہوئے ہنس کر نظر انداز کر دیا کرتے ہیں۔۔۔ کیونکہ بچے تو ہمیں بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔۔۔ چاہے وہ انسانوں کے ہوں یا ہم جنوں کے۔۔۔ اور پھر ہماری طرح یہ بھی تو اللہ کی مخلوق ہیں۔۔۔ اور اللہ کی مخلوق کو تنگ کرنے کی نہ ہمیں اجازت ہے اور ہی حکم۔۔۔ ہمیں بھی امن اور سکون سے رہنا بہت پسند ہے۔۔۔ مگر اس روز۔۔۔ اس روز تو حد ہی ہو گئی تھی عبدالکریم۔۔۔ ان شرارتی بچوں نے کل کر پہلے تو احاطے والے مزار شریف پر خوب دھما چوڑی مچائی۔۔۔ ہمارا سکون برباد کر کے رکھ دیا اور پھر رہتی کسر اس لڑکے نے پوری کر دی۔۔۔ یہ جھنڈ والے احاطے میں گندے جوتوں سمیت گھستا چلا آیا۔۔۔ تمہیں پتا ہے۔۔۔ وہاں درس قرآن پاک ہو رہا تھا۔۔۔ اس قدر مقدس محفل، اتنا پاک ماحول اور ایسے میں یہ نالائق چھپنے کے چکروں میں محفل میں گھس آیا۔۔۔ اپنے غلیظ جوتوں سے ساری چاندنیاں گندی کر دیں۔۔۔ اپنے دھیان میں بیٹھے درس سنتے ہمارے معزز مہمانوں کے ہاتھ پاؤں چل کر رکھ دیئے۔۔۔ اور پھر اسی پر بس نہیں کیا۔۔۔ اندھا و خند و وڑتا ہوا سیدھا

گاہنی صاحب میں گھستا چلا گیا۔۔۔ اتنا بتاؤ تم خود ہی

سو جاتی ہیں۔۔۔ اور اپنے بچوں کو باہر نکال دیتی ہیں۔۔۔ آوارہ گردی کرنے اور لور لور پھرنے کے لیے۔۔۔ اور ایسا کرتے ہوئے انہیں لمحہ بھر کو بھی خیال نہیں آتا کہ ان سے زیادہ حفاظت کی ضرورت ان معصوموں کو ہوتی ہے۔۔۔ یہ پھول سے کول اور نازک بچے۔۔۔ ذرا سی بے توجہی اور بے احتیاطی سے جھلس کر رہ جاتے ہیں۔۔۔ مرجھا جاتے ہیں۔۔۔ مگر یہ عورتیں۔۔۔۔۔ ان بیوقوف عورتوں کو تو سوائے باتیں بھگوانے اور سونے سے ہی فرصت نہیں ملتی، تو یہ کیا رکھیں گی اب پھولوں اور کلیوں کا خیال۔۔۔ اسی لیے یہ خود بھی نقصان اٹھاتی ہیں اور ان کی لاپرواہی کی وجہ سے انکے بچے بھی ناگہانی مصیبتوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔۔۔ اب بھی یہی ہوا ہے۔۔۔ ہمارے بار بار منع کرنے کے باوجود جب یہ انسان اور انکے بچے باز نہیں آئے تو پھر مجبوراً مجھے خود ان کی گوشمالی کے لئے میدان میں اترنا پڑا۔!!

"عبدالجلال کا غصہ کسی طرح کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ کمرے میں موجود سب افراد سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔ کمرے کی دہلیز کے باہر ناہید اور جلیہ برستی آنکھوں سے شاہ میر کو دیکھ رہی تھیں جو غصے سے بولتا ہوا انہیں ہی گھور رہا تھا۔ شاہ میر کے منہ سے ساری بات سن کر ان کا سر بھی شرم سے جھک گیا تھا۔

"ٹھیک ہے عبدالجلال۔۔۔ تم جو بھی کہہ رہے ہو بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ مگر یہ بھی تو دیکھو ناں کہ بچوں کو کوئی کتنا باندھ کر رکھ سکتا ہے۔ بچپن تو بچپن ہی ہے عبدالجلال۔۔۔ یہ تو ہوا کے جھونکے کی طرح ہوتا ہے۔۔۔ شرارت اور مستی سے بھر پور۔۔۔ اور پھر اگر بچے شرارتیں نہیں کریں گے تو انہیں بچہ کون کہے گا۔۔۔ تم مانو یا نہ مانو مگر بچے تو سب کے ہی سانچے ہوتے ہیں۔۔۔ اور ہمارے بچوں کی طرح تمہارے بچے بھی ایسے ہی شرارتیں کرتے ہیں۔۔۔ ہمارے بچوں کی طرح تمہارے بچے بھی کھیلنے کو دتے بڑے ہوتے ہیں۔۔۔ گرتے بڑتے ہی سب کچھ سیکھتے ہیں۔۔۔ تو پھر تم ان بچوں کی غلطی کی انہیں اتنی بڑی سزا کیوں دینا چاہتے ہو۔۔۔ جبکہ تمہارے بچے بھی تو غلطیاں کرتے

بھلا۔ کیا یہ غلطی تھی اس قابل کہ میں اسے معاف کر دیتا۔۔۔ بلکہ میں تو اسے گناہ ہی سمجھتا ہوں۔۔۔ معزز قاضی صاحب کی اس قدر بے عزتی کی اس لڑکے نے اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ سب ان کی غلطی تھی۔!!

عبدالجلال کا جلال ایک بار پھر عود کر آیا تھا۔۔۔ میں مانتا ہوں عبدالجلال۔۔۔ تم جو کہہ رہے ہو سب درست ہے۔۔۔ مگر اب تو ان سے غلطی ہو گئی ناں۔۔۔ یہ بچے ہیں اور انہیں کیا پتا تھا کہ تم لوگوں کی محفل ہو رہی ہے وہاں۔۔۔ دیکھنے میں تو وہ جگہ خالی اور سنسان ہی دکھائی دے رہی تھی ناں۔۔۔ اس لیے شاہ میر کو اندازہ نہیں ہو پایا ہوگا۔۔۔ اور ویسے بھی یہاں تو بڑے بڑے سب کچھ دیکھتے بوجھتے جان بوجھ کر دوسروں کا نقصان کر جاتے ہیں۔۔۔ یہ تو پھر بچے ہیں۔۔۔ ناوان ہیں۔۔۔ مگر تم تو داناو پینا ہوناں۔۔۔ تم اپنی دانائی کا ثبوت دو اور انہیں ایک بار معاف کرو و انہیں۔۔۔ میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ اب اس خاندان کا کوئی بچہ کبھی بھی کھلنے کوونے کے لیے دیوانوں اور قبرستانوں کا رخ نہیں کرے گا۔ کیوں شبیر صاحب۔۔۔ میں نے ٹھیک کہا ناں۔۔۔؟؟؟ عبدالکریم نے شبیر میر کی سمت دیکھتے ہوئے مان بھرے انداز میں کہا تو فوراً آگے بڑھے۔۔۔

”جی جناب۔۔۔ آپ درست فرما رہے ہیں۔ اس خاندان کا بزرگ ہونے کے ناطے میں اپنی ذمہ داری پر وعدہ کرتا ہوں کہ اب ہمارا کوئی بھی بچہ، کبھی بھی بلا وجہ اور اکیلا سنسان اور دیوان جگہوں میں نہیں جائے گا۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔۔۔!!“

شبیر میر نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر وعدہ کیا تو شاہ میر انہیں دیکھنے لگا۔۔۔ ”لو عبدالجلال۔۔۔ اب تو یہ پانی پی لو۔۔۔ اور یقین رکھو کہ اب ایسا کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ۔۔۔ اب ان لوگوں کی طرف سے تمہیں کبھی کوئی شکایت نہیں ملے گی۔!!“

”عبدالکریم نے مسکراتے ہوئے پانی کا گلاس ایک بار پھر آگے بڑھاتے ہوئے نری سے کہا۔

”ٹھیک ہے عبدالکریم۔۔۔!! اگر یہ لوگ پکا وعدہ کرتے ہیں تو پھر میں بھی انہیں آخری موقع ضرور دوں گا۔ میں انہیں معاف کرنے کو تیار ہوں۔۔۔ لیکن

اب اگر ان کی طرف پھر کوئی ایسی ایسی حرکت ہوئی تو ذمہ دار یہ خود ہوں گے۔۔۔!!“ عبدالجلال (شاہ میر) نے انکے ہاتھ سے پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے کہا تو سب کے ر کے سانس جیسے بحال ہونے لگے۔ پھر ان کی نگاہوں کے سامنے ایک اور کرشمہ ہوا۔ شاہ میر نے گلاس اپنے چہرے کے سامنے کیا اور اس میں موجود پانی لیکھت ایسے غائب ہو گیا جیسے کسی نے ایک سانس میں ہی اسٹرا سے کھینچ لیا ہو۔

”ٹھیک ہے عبدالکریم۔۔۔ جارہا ہوں میں۔ اور وہ بھی صرف تمہارے کہنے پر۔۔۔ ویسے بھی ایک بات تو تم نے ٹھیک ہی کہی۔۔۔ نہ سارے انسان ایک جیسے ہوتے ہیں اور ناں ہی سارے جنات۔ ہر جگہ ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔۔۔ اچھے، نیک اور صالح بھی اور شرارتی، بدتمیز اور مغرور بھی۔۔۔ اور رانی شبیر میر صاحب اور انکے خاندان کی بات تو یہ لوگ واقعی اچھے اور نیک انسان ہیں۔ رحمدل اور مخلص۔۔۔ یا رکھنا میر صاحب، آپ لوگوں کی اسی نیک دلی اور عاجزی نے آپ کو بچانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔۔۔ اللہ نے آپ لوگوں پر اپنی خاص عنایات، خاص رحمتیں نازل فرمائی ہیں، اور اس کی ان عنایات کو اس کی راہ میں ایسے ہی خرچ کرتے رہا کریں۔۔۔ و نیا اور آخرت میں فلاح اور کامرانی پائیں گے آپ لوگ۔۔۔ میں اب جارہا ہوں۔ اس امید پر کہ آپ اپنا وعدہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ شاہ میر نے خالی گلاس واپس عبدالکریم کی طرف بڑھاتے ہوئے صلح جو انداز سے کہا تو سب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں بھرپور یقین دلایا تھا۔

”لیکن، ان لوگوں کو کیسے پتا چلے گا عبدالجلال کہ تم نے انہیں معاف کر دیا اور شاہ میر کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔۔۔؟؟؟ تم جاتے جاتے اپنی کوئی نشانی دیتے جاؤ تا کہ ان لوگوں کو اطمینان ہو جائے اور انہیں یقین آ جائے کہ تم نے انہیں معاف کر دیا۔“

”عبدالکریم نے گلاس پکڑتے ہوئے میر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔۔۔ تو پھر اللہ تمہارا۔۔۔ لو! میں چلا۔۔۔!!“

”شاہ میرا بے منتا ہے گزشتہ اتنی عبدالجلال کی آواز
برآمد ہوئی اور اس کے ساتھ ہی وہ لہرا کر ایک طرف
لڑھک گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کمرے میں موجود
واحد دیوار گیر کھڑکی کے سامنے پڑا بھاری دبیز پردہ
ایک دم ہوا میں بلند ہوتا چلا گیا۔ اور پھر پوری طرح
ایسے اوپر اٹھ گیا کہ چھت کے ساتھ جالگا۔ اس کے
ساتھ ہی بند کھڑکی کا شیشہ زوردار آواز کے ساتھ ٹڑخ
گیا، یوں جیسے کوئی بھاری بھر کم گیند در سے اڑتی آئی
ہو اور پوری قوت کے ساتھ شیشے سے ٹکرائی ہو۔ سب
دم بخو دکھڑے یہ سب ہوتا دیکھتے ہی رہ گئے۔

”رضا میر صاحب۔۔!! آپکا بیٹا ماشا اللہ اب
بالکل ٹھیک ہے۔ اب آپ لوگوں کو بہت احتیاط سے
کام لینا ہوگا۔ آئندہ کو شش کیجئے گا کہ بچے ایسی
خطرناک جگہوں کے قریب سے بھی نہ گزرنے
پائیں۔۔۔ آپ پر اللہ کی مہربانی ہوگئی ہے۔ اب آپ
بھی اپنا وعدہ ہمیشہ یاد رکھئے گا۔

جیسے ہی شاہ میر کو ہوش آیا، عبدالکریم صاحب
نے اس کا ہاتھ رضا میر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے نری
سے کہا تو فرط مسرت سے سب کی آنکھوں میں آنسو آ
گئے۔ عبدالکریم نے ناہ نور کو بھی اندر بلوایا۔ ناہید اور
جیلہ بی بھی اس کے ساتھ ہی آگئی تھیں۔ انہوں نے
مزید پانی منگوا کر اس پر دم کیا اور پھر وہ پانی دونوں
بچوں کو پلایا گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ناہید اور
رضا میر کو پڑھنے کے لیے کچھ آیات اور وظیفے بھی
بتائے۔ وہ سب ان کے دل سے ممنون ہو رہے تھے۔

”ہم آپکا یہ احسان کیسے اتار پائیں گے عبدالکریم
صاحب۔ آپ کو تو اللہ پاک نے ہمارے لیے فرشتہ بنا
کر بھیجا ہے۔ آپ ہمیں بتائیں کہ ہم آپکی کیا خدمت
کر سکتے ہیں۔!!“ رضا میر صاحب نے اگلے ہاتھ
چومتے ہوئے بھیگے لہجے سے کہا تو وہ مسکرانے لگے۔
”نہیں۔۔۔ نہیں رضا صاحب۔۔!! ایسا مت کہیں۔
میں بھی اللہ کا ایک معمولی سا بندہ ہی ہوں اور اس کے
حکم پر ہی آپ کی مدد کرنے آیا ہوں۔ آپ مجھے
بشر مندہ مت کریں۔ مجھے آپ کی دعاؤں کے علاوہ
اور کچھ بھی نہیں چاہئے۔۔۔ آپ بس میرے حق میں دعا

کر دیا کیجئے۔ میرے دل سے یہی بہت ہے۔۔۔ ہاں
البتہ، جیسا کہ عبدالجلال نے کہا کہ آپ رحمناں اور
نیک انسان ہیں۔ پھر اللہ پاک نے آپکو بہت نواز
رکھا ہے۔ اس کی خاص رحمت ہے آپ سب پر۔۔۔
آپ بس اس کی دی ہوئی نعمتوں سے ہمیشہ اس کی
مخلوق کی مدد کرتے رہیے گا، جس طرح پہلے بھی کرتے
آئے ہیں۔ حقداروں کو ان کا حق اسی طرح ادا کرنے
میں جیسے پہلے گرم جوشی اور جلدی کا مظاہرہ کرتے
آئے ہیں، بس اسی طرح اپنے اس چلن کو برقرار
رکھئے گا۔۔۔ بس، یہی ہماری خدمت ہے۔۔۔ اب
اجازت دیجئے۔۔۔ ہمیں اللہ کے بندوں کی خدمت
کرنے کہیں اور پہنچنا ہے۔!!

”عبدالکریم باری باری ان سب سے ہاتھ ملا کر
باہر نکلے تو رشید میر کے ساتھ ساتھ رضا اور منور بھی
انکے پیچھے لگے۔ رشید میر نے انہیں ان کی مطلوبہ جگہ
تک چھوڑنے کی پیشکش بھی کی مگر وہ نری سے انہیں منع
کرتے ہوئے اکیلے ہی باہر چلے گئے۔

☆☆☆

”رضا۔۔!! ہم تم سے بہت شرمندہ ہیں کہ ہم
ان بچوں کے ناموں ہونے کا حق بھی ٹھیک سے ادا
نہیں کر پائے۔ یہ بچے ہم سے ملنے اتنی دور آتے ہیں،
تو ان کی حفاظت کرنا بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے۔ مگر
بھائی، ہم سے چوک ہوگئی۔ منگو نے ہمیں بارہا
اشاروں کنائیوں میں سمجھانے کی کوشش کی، مگر ہم نے
اس کی کسی بات کو بھی قائل توجہ ہی نہ سمجھا اور نہ ہی کسی
قسم کی کوئی احتیاط کی۔۔۔ بس ہمیشہ یہ ہی سوچتے رہے
کہ ابھی یہ سب بچے ہیں۔ ذرا بڑے ہو جائیں گے تو
خود ہی سمجھ جائیں گے۔۔۔ اور پھر ہمارے دل میں یہ
خیال بھی تھا کہ اگر اس عمر یہ شرارتیں نہیں کریں گے تو
پھر کیا بڑھاپے میں کریں گے۔۔۔ مگر ہم غلط تھے۔۔۔
ہمارا خیال غلط تھا۔۔۔ ہماری ذرا سی لاپرواہی اور ان
بچوں کی ذرا سی شرارت کی وجہ سے ہمارے میرو کی یہ
حالت ہو جائے گی۔ ایسا تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں
تھا۔۔۔ بخدا اگر ہمیں ذرا سا بھی اندازہ ہو جاتا تو ہم
اسکی لاپرواہی کبھی نہ کرتے۔۔۔ ہمیں معاف کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

دور رضا۔۔۔ ہماری وجہ سے آپہیں یہ تکلیف برداشت کرنی پڑی، اتنی اذیت، اتنا دکھ جھیلنا پڑا۔۔۔ ہمیں معاف کر دو یا ر۔!!

"شعبیر اور رشید میر نے بہن بہنوئی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے معافی مانگی تو وہ تڑپ کر رہ گئے۔
"ارے نہیں بھائی جان۔۔۔!! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔؟؟ یہ سب تکلیفیں تو ہماری قسمت میں لکھی تھیں شاید۔ یہ اللہ کی آزمائش تھی۔ اور اور شکر ہے مولا پاک کا کہ اس کی مدد سے ہم اس آزمائش سے بچر و خوبی نکل بھی آئے۔ آپ ہم سے معافی مانگ کر ہمیں شرمندہ مت کریں پلیز۔!!

"اور ویسے بھی بھائی جان۔۔۔!! ہمارا بچہ اللہ کے فضل سے ٹھیک ہو گیا۔۔۔ ہمیں اور کچھ نہیں چاہئے۔ اس کا بڑا احسان ہے ہم پر۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ یہ عبدالکریم صاحب کہاں سے ملے آپکو۔۔۔؟؟ آپہیں تو واقعی اللہ نے ہم ارے لیے فرشتہ ہی بنا کر بھیجا تھا۔ اللہ بھلا کرے ان کا، میرا تو رواں رواں اسنے لئے دعا گو ہے۔!!" شعبیر اور رشید صاحب کی جذباتی باتوں نے ماحول کو ایک بار پھر جو جمل کر دیا تھا۔ رضا میر اور ناہید انہیں شرمندہ دیکھ کر خود بھی شرمندہ ہو رہے تھے۔ اس لئے دونوں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ اور اسی وقت ناہید نے عبدالکریم کا بھی پوچھ لیا۔۔۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو ناہید۔۔۔ اللہ نے واقعی اس فرشتے کو ہماری مدد کے لئے ہی بھیجا تھا۔۔۔ انہیں منگو میرے پاس لایا تھا۔ وہ غریب بھی میری حالت کا سن کر بہت پریشان تھا۔ پھر آج صبح ہی صبح وہ انہیں لئے میرے پاس چلا آیا۔ میں نے اسنے پوچھنے پر میری حالت کا بتایا تو وہ فوراً ہمارے ساتھ یہاں آنے کو تیار ہو گئے۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔ بڑے ہی نیک دل انسان ہیں۔ اور میری تو اب یہ دعا ہے کہ اللہ ہمیں اپنا وعدہ نبھانے کی توفیق ادا کرے۔ ہم اپنے بچوں کی اچھی تربیت کر سکیں اور انہیں سکھا سکیں کہ خود بھی امن اور سکون سے رہیں اور اللہ کی ساری مخلوق کو بھی امن اور سکون سے رہنے دے۔۔۔ ورنہ کوئی ہلکی سے کوتاہی ایسی بڑی مصیبت بن کر ہم پر پھر ٹوٹ سکتی ہے کہ ہم

اس کا خمیازہ ہی بھگتے رہ جائیں۔!!
شعبیر میر نے اس طرح سے کہا کہ سب ایک بار پھر دہل کر رہ گئے۔

قارئین کرام۔!! یہ نہ تو کوئی قصہ ہے اور نہ کہانی۔ اسے آپ آپ بتی بھی کہہ سکتے ہیں جگ بتی بھی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ظہور پذیر ہوتے دیکھا۔ اور سچ کہوں تو اس کی دہشت سے ابھی تک خود کو آزاد نہیں کر پائی۔ ابھی بھی بھری دو پہروں میں سنان جگہوں، ویران قبرستانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک انجانا سا خوف میری ریڑھ کی ہڈی میں سنبھاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔۔۔ گو کہ اس واقعے کو بیٹے بھی کئی سال گزر چکے۔ اس کی ہیبت اور اس کے اثرات ابھی بھی باقی ہیں۔ اس دن کے بعد سے ہماری فیملی کا کوئی بھی بچہ بھی بھی تنہا، ویران اور اجاڑ جگہ پر نہیں گیا۔ ہم نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ ہمارے بزرگ جو وعدہ کر گئے تھے، ہم اسے اچھی طرح نبھا سکیں۔ اور اب یہی ذمہ داری ہماری اگلی نسل تک منتقل ہو چکی ہے۔ اب ہمارے بچے اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان کی ذات سے کسی دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، چاہے وہ انسان ہو، اللہ کی کوئی اور مخلوق۔۔۔ آپ بھی خیال رکھئے گا۔ کہ ہمیں آپکے بچوں سے بھی کوئی ایسی غلطی۔ کوئی ایسی خطا نہ سر زد ہو جائے جس کا خمیازہ آپکے پورے خاندان کو اٹھانا پڑ جائے اور کھیل ہی کھیل میں بات اتنی نہ بگڑ جائے کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اپنا اور اپنے بچوں کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی بنائی تمام مخلوق کا خیال رکھنا بھی ہم سب کا فرض ہے۔ اللہ رب العزت نے ہم انسانوں کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے ہم پر ذمہ داری بھی زیادہ عائد ہوتی ہے کہ ہم اس شرف کے تمام تقاضوں کو اچھے طریقے سے نبھائیں۔ اور اپنا فرض نہ صرف پہچانیں بلکہ اس پر دل و جان سے عمل بھی کریں۔ یہ ہی انسانیت کا تقاضا ہے اور یہ ہی انسانیت کی معراج۔

پرائیویٹ سوسائٹی کی دسویں خاص کہانی

بندر کا بیٹا

صداقت حسین ساجد



ایک ایسے باپ کی دل خراش داستان جو دولت کے لالچ میں اندھا ہو کر اپنی متاع گنوا بیٹھا

”تم پھر جا رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”اب کب واپس آؤ گے؟“

”تمہیں تو پتا ہی ہے ہماری ملازمت کا..... ملکی

حالات کہاں ٹھیک ہیں؟ جانے کب چھٹی ملے..... پہلے بھی بڑی مشکل سے چھٹی ملی تھی۔“

وہ کھڑے کھڑے ہی باتیں کر رہے تھے۔

”آپ لوگ بیٹھیں گے بھی..... یا کھڑے رہنے کا

ارادہ ہے؟“

نعمان نے کہا، تو وہ ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر

کپ شپ لگانے اور چائے پینے کے بعد اچانک کاشف بولا۔

”اگلے دن تم نے ایک بندر کے کسی بیٹے کی بات

کی تھی..... اس وقت میں نے توجہ نہیں دی تھی..... اب

بتاؤ کہ کیا بات تھی؟“

”کک..... کک..... کوئی بات نہیں..... کوئی

بات نہیں۔“

رات بہت ٹھنڈی تھی۔ گھر کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ بڑے کمرے میں انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ باپ بیٹا ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ کر ناش کھیل رہے تھے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ بیٹے نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر اس کے ابو کاشف کے دوست نادر کھڑے تھے۔

”آئیے..... چچا جان! اندر آ جائیے۔“ نعمان نے راستے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

نادر نے قدم آگے بڑھا دیے۔ نادر کو جوں ہی کاشف نے دیکھا، تیزی سے اٹھا اور اس کے گلے لگ گیا۔

”یار! کہاں تھا تو؟ میں کب سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“

”تمہیں پتا ہے کہ میں آج کل کتنا مصروف ہوں..... تین دن رہ گئے ہیں اور میں نے ابھی تیاری کرنی

ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

130 سچی کہانیاں

وہ تینوں بڑی توجہ سے پنچے کی

کہانی سن رہے تھے۔ صائقہ
نے پوچھا۔

”کیا آپ
نے

ناور اچانک پریشان ہو گیا۔

”بندر کا پنچہ..... کیا مطلب؟“

کاشف کی بیوی صائقہ حیرت سے
بولی۔

”ہاں ایک بندر کا پنچہ.....!“

! جو پر اسرار بھی ہے۔“ ناور

نے جواب دیا۔

”پر اسرار..... اونہہ

..... جو بات آپ لوگوں کو

سمجھ نہیں آتی..... آپ لوگ

اس کو پر اسرار اور مافوق

القدرت سمجھنے لگتے ہیں

..... اس کے علاوہ آپ کچھ

اور سمجھتے ہی نہیں ہیں

۔“ نعمان نے مذاق

اڑاتے ہوئے کہا۔

ناور نے

کاشف کی طرف

دیکھا اور پھر

Downloaded From
Paksociety.com

اسے آزمایا ہے؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”کیوں کہ میرا دل نہیں مان رہا کہ میں اس سے

اپنی تین خواہشیں پوری کروں۔“

کاشف پنچے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں

میں لالچ بھرا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ایک اور آدمی جب اپنی تین

خواہشات پوری کر لے گا، تو یہ پنچہ بے کار ہو جائے گا

..... ہے ناں؟“

”ہاں۔“

”جب تم نے اسے استعمال ہی نہیں کرنا، تو اسے

اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے؟“

”میں نے سوچا کہ اسے بیچ دوں..... مگر لوگوں کو

اس کے کمالات پر یقین نہیں آتا..... کچھ لوگ اس شرط

اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سوکھا ہوا بندر کا پنچہ نکال کر

سب کو دکھایا۔

”یہ ہے وہ پنچہ!!“

”آپ نے یہ کہاں سے لیا ہے؟“ نعمان نے

پوچھا۔

”آپ لوگوں کو تو پتا ہی ہے کہ آج کل میری

ڈیوٹی چترال میں لگی ہوئی ہے..... وہاں میری

ملاقات ایک ایسے کیلاش آدمی سے ہوئی، جو عجیب و

غریب شخصیت کا مالک تھا..... گندہ اور غلیظ..... مگر

لوگ اس کے پیچھے ایسے بھاگتے تھے..... جیسے وہ کوئی

پہنچا ہوا بزرگ ہو..... یہ پنچہ اس نے مجھے دیا تھا اور

مجھے بتایا تھا کہ اس پنچے سے تین آدمی اپنی تین تین

خواہشیں پوری کر سکتے ہیں..... وہ آدمی اس سے کام

لے چکے ہیں..... ایک رہ گیا ہے..... یہ پنچہ عام پنچہ

نہیں ہے۔“

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

پر راضی ہوئے کہ پہلے وہ اس بچے کو آزمائیں گے۔“
 اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے استعمال میں کرنا
 چاہتے۔“

”ہاں یہی بات ہے۔“
 کمرے میں ایسی خاموشی چھا گئی کہ لگتا تھا وہاں
 کوئی موجود ہی نہ ہو۔ کاشف اس کے ہاتھ میں موجود
 پتھر کو گھور رہا تھا۔ اچانک ناور بولا۔
 ”اس کو اپنے پاس رکھ کر میں نے کیا کرنا ہے۔۔۔۔۔
 اسے جلا دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے پتھر آگ میں پھینکنے کی کوشش کی۔
 کاشف نے اچھل کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا کر بولا۔
 ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”کاش! تم اسے جل جانے دیتے۔۔۔۔۔ تاکہ
 میرے دل میں جو اس کے بارے میں خوف سما گیا ہے
 وہ تو دور ہو جاتا۔“
 ”اگر تم اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے، تو مجھے
 دے دو۔“

”میں تو خود سے دور کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ میں یہ
 تمہیں دے تو دیتا ہوں، لیکن۔۔۔۔۔
 ”کیا لیکن۔۔۔۔۔؟“
 ”اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔“
 ”شرط۔۔۔۔۔ کیسی شرط؟“ کاشف جلدی سے بولا۔
 ”اس کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچا، تو اس کی
 ذمہ داری مجھ پر نہیں ہوگی۔“
 ”مجھے منظور ہے۔“

”کاشف! تم میرے دوست ہو۔۔۔۔۔ میری بات
 مانو۔۔۔۔۔ اس کو جل جانے دو۔۔۔۔۔ میرے دل میں اس
 کے حوالے سے انجانا سا خوف سما گیا ہے۔“
 ”تم بے فکر رہو۔۔۔۔۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔“
 ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔۔۔۔۔ اب
 تم جانو اور تمہارا کام جانے۔“
 ”اچھا! تم یہ بتاؤ کہ خواہش ظاہر کس طرح کی
 جاتی ہے؟“

”اسے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اونچی آواز میں
 اپنی خواہش ظاہر کرو۔۔۔۔۔ مگر میری خواہش یہ ہے کہ تم بائیں

معالے میں نہ ہی الجھو، تو بہتر ہے۔“
 مجھے ایسا لگ رہا ہے۔۔۔۔۔ جیسے میں کوئی جادو بھری
 کہانی سن رہی ہوں۔“ صائقہ نے جھرجھری لیتے
 ہوئے کہا۔

کچھ دیر سب لوگ باتیں کرتے رہے، لیکن اب
 کمرے کی فضا میں ایک انجانا سا خوف بھی چھا گیا تھا۔
 اچانک ناور اٹھ کھڑا ہوا۔

”کاشف! اب مجھے اجازت دو۔۔۔۔۔ کل میں
 چترال چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ
 آپ لوگوں کو کچھ نہ ہو۔۔۔۔۔ میری بات مانو اور اس پتھر کو
 جلا دو۔۔۔۔۔ اس کو اپنے پاس بھی نہ رکھو۔“

کاشف نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اسے گلے لگانے
 کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پیچھا دیے۔ پھر اسے باہر
 چھوڑنے کے لیے چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد واپس آیا، تو
 اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔ وہ کمرے کے
 درمیان میں کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

”اب میں اپنی پہلی خواہش بیان کرنے والا
 ہوں۔“

نعمان اٹھا اور کچھ دور جا بیٹھا جب کہ صائقہ نے
 کرسی کی پشت سے اپنا سر لگا دیا۔ کاشف نے اپنے کوٹ
 کی جیب سے ہنڈر کا پتھر نکالا۔ اسے بائیں ہاتھ میں پکڑ
 کر لڑتی ہوئی اونچی آواز میں بولا۔

”میری پہلی خواہش یہ ہے کہ مجھے ایک لاکھ روپے
 مل جائیں۔“

ابھی یہ لفظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ وہ
 اچانک بھیاںک آواز میں چیخ اٹھا۔ صائقہ اور نعمان
 بھاگ کر اس کے پاس پہنچے۔ نعمان نے اسے ہاتھ لگایا،
 تو اس کا جسم سن ہو رہا تھا۔ نعمان نے اپنے ابو کا سن جسم
 ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔ ابو!“

”یہ۔۔۔۔۔ یہ حرکت کر رہا تھا۔۔۔۔۔“
 ”کک۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟“ نعمان اور
 صائقہ چلا اٹھے۔

”مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ یہ پتھر چل
 رہا تھا حسب میں نے اپنی خواہش ظاہر کی، تو یہ زندہ ہو گیا

کو دیکھتے ہوئے آپ کے لیے کچھ رقم بھیجی ہے۔
کاشف کا چہرہ خوف سے بالکل زرو ہو چکا تھا۔ اس نے بڑی ہمت سے پوچھا۔
”کتنی رقم؟“

”ایک لاکھ روپے کا چیک۔“
”کیا؟؟؟؟؟“

صائقہ کی چیخ سے بے خبر کاشف نے اندھوں کی طرح اپنے ہاتھ آگے بڑھائے اور بے ہوش ہو گیا۔
نعمان کی لاش کب آئی۔ اسے کب دفن کیا گیا۔ انھیں کچھ ہوش نہیں تھا۔ انھیں تو نعمان کا منہ بھی کسی نے نہ دیکھنے دیا۔ یہ سب کچھ اچانک ہو گیا تھا۔ میاں بیوی کے دماغ چکر اٹھ گئے تھے۔ انھیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن..... لیکن..... جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے انھیں یقین ہوتا گیا کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ ساری کارروستانی بندر کے پیچھے ہے۔

☆.....☆.....☆

اب وہ دونوں خاموش رہنے لگے تھے۔ ایک رات کاشف کی آنکھ ابھی لگی ہی تھی کہ وہ صائقہ کی چیخ سن کر جاگ اٹھا۔

”کک..... کک کیا ہوا؟“

”بندر کا بچہ کہاں ہے؟“

”کیا ہوا؟“ کاشف نے پوچھا۔

”مجھے وہ چاہیے..... تم نے اسے جلا تو نہیں دیا کہیں؟“

”نہیں! وہ میری میز کے دراز میں پڑا ہے۔ لیکن..... ہوا کیا ہے یہ تو بتاؤ؟“

صائقہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگی۔

”بابا..... بابا..... میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، بھول گئی تھی کہ تم نعمان کے باپ ہونا! تمہیں یہ خیال کیوں نہیں سوجھا..... بابا..... بابا..... مگر میں تو ماں ہوں..... یہ خیال میرے ہی دل میں آنا چاہیے تھا..... میں اس کی ماں ہوں ناں!!“

”کک..... کک..... کیسا خیال..... کون سا خیال.....؟“

”ابھی تم اپنی دو خواہشیں پوری کر سکتے ہو ناں.....“

”کک..... کک..... کیا مطلب؟“
کاشف اس کا خیال جان کر لرز گیا۔
”ابھی بچہ اٹھاؤ اور اسے ہاتھ میں لے کر یہ خواہش ظاہر کرو کہ ہمارا بیٹا زندہ ہو جائے۔“
کاشف یہ سن کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ وہ بڑی آہستگی سے بولا۔

”کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟“

”وقت ضائع مت کرو..... جلدی کرو..... میرا بیٹا..... آہ میرا بیٹا.....“

”جاؤ جا کر سو جاؤ..... تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو۔“

”تم جلدی کرو..... میں کچھ نہیں سنوں گی..... ہمارا بیٹا زندہ ہو سکتا ہے..... اگر ایک خواہش پوری ہو سکتی ہے تو دوسری کیوں نہیں.....؟“

”وہ صرف ایک حادثہ تھا..... اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔“

”نہیں..... نہیں..... تمہیں دوسری خواہش ظاہر کرنا ہوگی..... ہمارا بیٹا زندہ ہو سکتا ہے۔“

وہ اسے میز کی طرف دھکیلنے لگی۔

”اے مرے ہوئے دس دن ہو چکے ہیں..... ہم اسے پہچان بھی نہیں سکیں گے..... تمہیں یاد ہے کہ لوگوں نے آخری بار ہمیں اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھنے دیا تھا..... وہ مشین میں کلا گیا تھا..... اس کا چہرہ اور اس کے اعضا ٹوٹ پھوٹ گئے تھے..... بڑی طرح مسخ ہو گئے تھے..... تم اسے اس حالت میں دیکھ کر خوف ہی سے مر جاؤ گی۔“

”نہیں..... کوئی ماں اپنے بیٹے سے ڈر سکتی ہے.....؟ کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو..... اسے واپس لاؤ..... بندر کا بچہ اسے واپس لا سکتا ہے۔“

کاشف مجبور ہو گیا۔ وہ میز کے پاس آیا اور دراز کھول کر بچہ نکالا۔ بچے کو چھوتے ہی اسے یوں لگا جیسے سردی کی ایک تیز لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی ہو۔ مدھیرے میں وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا تو دروازے سے نکل گیا۔ خوف اور دہشت سے اس کا جسم ٹھنڈے پتے سے ہلکا ہوا تھا۔ جب وہ صائقہ کے پاس پہنچا، تو اس کا

”کیا کر رہے ہو؟ دروازہ کھولنے دو۔۔۔۔۔ میرا بیٹا آ گیا ہے۔۔۔۔۔ میرا نعمان آ گیا ہے۔“ وہ خود کو چھڑانے کے لیے کاشف کو پیچھے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ ”مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ اسے باہر سردی لگ رہی ہے۔“

”خدا کے لیے دروازہ نہ کھولو۔“ کاشف کی آواز خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ”تم اپنے بیٹے سے ڈر رہے ہو۔۔۔۔۔ کیسے باپ ہو۔۔۔۔۔ نعمان! میرے بیٹے نعمان! میں آرہی ہوں دروازہ کھولنے۔“

دروازے پر دستک بار بار ہو رہی تھی۔ کمر اتار بیٹھا۔ صائقہ نے آخر خود کو چھڑا ہی لیا۔ وہ دروازے کی طرف بھاگی، تو کاشف بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ دروازے پر اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔

”کہاں ہے اس کی چابی؟ اسے کھول دو۔“ صائقہ کی بات سن کر کاشف دوسرے کمرے کی طرف بھاگا۔ اسے ٹھوکروں کی بھی پروا نہ تھی، جو اسے لگ رہی تھیں۔ وہ بندر کا پنچڈ ٹھونڈنے لگا۔ اس دوران صائقہ نے ایک اینٹ اٹھا کر تالے پر برساتی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ چیخ چیخ کر آوازیں دے رہی تھی۔ آخر اسے بندر کا پنچیل ہی گیا۔ صائقہ بھی تالا توڑ چکی تھی۔ وہ دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ کاشف نے نیچے کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اپنی تیسری اور آخری خواہش کا اظہار کر دیا۔

دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک کی آواز نوراً ہی بند ہو گئی۔ اتنے میں صائقہ نے کنڈی کھول لی۔ کاشف دروازے کی طرف دوڑا تا کہ اسے پیچھے جانے سے روکے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو صائقہ دروازہ کھول کر باہر جھانک رہی تھی۔ کاشف نے باہر دیکھا، تو قریبی گھر سے نکلنے والی ہلکی سی روشنی میں دیکھا کہ اس ویران اور سنسان گلی میں ایک سایہ نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ کاشف کی تیسری خواہش پوری ہو چکی تھی۔ صائقہ کے دیکھنے سے پہلے ہی نعمان اپنے سلعے، کپلے جسم کو لیے واپس قبر کے اندھیرے میں اترنے کے لیے جا چکا تھا۔

چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سرد ہو چکا تھا۔ ”بولو۔۔۔۔۔ اپنی خواہش کا اظہار کرو۔“ وہ چلائی۔ وہ خاموش رہا۔ ”جلدی کرو۔“ وہ پھر چلائی۔

اس نے پنجہ بائیں ہاتھ میں پکڑا اور نا چاہتے ہوئے بھی بولا۔ ”میری دوسری خواہش یہ ہے کہ میرا بیٹا زندہ ہو جائے۔“

بندر کا پنجہ اس کے ہاتھ میں رینگنے لگا اور پھر فرش پر گر پڑا۔ کاشف کمری پر یوں گرا جیسے اس کی جان نکل گئی ہو۔ صائقہ آہستہ آہستہ گھر کی طرف بڑھی اور اسے کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ اسے اپنے بیٹے کا انتظار تھا۔ لائین کا شعلہ بجھنے سے پہلے آخری بار پھڑپھڑایا اور کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ تیل ختم ہو چکا تھا۔ صائقہ اپنے شوہر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ دونوں خاموش تھے۔ آنے والے نجات کی وہشت ان پر ابھی سے طاری ہو چکی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز ان کے دلوں پر ہموارے کی مانند برس رہی تھی۔ اچانک کاشف نے دیا سلائی جلائی اور دوسرے کمرے سے موم جتی لینے کے لیے چلا۔ ابھی وہ دروازے کے پاس ہی پہنچا تھا کہ اس نے حویلی کے دروازے پر بڑے زور کی دستک سی۔ وہ یوں لرزا کہ دیا سلائی اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور تاریکی ہو گئی۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ دستک پھر سنائی دی۔ پھر تیسری بار۔۔۔۔۔

”یہ کیسی آواز ہے؟“ صائقہ نے چلا کر کہا۔ ”ہوا کی ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔۔۔ یہ نعمان کے ہاتھ کی دستک ہے۔۔۔۔۔ وہ اسی طرح دستک دیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ میں اس کے انداز کو نہیں بھول سکتی۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بھاگی، لیکن۔۔۔۔۔ اس سے پہلے کاشف دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ بجھتی ہوئی دیا سلائی کی مدھم روشنی میں دروازے کے سوراخ سے باہر ایک ایسا چہرہ دیکھ چکا تھا، جو لرزادینے والا تھا۔۔۔۔۔ مسلا ہوا۔۔۔۔۔ کپلا ہوا اور روندنا ہوا چہرہ۔۔۔۔۔ جس نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ دروازے



زوردار مری

قسط: 04

انعام کی ایک نئی داستان جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا
ہر ضمیر کے نامور قلم کار کا نام لے راحت کے قلم سے ایک نیا سرگندہ لہجہ سلسلہ

مجھ پر سحر طاری تھا۔ زندگی میں شاید ہی کوئی لمحہ ایسا آیا ہو جب کسی کی شخصیت نے مجھے خود میں جکڑ لیا ہو لیکن یہ شخص ایسی مقناطیسی قوت رکھتا تھا اس کا چہرہ اس کا لہجہ اور سب سے بڑا اس کا انداز۔ اس نے ایک بار بھی مجھے ایسی



Downloaded From
Paksociety.com

www.paksociety.com



WWW.PAKSOCIETY.COM

نظروں سے نہیں دیکھا تھا جس میں کوئی گہرا تاثر ہو۔ اس ایک سادہ سا انداز تھا۔ اس نے فائل میرے سامنے رکھ کر کہا۔

”اگر میرے اور آپ کے مقاصد ایک ہوتے تو شاید یہ فائل میرے لیے بہت قیمتی ہوتی اور میں کسی طور اسے آپ کے حوالے نہ کرتا لیکن خوش قسمتی سے میں جس مشن پر کام کر رہا ہوں ہوں وہ کچھ اور ہے۔ اس لیے یہ فائل میں تحفظاً آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔“

”کیا میں اسے ابھی یہاں دیکھ سکتی ہوں۔“ میں نے سنبھل کر کہا۔

”یہ ایک محفوظ جگہ ہے۔ جہاں کوئی ایک دوسرے کی نوہ میں نہیں رہتا۔ آپ اسے دیکھ سکتی ہیں۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا اور فائل کھول لی۔ بالکل سرسری انداز میں میں نے اسے دیکھنے کا آغاز کیا تھا لیکن پہلے ہی ورق نے میرے ہوش اڑا دیے اور میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ کوئی دس منٹ کے بعد اس کی آواز ابھری۔

”یہ فائل آپ کے لیے ہے، جتنا آپ نے دیکھ لیا اتنا کافی ہے۔ باقی اطمینان سے دیکھیے۔ مجھے آپ سے دوسری باتیں کرنی ہیں۔“

”یہ تو..... یہ تو مسٹر..... اوہ میرے خدا۔ اس میں تو بڑے سنسنی خیز انکشافات ہیں۔ میں خاص طور پر آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔“

”جی ہاں۔“

”آپ اگر چاہتے تو خود اس فائل سے اور اس میں درج شدہ انکشافات سے بڑا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کی قیمت گو..... میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔“

”آپ اپنی سٹ سے نیچی بات نہ کریں مس اینی پارک۔ آپ جو کچھ کر رہی ہیں وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے لیے آپ نے جتنی بار زندگی کی بازی لگائی ہے مجھے وہ بھی معلوم ہے۔ میں آپ ہی کا تعاقب کر کے ان معلومات تک پہنچا ہوں۔ یہ سب آپ کی ملکیت ہے۔ آپ یوں سمجھیں کورڈیل کے سلسلے میں جو کامیابی آپ کو حاصل ہوئی ہے وہ مجھے بھی حاصل ہو چکی ہے۔ اس لیے یہ سب آپ کی ملکیت ہے۔“

میں نے ایک گہری سانس لے کر گروں جھکالی۔ پتا نہیں کیا تھا یہ شخص کون تھا۔ بہت سوچنے کے بعد نے کہا۔

”اگر کبھی مجھے آپ کی کوئی خدمت کرنے کا موقع ملا تو میں اس سے گریز نہیں کروں گی۔“

”ٹھیک ہے اگر مجھے آپ کی ضرورت پیش آئی تو میں بھی آپ کو ضرور تکلیف دوں گا۔“

مجھے اس دلچسپ معاہدے پر خوشی بھی ہوئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی ہے اس لیے قابل اعتماد تھا کہ بہادر اور پروقار تھا لیکن کجخت نہ تو میرے بدن کے خطوط سے متاثر تھا نہ میرے خوب صورت چہرے سے۔ ویسے اگر ایسا ہوتا تو شاید ان لوگوں کی فہرست میں چلا جاتا جنہیں میں جوتے کی نوک پر مارتی تھی۔

”آپ نے ایک سنسنی خیز انکشاف کیا ہے۔“

”کیا؟“

”کہ میں کورڈیل کے خلاف کورڈیل کے لیے کام کر رہی ہوں۔“

”اس فائل کو پڑھنے کے بعد بھی آپ اس سلسلے میں تشویش کا اظہار کر رہی ہیں جب کہ یہ فائل میں نے ترتیب دی ہے اور اس میں موجود اور پختل دستاویزات حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگائی ہے اور اسے..... خود رکھنے کی بجائے.....“

”ہاں مجھے اپنے غلط الفاظ کا اعتراف ہے اور میں ان کے لیے شرمندہ ہوں۔“ میں نے پورے خلوص سے کہا۔

پھر بولی۔ ”ایک الجھن میں ہوں۔“

”جی ہاں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوریڈیل جسے بڑوں میں کون شامل ہے۔ کون بگنیو ہے کون بازو ہے اس بارے میں یہ سبہ مشکل ہے۔ میں ایکشن کروں تو کس کا سہارا لوں۔“

”میرا۔“ اس نے شوخ لہجے میں کہا اور میں جذباتی ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

”آپ نے یہ الفاظ اگر مذاق میں بھی کہے ہیں تب بھی یہ مجھے بہت قیمتی محسوس ہوئے ہیں۔“

”جب کہ میں نے یہ الفاظ مذاق میں نہیں کہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”گویا اس ایکشن میں آپ میرا ساتھ دیں گے۔“

”اگر آپ چاہیں گی۔“

میں کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ”متعلقہ اداروں میں سے کس پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔“

”مسٹر بارلے اور میڈم فیوری پر۔“

”سیکریٹ سروس چیف مسٹر بارلے؟“

”ہاں۔“ اس نے براعتاً لہجے میں کہا اور میں دمک رہ گئی تھی۔ سارے معاملات میرے ہیں۔ سو فیصدی مجھ

سے اور میرے مشن سے متعلق لیکن مجھ سے زیادہ میرے معاملات کون جانتا ہے۔ مزید کوئی بات ایسی نہیں تھی جو غور

طلب ہوئی آخر میں، میں نے اس سے کہا۔

”میں اب بھی آپ کو الہ دین کہوں؟“

”ہاں۔“

”تو آپ نے اس ایکشن میں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔“

”میں وعدے کی پابندی کرتا ہوں۔“

”ہمیں سلوا اسٹارک کے ایکشن اسٹیشن پر ٹھیک کرنا ہے۔“

”اس کی تفصیل اور جائے وقوع کے بارے میں تفصیلات اس فائل میں موجود ہیں۔“

”میں دیکھ چکی ہوں۔ آپ میرے ساتھ ہوں گے؟“

”جی۔“ اس نے کہا۔

میں اس سے جدا ہو گئی لیکن اس کا تصور کسی بھوت کی طرح مجھ سے چٹا ہوا تھا۔ اپنی رہائش گاہ پر آ کر ایک نیا

خیال میرے دل میں آیا۔ کہیں وہ مسٹر سارترے ہی کا کوئی نمائندہ نہ ہو اور مسٹر سارترے اور مسٹر ڈانچی دنیا کے دو

پراسرار ترین کردار تھے۔ انہوں نے جو کچھ کر لیا ہے دنیا کی تاریخ میں کہیں اور نہیں ہے حالانکہ جدید ترین سائنسی

ترقی یافتہ ممالک میں بہت کچھ ہو چکا ہے لیکن مسٹر سارترے کی لیبارٹری اپنی مثال آپ ہے۔ ان دونوں نے پہلے

اپنا ایک انوکھا ادارہ بنایا جس میں دنیا سموی، پھر انہیں ایک ریویوٹ کی ضرورت محسوس ہوئی جو ایکشن کرے اور وہ

میں ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں مسٹر سارترے کی اکلوتی بیٹی اور ان کی یادوں کا سرمایہ ہوں ممکن ہے یہ شخص الہ

دین بھی انہی کی دریافت ہو جو میری حفاظت اور مدد کے لیے میرے ساتھ کی گئی ہو۔

ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن میں اس کا اظہار بابا پر بھی نہیں کروں گی۔ بلکہ کسی مناسب موقع پر انہیں سرپرائز دوں

گی کہ میں سب جانتی ہوں۔“

اس کے بعد میں نے ذمے داری سے اپنے کام کے درجے نبھائے ایک بار فائل کو دو بارہ غور سے پڑھا۔ پھر

مسٹر جیمس بارلے سے رابطہ کیا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ تھوڑی سی الجھن کا شکار ہوئی کہ اس وقت مسٹر

بارلے کو کال کروں یا نہ کروں۔ رہ رہ کر اسی چھلاوے کی طرف ذہن جاتا تھا کون ہے، کیا ہے، خود میں کس قدر خود

اعتماد ہے، ہر بات کا جواب حتمی طور پر دیتا ہے میں نے اپنے اس سنسنی خیز مشن کے لیے کسی قابل اعتماد شخصیت کے

بارے میں پوچھا تو پورے اطمینان سے سیکریٹ سروس کے چیف مسٹر بارلے کا نام لے لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان دونوں نے پہلی دلچسپ ملاقات مجھے یاد تھی۔ اس کے بعد سے ہی وہ دونوں مجھے مخلص، خوش ہر ارج اور قابل اعتماد لگے تھے۔ آخر کار میں نے ہر احتیاط بالائے طاق رکھ کر مسٹر بارے کو کال کر لی اور مجھے خوشی ہوئی کہ مسٹر بارے نے میری کال فوراً ریسپونڈ کر لی۔ ان کا لہجہ اور انداز نیند سے بے نیاز تھا۔

”اس وقت زحمت دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“
 ”نہیں میڈم! آپ ہمارے لیے کام کر رہی ہیں اور ان نازک لمحوں میں جب دنیا خدا نخواستہ کسی بڑے حادثے کا شکار ہو سکتی ہے ہم سب کو ہوشیار رہنا ہوگا۔ آپ بتائیے خیریت ہے اس وقت فون کرنا معنی نہیں ہے۔“
 ”جی سر، ایسی ہی بات ہے۔“
 ”بتائیے پلیز۔“

”جوڑے داری میرے سرو کی گئی تھی میں نے اس کے آخری مرحلے کی تکمیل کر لی ہے۔“
 ”آپ جانتی ہیں جس سیل پر ہم دونوں گفتگو کر رہے ہیں اس پر ہونے والی گفتگو کہیں بھی نہیں سنی جاسکتی جب تک اس کا کوڈ اوپن نہ ہو۔ پھر بھی ہم ابھی مل سکتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔“
 ”میں جانتی ہوں سر۔“

”بتائیے۔“
 ”سر میری ڈیوٹی تھی کورڈیل انٹرنیشنل میں کالی بھیڑیں تلاش کر کے ان کی نشاندہی کروں۔“
 ”جی آپ نے اس سلسلے میں بہت سے قابل قدر کام کیے ہیں اور لندن میں آپ کی کارکردگی کو بہت سراہا جا رہا ہے۔“
 ”میں تو معلومات کو فائل بچ دے چکی ہوں اور اس وقت میرے پاس اس ادارے کا پورا کچا چٹھا موجود ہے۔“

”دوسری طرف خاموشی چھا گئی پھر بارے کی آواز ابھری۔“
 ”یقیناً یہ بڑا سنسنی خیز انکشاف ہے لیکن اتفاق سے وہ بڑی مصیبت ہم پر مسلط ہو گئی ہے۔ جس کے بارے میں میرے منہ سے ابھی چند الفاظ غلطی سے نکل گئے تھے۔“
 ”کون سے؟“

”میں نے کہا تھا کہ اس وقت ایک ایسی مشکل پیش آگئی ہے جس سے دنیا کسی بڑے حادثے کا شکار ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں آپ کے ادارے سے بھی رجوع کیا گیا۔ کیا ہے اور چونکہ اس بڑے واقعے کے بارے میں ابھی اس شے کا شکار ہوئے ہیں ہم لوگ کہ کارڈیل کا بلیک ونگ اس خوفناک جوہر کا محرک ہے۔“
 ”اس طرح جوڑے داری آپ نے ہمارے ادارے کو سونپی ہے وہ ہماری ڈیوٹی کے زمرے میں آ جاتی ہے۔“
 ”مطلب؟“ مسٹر بارے کے لہجے میں حیرت تھی۔

”کورڈیل کے بلیک ونگ کو بے نقاب کرنا اور اس کے ٹھوس ثبوت میرے پاس ہیں کہ کورڈیل نے ہی اس آبدوز کو انکشاف کیا ہے جس میں خوفناک میزائل لوڈ ہیں۔“
 ”مسٹر بارے کو تو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔“
 ”گویا آپ کو اس سنسنی خیز راز کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا ہے اوہ میرے خدا میرے لیے بڑی مشکل پیش آگئی۔“
 ”اوہ..... اوہ.....“

”میں آپ کی پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ سکی جتا؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔
 ”گمشدہ آبدوز کے مسئلے پر اس وقت آدھی دنیا بھان میں مبتلا ہے۔ قرآن بتاتے ہیں کہ اس پر لوڈ میزائل بہت جلد استعمال کر لیے جائیں گے۔ اس آبدوز کو جس پیمانے پر تلاش کیا جا رہا ہے اس کی مثال نہیں ملتی ساتھ ہی اس کے معاملے کو انتہائی سنجیدگی سے دیکھا جا رہا ہے اور تم... تم اتنی آسانی سے اس کا تذکرہ کر رہی ہو بیکرٹ سروں

کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اس راز کے تم تک پہنچ جانے پر مجھے تھیں فوری طور پر گرفتار کر لینا چاہیے اور انتہائی نگہداشت میں رکھنا چاہیے۔ میں پریشان ہوں کہ کر کیا کروں۔“

”میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ مسٹر بار لے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے میں نے کہا۔

”جن لوگوں نے کورڈیل کے سلسلے میں میرے ادارے سے رجوع کیا ہے اور ہم سے درخواست کی ہے کہ ہم ان کے لیے کام کریں۔ میں ان کی نیک نیتی کو مسترد کرتی ہوں اور انہیں غیر معیاری قرار دیتی ہوں۔ ہم اپنے ریکارڈ میں انہیں بلیک لسٹ کریں گے۔ آپ نے میری نہیں میرے ادارے کی توہین کی ہے اور یہ آپ کی قوم کی خرابی ہے۔ خصوصاً آپ کی قوم نے مغرب کو جس قدر بدنام کیا ہے کسی اور نے نہیں اس کی پوری تاریخ ہے۔ تاہم اس وقت جو صورت حال چل رہی ہے وہ ضد آپ کے لیے نقصان دہ نہیں بلکہ لاکھوں بے گناہوں کے لیے ہے۔ اس لیے میں ایک نیا تنازع نہیں کھڑا کر رہی یہ فائل دیکھیے جو آپ کے لیے دیکھنا ضروری ہے۔“

میں نے متمتائی آواز میں کہا اور فائل مسٹر بار لے کی طرف بڑھا دی۔ میرے الفاظ بے حد متعلق تھے اور میرا خیال تھا کہ سفید فام مسٹر بار لے آگ بگولہ ہو جائیں گے لیکن وہ حیرت انگیز طور پر مسکرا دیئے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

”غصہ وہ تند مزاج، میری تھیلی کی طرح۔ یہ الفاظ ادا کر کے انہوں نے فائل میرے ہاتھ سے لے لی اور اسے کھول کر دیکھی۔“

”نچے میری توقع کے مطابق تھا۔“

پہلے مسٹر بار لے کی مسکراہٹ سکڑی۔ پھر آنکھوں کے زاویے بدلے۔ پھر چہرے کی سفیدی میں زردی شامل ہوئی۔ پھر ہونٹ خشک ہوئے اور پھر کئی بار انہیں جھرجھری آئی۔ میرا غصہ ختم ہو گیا۔ بہت بڑی شخصیت تھی لیکن مزاج میں سادگی تھی۔

انہوں نے اس وقت تک گردن نہیں اٹھائی جب تک پوری فائل نہ چاٹ لی۔ پھر وہ آہستہ سے بولے۔

”سوری..... سوری مس اپنی پارک۔“

”نہیں سر، اپنی پارک نہیں۔“

”اِس؟“ انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”تسلیمات۔“ میں نے کہا۔



مسٹر بار لے نے اپنے تمام تر اختیارات پر ہی انحصار کیا تھا۔ انہوں نے اس بڑے آپریشن کے بارے میں اپنی فوجی حکام کو یا کورڈیل کے عہدیداروں تک کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن انتظامات اس طرح کیے تھے کہ کوئی اکی نہیں چھوڑی تھی۔

چنانچہ پر سائیک جیٹ نے بحری جہاز نیٹ مار یو پر لینڈنگ کی تو اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں نے اور الدوین نے غوطہ خوری کا لباس پہنا اور سمندر میں زیر آب سفر کرنے والی کشتی میں سوار ہو گئے۔ الدوین کو میں نے اپنے معاون کے طور پر متعارف کرایا تھا اور اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ بڑی اطاعت گزاری سے سارے کام کر رہا تھا۔

وہ مکان ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ جب ہم خشکی پر جا کر اوپر آئے تو ہلکی چاندنی میں ہمیں ہر جگہ پہرے دار گشت کرتے نظر آئے۔ اس وقت ہم چٹانوں پر چڑھ کر مکان میں داخل ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے ہمیں وہ سربنگ تلاش کرنی پڑی جس کی نشاندہی اس فائل میں موجود نقشے میں کر دی گئی تھی۔ سربنگ کو الدوین نے بڑی آسانی سے تلاش کر لیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم دونوں شانہ شانہ آگے بڑھتے ہوئے سرنگ کے دھڑے سرے پر پہنچ گئے۔ اس طرف کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ ہم پوری احتیاط سے آگے بڑھتے گئے اور ہمیں سب سے پہلی جگہ کچن نظر آئی۔ چنانچہ ہم کچن کے جی دروازے کو کھول کر اوپر جانے والے زینوں پر آ گئے۔ پھر ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہوئے اس کوریڈور سے گزرنے لگے جو آگے جا کر دوسری طرف گھوم گیا تھا۔

لیکن جونہی ہم کوریڈور گھومے ہم سے چند قدم کے فاصلے پر دو گارڈ نظر آئے جو ہمیں دیکھ کر ہکا بکارہ گئے لیکن پھر تیلے اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے انہوں نے برق رفتاری سے اسٹین گنوں کے لیور کھینچے لیکن الدین کے ہاتھ میں دبے فورگس نے دوس کی پیشانیوں کے عین درمیان سوراخ کر دیئے اور وہ دونوں حلق سے آخری چٹخیں نکال کر زمیں پر ڈھیر ہو گئے۔

ان کی چیخیں اور گرنے کی آوازیں سن کر سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اس کمرے سے تیز روشنی کے طوفان کے ساتھ کسی بھاری بدن کی عورت کا ہیولانظر آیا جسے میں نے فوراً پہچان لیا یہ سلوا اسٹاک تھی جس نے ہم دونوں کو اور کوریڈور میں پڑھے گارڈز کو دیکھ لیا۔ اتنے بھاری اور تھکتھکتے بدن والی عورت سے اس قدر برق رفتاری کی توقع نہیں تھی۔ اس نے ایک طرح سے الٹی چھلانگ لگائی اور اپنے بستر کی طرف لپکی جس کے سرہانے ایک سرخ رنگ کا ڈبہ دکھایا تھا لیکن ہم کسی طرح کا خطرہ نہیں لے سکتے تھے۔ میں نے فوراً گولی چلا دی گولی نے اس کا شانہ توڑ دیا اور وہ کراہ کر اوندھی گر پڑی۔

میں پھرتی سے آگے بڑھی اور میں نے وہ سرخ ڈبہ اٹھالیا۔ اس پر سرخ رنگ کا ایک بلب مسلسل اسپارک بکر رہا تھا۔ بلب کے نیچے ایک بٹن بھی تھا۔

”تم..... سو رنگی بچی“ سلوا اسٹارک کراہتی ہوئی بولی۔

”سلوا اسٹارک اگر تم اپنے ساتھیوں کی زندگی بچانا چاہتی ہو تو میرے ساتھ باہر چلو اور انہیں حکم دو کہ وہ اپنا اسلحہ پھینک کر ہاتھ اٹھالیں۔“ میں نے کہا اور وہ جواب دینے کے بجائے گندی گالیاں دینے لگی۔

میں نے پلٹ کر فورگس کو اس کی کنپٹی پر رکھی اور ٹرائیگر دبا دیا۔ اس کا بھیچہ چھینٹوں کی شکل میں نکل کر سامنے والی دیوار سے چپک گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر پلان کے مطابق میں نے سیکرٹ خورس کو گرین سگنل دیا اور چند ہی لمحوں کے اندر وہ بھاڑی مکان روشنی میں نہا گیا۔ یوں لگا جیسے سورج نکل آیا ہو۔ سیکرٹ خورس کی ٹیم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ مشین گن کا شور اور گریڈ کے دھماکے اور پھر سناٹا مٹا سناٹا۔

☆☆

مہم ختم ہو گئی۔ اغواء شدہ آبدوزوں جس کا سراغ اس فائل میں موجود تھا ایک بے حد اہم آپریشن کے ذریعے برآمد کر لی گئی۔ ابھی میزائل آبدوز میں ہی تھے اور انہیں قبضے میں لے لیا گیا تھا۔

الدین اس پوری مہم میں میرے معاون کے طور پر میرے ساتھ تھا لیکن یہ بات صرف میں ہی جانتی تھی کہ وہ معاون نہیں بلکہ اس مشن کی پوری تکمیل اس کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ میں نے پوری ذہانت اور ذمہ داری کے ساتھ اپنا کام کیا تھا لیکن بے شمار موقعوں پر اس سے دست و پا ہو گئی تھی اور اس وقت الدین کی ذہانت نے میری مدد کی تھی۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتی تھی کہ مسٹر سارترے آخر کار میرے باپ تھے۔ اپنی دانست میں انہوں نے اپنی بیٹی کو بہت کچھ بتا دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھے اور انہوں نے ایک ایسی شخصیت دریافت کی جو انسان سے زیادہ روبرو معلوم ہوتی تھی۔ اس قدر ذہین، اتنی شاندار کارکردگی کا مالک کہ اس سے کہیں غلطی نہیں ہوئی تھی اور پھر اس نے آخری کارنامہ وہ فائل تریب دے کر سرانجام دے دیا تھا۔

مسٹر بارلے اور میڈم فیور بے حد مصروف تھے۔ انہوں نے بڑے خفیہ طریقے سے ہمارے لیے ایک ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا تھا۔ ہمیں وہاں ہماری اصل حیثیت سے نہیں رکھا گیا تھا۔ میں سچ میں حیران تھی اور ان واقعات

کے بارے میں سوچ کر اپنا تجربہ کر رہی تھی کہ میں نے اس مسئلے میں کہاں تک اپنا کام صحیح طور پر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے غصہ بھی آرہا تھا کہ پاپا نے مجھ پر بھروسہ کیا اور میرا مددگار کیوں بنایا۔ یہ تو میرا پہلا تجربہ تھا کسی نہ کسی شکل میں کامیاب ہوئی جاتی۔ یا پھر یہ کہا جائے کہ آبدوز کے واقعے نے صورت حال بدل دی اور کام جلدی نہ ماننا ضروری ہو گیا۔

اونہہ جو کچھ بھی ہوا ہے پاپا سے کہوں گی کہ اگر وہ میرے کام میں مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ان کے پاس الدین جیسا آدمی موجود ہے اس سے کام لیں۔ کچھ ہی گھنٹوں کے بعد پاپا کی کال موصول ہوئی۔ وہ آواز سے ہی بہت خوش لگ رہے تھے۔

”ہیلو بے بی، میری طرف سے اس شاندار کامیابی پر مبارکباد قبول کر دو۔“

”شکریہ پاپا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”اب تمہاری فوری واپسی ضروری ہے۔ میری وہاں بات ہو گئی ہے تمہیں پورے اعتماد کے ساتھ واپس بھیجا جائے گا تم نے ان پر بھروسہ کرنا ہے۔ بے فکری کے ساتھ کرنا۔“

”کیا..... پاپا؟“

”رات کو پونے دس بجے تمہاری واپسی کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ سیکرٹ سروس کی میڈم فیوری نو بجے تم سے ملاقات کریں گی۔“

”اوکے پاپا۔“ میں نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔ پاپا نے شاید میری سرد مہری کو محسوس نہیں کیا تھا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کیا سمجھتے ہیں وہ، انہیں خود مجھے اس کے بارے میں بتانا چاہیے تھا۔ ٹھیک ہے میں بھی ایک لفظ نہیں پوچھوں گی ان سے۔

پھر مجھے ایک خیال آیا۔ کیا وہ بھی میرے ساتھ ہی جائے گا۔ کیا اسے بھی اس سفر کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ وہ آخر ہے کیا شے؟

پھر میں نے خود کو سنبھالا اپنی فطرت کے خلاف میں نے اسے زیادہ ہی اپنے سر پر مسلط کر لیا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے میں اس کی کھوج کیوں کروں۔ اگر وہ پاپا کی کوئی دریافت ہے اور اس نے میرے ساتھ تعاون کیا ہے تو وہ پاپا کا مسئلہ ہے۔ دوسری کوئی بات ہو نہیں سکتی۔

اچانک ایک اور خیال میرے دل میں آیا۔ کیا میں اس سے متاثر ہو گئی ہوں۔ کیا جنس مخالف کی حیثیت سے میں نے اس کے بارے میں سوچا ہے۔ میں نے خود کو غیر متعلق کر کے سوچا۔ میرے قید خانے میں وہ پہلی بار کھانے کی ٹرے لے کر آیا۔ جس میں کھانے کے بجائے اسلحہ تھا۔ اس اسلحے سے صورت حال ہی بدل گئی اور وہ میری کامیابی کی چابی ثابت ہوا۔ ورنہ صورت حال مختلف ہوتی۔ گارڈ کی دروی میں وہ ایک ورزشی جسم کا مالک شاندار جوان لگ رہا تھا جب کہ اس کا چہرہ پر کشش نہیں تھا۔

ارے، میں نے اسے اتنے غور سے دیکھا تھا کیوں؟ ادہ کیا ایک لڑکی بھی جنس مخالف کو ہر حال میں اپنی پسند کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ یہ کام تو مردوں ہی سے منسوب ہے مگر یہ غلط ہے اور پھر میں نے اسے اس کے اصل روپ میں دیکھا۔ ایک بھرے بھرے بدن کا مشرقی نوجوان۔ خوش مزاج، خوش گفتار، اور..... اور..... تب میں نے اپنے خیالات کی آوارگی کو روکا جو میرے بدن میں کسمپخت۔ ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ میں نے خود کو برا بھلا کہا۔ یہ کیا میں عام لڑکیوں کے انداز میں سوچ رہی ہوں۔ اس نے تو اپنی زندگی کے لیے مشن ہی دوسرا چنا تھا۔ اس میں یہ سب نہیں چلے گا۔ بالکل نہیں۔ سوچنے پر پابندی نہیں پسند پر پابندی نہیں لیکن..... بعد میں.....

فرصت ایسی ہی فضول چیز ہوتی ہے۔ خیالات پر اگندہ کر دیتی ہے۔ آخر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس سے

باتیں ہی کی جاتی ہیں۔ برابر دوسرے کمرے میں موجود ہے۔ یہ بھی پوچھا جب کہ کیا اسے بھی واپسی کے بارے میں اطلاع دے دی گئی ہے۔ واش روم جا کر لباس تبدیل کیا۔ بال وغیرہ سنوارے اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کے کمرے کے دروازے پر جا کر رکی۔ دستک دینی چاہی لیکن ایک دم احساس ہوا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ہینڈل گھمایا تو وہ دروازہ کھل گیا۔

”میں اندر آ سکتی ہوں۔“ میں نے اخلاقا پوچھ لیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری بار بھی جب کوئی جواب نہیں ملا تو میرا ہاتھ ٹھنکا اور میں اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ روشن روم پر نگاہ دوڑائی۔ اس میں بھی کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”مسٹر الہ دین کیا آپ کمرے میں موجود ہیں؟“

بڑا احمقانہ سوال تھا۔ مسٹر الہ دین کوئی روح تو نہیں تھے جو مجھے نظر نہ آتے نہ ہی وہ مجھے دیکھ کر پوشیدہ ہوئے ہوں گے۔ پھر..... کہاں گیا وہ..... معامیری نگاہ ٹھیل پر پڑی جس پر کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ کچھ عجیب سی چیز تھی سمجھ میں نہیں آئی۔ سینٹر ٹیبل کے قریب پہنچ کر اسے دیکھا۔ غور سے دیکھا۔ اٹھا کر بالکل قریب سے دیکھا۔ کسی بہت ہی نفیس میسرین سے بنی میک اپ ماسک تھی۔ نہ جانے کیوں بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ یہ نقوش اسی کے تھے۔ انہیں تھوڑا سا فٹ کر کے دیکھا تو اس کا چہرہ بن جاتا تھا۔ وہ چہرہ جو گارڈ کے چہرے کے بعد سامنے آیا تھا اور میں نے اندازہ لگایا تھا کہ الہ دین کا اصل چہرہ ہے لیکن یہ ماسک۔ یہ ماسک بتاتی تھی کہ وہ اس کا اصل چہرہ نہیں تھا۔

تو کیا گارڈ والا چہرہ اصلی تھا یا دونوں ہی چہرے نقلی تھے۔ الہ دین میرے منہ سے آہستہ سے نکلا اور دل پر بکھوت پر ایک دم بوجھ سا آ پڑا۔ اس نے دوسری بار بھی مجھ سے اصل چہرہ چھپا کر رکھا۔ اس نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ اس خیال سے دل پر ایک دباؤ سا پڑا تھا۔

کیا وہ چلا گیا۔ کون تھا۔ کیوں میرے قریب آیا تھا۔ کیا اعلیٰ کارکردگی کا مالک تھا۔ کتنا پھر تیز فہم اور نڈر لیکن کون اور اب خود ہی اپنے خیال کی تردید ہو رہی تھی۔ قرائن بتاتے تھے کہ اسے پایا نے نہیں بھیجا تھا۔ وہ کچھ اور ہی چیز تھا۔ کمرے پر نگاہ دوڑائی لیکن اس کا کوئی سامان نہیں تھا۔

تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ میک اپ ماسک ساتھ لے آئی تھی۔ دیر تک بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ ان نقوش میں شوخ آنکھوں کو اور شامل کر دیا جاتا تو جیسے یہ ماسک بول پڑتا۔ میں نے اسے سنبھال کر رکھ لیا۔ اسے ساتھ لے جاؤں گی لیکن وہ.....

پھر ایک خیال نے بچھو کی طرح ڈنک مارا۔ وہ گھبرا دیا آیا جس کا پتا اس نے بتایا تھا اور وہاں وہ پراسرار عورت ملی تھی جس کا نام بشیراں بتایا گیا تھا۔ وہ بھی حیرت انگیز کردار تھا۔ پہلے مولیٰ بھدی اور بعد میں ایک اسارٹ لڑکی کی شکل میں کارو دوڑائی نکل گئی تھی۔ بعد میں اس کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔

مالی گاڈ کتنے پراسرار کردار تھے دونوں۔ کیا الہ دین یہ کام کرنے کے بعد غائب ہو گیا۔ اب اس کے دوبارہ ملنے کے بھلا کیا امکانات ہو سکتے تھے اور کیا وہ لڑکی اس کی دوست، ماتحت یا محبوبہ ہو سکتی ہے کیا میں اس مکان پر جا کر دیکھوں، کیا وہ وہاں گیا تھا۔

خود پر شدید غصہ آیا۔ میں ایسا کیوں کروں۔ کہہ رہا تھا کہ اس کا اپنا مشن ہے جس سے وہ کام کر رہا ہے۔ ممکن ہے اس کا کام باقی ہے۔ اگر بتا دیتا تو میں بھی اس کا ساتھ دے کر اس کا احسان اتارنے کی کوشش کرتی۔

بس اب زیادہ بے وقوفی مناسب نہیں ہے۔ وہ بھاڑ میں جائے۔ پایا نے میڈم فوری کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ مجھ سے ملیں گی اور یہی واپسی کی تیاریوں کے بارے میں بتائیں گی۔ مسٹر جیمس بارلے وغیرہ کورڈیل کے بارے میں کیا کر رہے تھے۔ سلوا اشارک مرچکی تھی گولڈ کر اس کے خلاف بھی خفیہ تحقیقات کی ذمہ داری مسٹر بارلے نے قبول کی تھی جس کے بارے میں انہوں نے مجھے کچھ مشن دیے تھے لیکن مجھے اب کسی بات سے دلچسپی

نہیں تھی۔ مقررہ وقت پر میڈم فیوری آگئیں۔ ان کا رویہ میرے ساتھ بہت پیارا تھا۔ بڑی مشفق خاتون تھیں۔ میرے حساب سے ان کا مزاج ان کے شعبے سے ذرا میل نہیں کھاتا تھا۔ ایئر پورٹ تک میرے ساتھ آئیں۔ انہوں نے ایک بار بھی اس دشمن کے بارے میں نہیں پوچھا جو میرا معاون تھا۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کیے رکھی۔ میرا خیال تھا یا تو انہیں اس بارے میں معلوم ہے کہ وہ میرے ساتھ نہیں جائے گا اور اس کا ہمارے ادارے سے تعلق نہیں ہے یا پھر انہیں صرف میری روانگی کے بارے میں ہدایات دی گئی تھیں۔

اپنی فلائٹ کے دوران میں نے کئی بار جہاز کے مسافروں پر غور کیا اور والدین کے بارے میں سوچا۔ وہ میک اپ کا ماہر تھا۔ کون جانے وہ کسی اور روپ میں اس فلائٹ سے سفر کر رہا ہو۔ کجخت بہت جینٹل تھا بڑی اعلیٰ کارکردگی کا مالک تھا۔ البتہ اس کی شکل و صورت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی لیکن ایک خرابی اس میں نمایاں تھی۔ ناقابل معافی ناقابل برداشت۔

یعنی وہ مجھ سے متاثر نہیں ہوا تھا۔

کورڈیل جن کے حضور نہ جھکنے والا کمینہ کہیں کا ورنہ اس وقت میرے زانو سے زانو ملائے بیٹھا تھا۔ مجھے بھی اچھا لگتا کیونکہ فرصت کے لمحات میں ایک نوجوان لڑکی صرف لڑکی ہوتی ہے۔

☆☆☆

اپنے وطن کی بات ہی کیا۔ میرے وطن کا ایئر پورٹ جگمگا رہا تھا۔ پر لطف بات یہ تھی کہ مسٹر سارترے اور انکل وائچی بھی جذباتی ہو کر ایئر پورٹ پہنچ گئے تھے۔ حالانکہ یہ دونوں ایک طرح سے تارک الدنیا درویش ہو گئے تھے جن کی زندگی صرف کیاؤنڈ تک رہ گئی تھی۔

میرا استقبال بڑے پیار سے کیا گیا گھر پہنچ گئی۔ پوچھا گیا کہ آرام کرنا چاہو گی یا کچھ دیر کے بعد میٹنگ روم آباد کیا جائے؟

”نہیں بالکل فٹ ہوں۔“

”چینج کر کے انڈر گراؤنڈ آ جاؤ۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا۔ زیر زمین خوب صورت ٹینک ہال میں پہنچی تو دو پیارے بھروسے چہرے منتظر تھے۔

”اپنے انتہائی سنگین اور خطرناک مشن میں اپنی کامیابی پر مبارکباد قبول کرو۔“

”خاص طور سے اس دوسری کامیابی پر ہم سے استعدا کی بھی کہ کورڈیل کی کالی بھیڑیوں کی نشاندہی کر دیں کیونکہ جو ملک کورڈیل کے ججز ہیں وہ ایک دوسرے کا اعتماد کھو چکے ہیں اور اپنے اداروں سے یہ تحقیقات نہیں کرا سکتے۔ اس لیے ایک ایسی غیر متعلق شخصیت کی ضرورت پیش آئی جو یہ کام کر لے اور اس کے لیے انہوں نے ہمیں اور ہم سے تمہیں منتخب کیا۔ تمہارے کام کا وہ جائزہ لیتے رہے اور ہمیں اطمینان کی رپورٹیں دیتے رہے یہ ہدف کا واقعہ ہو گیا۔ یہ واقعہ اس قدر سنگین تھا کہ دنیا ہل کر رہ گئی تھی۔ بڑے بڑے ممالک کی فینڈیں حرام ہو گئی تھیں۔ لیکن تم نے بڑی خوش اسلوبی سے وہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ اس سے کمپارٹو کی ساکھ بھی زبردست بن گئی اور ہمیں پہلے کی نسبت دس گنا معاوضہ دینے کا اعلان کروایا گیا۔ اس سے ہمارے مشن کو بڑا فائدہ ہو گا۔ سوئی چی آرگینو کو مزید ترقی ملے گی اور دنیا بھر میں کئے اور نوئے ہاتھ پاؤں والوں کو مصنوعی اعضا مفت لگوانے کی اور سہولتیں ملیں گی۔ اس کے بعد ہم اور بھی کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مثلاً آنکھیں..... ہم آنکھوں کے ہر طرح کے علاج، ان کے آپریشن اور نئی آنکھیں لگانے کی مفت سہولتوں کے بارے میں بھی غور کر رہے ہیں۔ پھر تیسرے مرحلے میں اعضا کی پیوند کاری کے لیے بھی کام کریں گے۔ اس کے لیے ہمیں زبردست فنڈ درکار ہوں گے اور ہم انہیں اپنی محنت سے حاصل کریں گے۔ اپنی جان تم ہماری امیدوں کا مرکز ہو۔ بڑا بھروسہ ہے تم پر۔“

www.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے ایچ پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

میرا غصہ عروج پر پہنچ گیا۔ میں نے دیکھنے کا سہا تھا اٹھا کر کہا۔
 ”بس پاپا، یہاں آپ غلط کر رہے ہیں۔ آپ نے میرے اعتماد کو زخمی کیا ہے۔“
 ”اے۔“ مسٹر سارتر لے اور مسٹر واپچی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ بمشکل مسٹر واپچی نے کیا۔
 ”تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی اپنی۔ جواب میں، میں نے وہ میک اپ ماسک نکال کر غصے سے ان کے سامنے
 میز پر پینچ دی اور وہ دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ پھر پاپا نے وہ ماسک اٹھا کر دیکھی اور بولے۔

”یہ..... یہ تو میک اپ ماسک ہے۔“

”جی آخری بار وہ اس شکل میں تھا۔“

”اے..... کون؟“ انکل واپچی بولے۔

”آپ بھی اس بارے میں اواکاری کریں گے پاپا۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”سارترے۔ یعنی کہ کوئی زبردست غلطی ہوئی ہے۔“ جس بات پر تم برا فروخت ہو وہ فوراً بتاؤ۔ اس بار مسٹر

سارترے کی جگہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ وہ ایک باپ کی حیثیت سے بول پڑے تھے۔

”میں اس کا نام نہیں جانتی۔ کیا آپ نے میری مدد کے لیے ایک ایشیائی جوزے کو نہیں بھیجا تھا۔ وہ غالباً پاکستانی ہیں۔“

”ایشیائی جوڑا..... تمہاری مدد کے لیے؟ پوری تفصیل بتاؤ۔“

انتقام میں بھی اپنے باپ کو جانتی تھی۔ پاپا کی یہ حیرت مصنوعی نہیں تھی اور اب انہیں میری بات پر غصہ آنے لگا ہے۔

چنانچہ میں نے خود کو سنبھال کر پاپا کو الہ دین کی پوری کہانی سنادی۔ پاپا محبت سے منہ کھولے یہ تفصیل سن رہے تھے۔

میرے خاموش ہونے کے بعد وہ تعجب سے واپچی کا چہرہ دیکھنے لگے جو خود بھی تصویر حیرت بنا ہوا تھا۔ پروہ آہستہ سے

بڑبڑائے۔

”اور وہ ایشیائی تھا۔“

”ہاں مشرتی تم لوگ ہمیشہ خود پرستی میں مبتلا رہے ہو جب کہ ہزاروں بار ثابت ہو چکا ہے کہ ایشیائی تم سے زیادہ

ذہین ہیں۔ تم نے بس اپنے وسائل کے بل پر اسے دبا رکھا ہے۔“

”جی ہاں اندر کا تعصب کبھی نہیں جائے گا۔“ پاپا کو ہنس آ گئی۔

”اس کا حلیہ تو تم وہاں ہی نہیں سکتیں۔“ انکل واپچی نے کہا۔

”یہ اس کا آخری حلیہ تھا۔ اس سے پہلے وہ گارڈ کے روپ میں بد نما شکل کا مالک تھا۔“

”اور اس کی ساٹھی عورت۔“

”اس کے بارے میں بتا چکی ہوں۔ دوبارہ اسے نہیں دیکھا۔“

”اور اس نے یہ بھی کیا کہ اس کا اپنا مشن الگ ہے جو اتفاق سے تمہارے مشن سے منسلک ہو گیا ہے۔“

”ہاں اس نے یہی کہا تھا۔ میں نے کہا اور پاپا خاموش ہو گئے۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پاپا اس ماسک کو بار

بار اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

”ہم دونوں میں سے کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نہ ہمارے ذہن میں کوئی ایسی بات آئی کہ کس مشن

میں کس کو تمہاری مدد کے لیے بھیجا جائے اور نہ ہی ہم آئندہ ایسا کوئی عمل کریں گے جس سے تمہیں واقفیت نہ ہو اس

بات کا خیال رکھنا۔“

”پاپا۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں تم ہی جوان نہیں ہو ہم بھی اتنے ہی جوان ہیں۔ کپارٹو کو ہم نے بڑی احتیاط سے متعارف کرایا ہے لیکن

کوئی کبھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ اس کے علاوہ ہم نے تم پر مکمل انحصار کیا ہے۔ اس اعتماد کے ساتھ

کہ تم بھی کوری نہیں ہوگی۔ پھر بھی ہم دونوں بھرپور کوشش کریں گے کہ اس کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کون ہے۔“

حیرانی اس بات پر ہے کہ وہ تیار ہے کام آیا نہیں اس کے اپنے مشن کے لیے کہیں استعمال نہیں کیا۔

”اب میں بھی حیران ہوں۔“
 ”آرام کرو اور بے فکر ہو۔ ہم اس کی اصلیت تلاش کریں گے۔“
 پھر مجھے آرام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ بہت دن کے بعد اپنا آراستہ بستر نصیب ہوا تھا، دل چاہا کہ فوراً آنکھیں بند کروں اور سو جاؤں اس کوشش میں بھی کہ کہیں سے وہ صورت آنکھوں میں آئے جو بعد میں صرف ایک پلاسٹک ماسک ثابت ہوئی۔ اس کی تیسری شکل کیسی ہوگی۔ دوسری شکل کی طرح خوب صورت یا پھر وہی گارڈ والی۔ بھدی اور بد نما۔ آہ کاش میں ایسا نہ ہو۔ اس کی شخصیت باکمال ہے۔ بجلی جیسا تیز گفتگو اور آواز بے مثال اور بدن بے حد دلکش، بھرا بھرا۔ جاذب نگاہ، میں نے اسے چھو کر دیکھا اس میں مدھم مدھم سنساہٹ ابھر رہی تھی۔ اسی سنساہٹ جو آنکھوں میں خمار بن جائے اور میں نے خود کو اس میں گم کر لیا اور صبح تک اس کی سخت نرمائشوں میں گم رہی۔ پھر جاگ گئی اور ان معمولات میں گم ہو گئی جو گھر میں ہوا کرتے تھے۔

☆☆☆

تقریباً دو ہفتے گزر گئے پاپا اور انکل واپسی اپنی مصروفیات میں کھوئے ہوئے تھے لیکن انہوں نے دوبارہ مجھ سے والدین کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ایک پراسرار وجود جو اب بھی کبھی میرے خوابوں میں آ جاتا تھا اور جس نے مجھے میرے اندر چھپی ایک نئی محبت سے روشناس کرایا تھا۔ یعنی یہ کہ میں ایک حسن پرست لڑکی ہوں اور اپنے اندر موجود تمام وحشیانہ صلاحیتوں کے باوجود کسی کی مراد و دلکشی مجھے متاثر کر سکتی ہے۔
 میرا شہر تھا، میرا وطن تھا، یہاں میری شناسائیاں تھیں، دوستیاں تھیں، میری پسندیدہ تفریح گاہیں تھیں۔ عمدہ کھانوں کے ہول تھے۔ میں ان میں کھو گئی پھر ایک وم طبیعت پر بیزاری سوار ہو گئی اور اس رات ڈرنیبل پر میں نے پاپا سے اس بیزاری کا اظہار کر دیا۔ میں نے کہا۔

”آپ تو ابھی تک میرے لیے کوئی مہم تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں پاپا، یوں لگتا ہے کمپارٹو میں ایر رائیگیا ہے ایسی ہی بات ہے نا؟“
 ”آگے کہو۔“ پاپا کی سکرابٹ مجھے عجیب لگی پھر بھی میں نے اپنی بات جاری رکھی۔
 ”میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے۔“
 ”بتاؤ کیا۔“

”دنیا کے بیشتر ملکوں میں سوئی چلی آرگینو کی بڑا نیچیں کام کر رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ نے ان کو آپس میں لنک رکھتے کے لیے بہت بڑا نیٹ ورک تیار رکھا ہے دیکھیں پھر بھی اگر میں ان ممالک میں جا کر ان کی کارکردگی کا جائزہ لوں اور آپ کو اس بارے میں بہترین تجاویز دوں تو کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گے۔“
 ”بہت پسند کریں گے۔ لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ تم نے کورڈیل کے کرتا دھرتاؤں کو اس قدر متاثر کر دیا ہے کہ اس کا ممبر ہمیں اپنے وطن میں خود پیش ہونے کی پیشکش کر رہا ہے اور کہتا ہے ہماری سیکورٹی اس ملک کے وزیراعظم کے برابر ہوگی۔“

”دلچسپ بات ہے لیکن اس کا میری بات سے کیا تعلق؟“ میں نے کہا۔

”وہی بتانے جا رہا ہوں۔“

”جی بتائیے۔“

”کورڈیل ایک دلچسپ ادارہ ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اقوام متحدہ اس قدر فعال ادارہ نہیں رہا جتنا اپنی تشکیل کے وقت تھا۔ طاقت ور ممالک نے اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے اور اس سے وہ چھوٹے ممالک نا جائز فائدہ بھی اٹھا لیتے ہیں جو بڑے ممالک سے حاشیہ برادر اور تنگ خوا ہیں۔ یوں دوسرے ممالک کے دلوں

میں مایوسی پیدا ہو گئی ہے اور اب اقوام متحدہ براعظماؤں میں کرتے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

”جی سر۔“ میں نے مشینی انداز میں کہا۔

”اس بات کو ان تمام ممالک نے اچھی طرح محسوس کیا۔ ان کے فعال اداروں نے اس بارے میں خصوصی طور پر سوچا اور بے شمار تجاویز زیر غور آئیں اور پھر بات کو روڈیل پر آ کر رکھی۔ یعنی ایک ایسا ادارہ جس میں تمام طاقت ور ممالک شریک ہوں اور جہاں اقوام متحدہ کچھ مصلحتوں کے تحت کام نہ کر سکے وہاں کو روڈیل آگے بڑھے۔ گویا اس کی حیثیت ایک سرکش ادارے جیسی ہو جو ہر طرح صحیح کام کی تکمیل کرے خواہ اس کے لیے مشترکہ طاقت استعمال کرنی پڑے۔“

”آپ مجھے وہ بات بتائیے جو آپ مجھے بتانا چاہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اسی پر آ رہا ہوں۔ یہ کہہ چکا ہوں کہ آبدوز کے معاملے میں اور کو روڈیل کی کالی بھیڑوں کی تلاش کے سلسلے میں تم نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس سے کو روڈیل بہت متاثر ہے۔“

”گویا وہ لوگ بھی اس کے بارے میں نہیں جانتے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کس کے بارے میں۔“

”جس کے سلسلے میں آپ کا کمپارٹو بھی فیل ہو گیا۔ میرا مطلب الہ دین کا ہے۔“

”وہ کوئی مافوق الفطرت شخصیت ہی ہو سکتی ہے۔ کہیں سے اس کا سراغ نہیں ملا۔ ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔“

”خیر چھوڑیے۔ آگے بتائیے۔“ میں نے کہا۔

”تفصیل یہ ہے کہ ڈاکٹر ہیر لیونسکی کا تعلق پیراگوئے سے ہے لیکن نہ صرف ہم نے بلکہ اس کے پورے خاندان نے ساری زندگی شائیکا میں گزاری ہے۔ اصل میں ہیر لیونسکی کا باپ ایویریلو بحری قزاق تھا اور پیراگوئے میں دوسری زندگی گزار رہا تھا۔ یعنی ایک طرف وہ پیراگوئے میں خام تانبے کے بہت بڑے تاجر کی حیثیت سے ایک نیک نام آدمی تھا لیکن دوسری طرف وہ ایک درندہ صفت سمندری ڈاکو تھا جس نے لوٹ مار کے ساتھ قتل و غارتگری کا بازار بھی گرم کر رکھا تھا۔“

ایک سمندری جہاز کو لوٹتے ہوئے اسے پہچان لیا گیا اور بڑے خفیہ طریقے سے کارروائی کر کے اس کے گوداموں پر چھاپا مارا گیا اور تازہ ترین بحری قزاقی میں لوٹا ہوا سامان ان گوداموں سے برآمد ہو گیا۔ اس کا کام بدترین تھا لیکن اس نے تعلقات کا ایک جال پھیلا دیا تھا۔ انہیں تعلقات کی وجہ سے اس کی زندگی تو بچ گئی لیکن اسے ساری زندگی کے لیے جلا وطن کر دیا گیا اور وہ اپنی بے پناہ دولت سمیٹ کر شائیکا منتقل ہو گیا۔ وہیں اس نے سکونت اختیار کر لی۔ ہیر لیونسکی اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس نے شائیکا آ کر اپنی مجرمانہ زندگی ترک کر دی اور ایک اچھے شہری کی زندگی گزارنے لگا۔ ہیر لیونسکی شائیکا میں ہی جوان ہوا اور اس نے وہیں اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا رہا۔ پھر ایک دن شائیکا کی ادارے سے منسلک ہو گیا اور وہاں شعبہ ریسرچ میں کام کرنے لگا۔ اس نے کئی نئے امراض دریافت کیے اور ان کے علاج تلاش کر کے وہ اعزازات حاصل کرتا رہا۔ وہ بے پناہ حیثیت حاصل کر چکا تھا اور شائیکا میں اسے ایک انتہائی معزز آدمی کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ خاص طور سے اس نے ایک ایسی دوا ایجاد کی جس سے انسانی جلد انتہائی خطرناک جلدی امراض سے محفوظ رہ سکتی تھی اس ایجاد نے اس کی حیثیت میں چار چاند لگا دیے۔ اس نے شائیکا ہی کے ایک معزز خاندان میں شادی کی جس سے وہ ایک بیٹے کا باپ بھی بنا۔

لیکن پھر ایک دن شائیکا کی حکام حیران رہ گئے جب انہیں معلوم ہوا کہ ہیر لیونسکی ایک طیارے میں بیٹھ کر ہانگ کانگ چلا گیا۔ اس کے حلقوں میں اور دوسرے حکام کو قطعاً یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک اتنی بڑی شخصیت اس طرح کیوں دوسرے ملک چلی گئی۔

پھر اچانک یہ انکشاف ہوا کہ وہ اپنی خدایات لائی جن کو پیش کر رہا ہے۔ اس خبر سے شائیکا میں شدید اضطراب

پھیل گیا کیونکہ ایروس کے بعد لائی چین بنی شائریکا کا سب سے بڑا اثر تھا۔ بلکہ اس نے جذید سلینا جی کی بعض چیزوں میں شائریکا اور ایروس کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہائیڈروجن بم بنا چکا تھا اور تابکاری کے میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

ڈاکٹر ہیر لیونسکی کی لائی چین سے وابستگی کا اعلان شائریکا کے لیے زبردست تشویش کا باعث تھا اور اسے خطرہ تھا کہ لائی چین ہر طرح کی تابکاری سے محفوظ ہو جائے گا اور دوسروں کے خلاف تابکار حملے کرے گا۔ ڈاکٹر ہیر نے شائریکا سے اپنی برسوں کی وفاداری سے اچانک منہ موڑ کر لائی چین سے وابستگی کا فیصلہ کیوں کیا تھا اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

”اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کورڈیل خود سازشوں کا مرکز بن گیا ہے جس کی مثال سلوا اشارک تھی جو کورڈیل کا سب سے بڑا عہدہ رکھنے کے باوجود اس کی سب سے بڑی غدارگی اور اگر کمپارنو کے مایہ ناز ایجنٹ اس سازش کو بے نقاب نہ کر دیتے تو لازمی امر تھا کہ آبدوز سے میزائل فائر ہوتے اور تیسری جنگ عظیم کا آغاز ہو جاتا۔ یہ الفاظ شائریکا کے صدر کے تھے۔

ڈاکٹر ہیر کا فرار اور لائی چین سے وابستگی بھی کورڈیل کے ممبر ملکوں کے لیے اس خوفناک حادثے سے کم نہیں ہے۔ لائی چین کورڈیل کا ممبر نہیں ہے اور نہ ہی وہ کبھی کورڈیل سے رجوع کرے گا یا اس کی بات مانے گا، بلکہ یہ انوکھی قوت حاصل کر کے وہ اپنی برتری کا کسی بھی وقت اظہار کر سکتا ہے۔“

ایروس کے صدر نے کہا۔
”کیا ہمارے پاس ڈاکٹر ہیر کے اس پراسرار فرار کے سلسلے میں معمولی سی معلومات ہیں؟“
”بالکل نہیں۔“
”کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ پوری دیانتداری سے اس فرار کی تحقیق اور اس کے مضراثرات سے بچنے کا کوئی منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔“

”منصوبہ بنایا جاسکتا ہے لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس منصوبے پر کام کرنے والے ادارے ایسے تو نہیں

جی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول 'ناشون' کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ
ان کے ذاتی تحریکات اور اصل حقائق و اثرات
سعادت و نعمت کا حساب، حیرت و تجسس پرمبنی ناول

تحریر: شازی سعید مغل

ناشون

۴۵۰ صفحات

Postage
Rs. 50

برصغیر میں علم تفسیر کے بانی حضرت کاش البرنیؒ کی
نامعلیت و کامعلیت، روحانیت و محبت، تصوف اور دوسری دنیا
کے تحریکات و مشاہدات، پراسراریت کے منت مئے راز کو کھلتا ایک
سحر انگیز ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش البرنیؒ ”بنام“

”ناشون“ ہیں



قیمت: روپے ۱۰۰
WWW.PAKSOCIETY.COM
Auraz Publishers, Ibrahim Market, P18 Colony, Sarachi 74000

ہیں جو خود اس کے فزار کے ذریعے دار ہوں۔“
اس سوال نے تمام پر جوش آوازوں کو سرد کر دیا۔
”ان اداروں کو خریدنا جاسکتا ہے اور انہیں اپنی مرضی کے دوستوں پر چلایا جاسکتا ہے۔ ہمارے پاس روشنی کی ایک کرن کپارٹو ہے جو ہمارے کام آسکتا ہے۔ وہ ایک لڑکی جو پورے کورڈیل کی ناک کاٹ کر اس کی پھیلائی پر رکھ کر چلی گئی۔“

”گویا آپ کا مطلب ہے سرکہ کپارٹو سے مدد لی جائے؟“
”اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔“

”لیکن سر! اس امکان کو مد نظر رکھا جائے کہ کپارٹو کو بھی خریدا جاسکتا ہے۔“
”کپارٹو نہ تو کوئی دہشت گرد تنظیم ہے نہ کوئی سرائرساں آرگنائزیشن۔ یہ چند افراد پر مشتمل گروپ ہے اور ایک چھوٹے سے نیک مقصد پر کام کر رہا ہے۔ یعنی وہ دنیا بھر میں مصنوعی اعضا کی تیاری اور انہیں بلا معاوضہ ضرورت مندوں تک پہنچانے کا عزم رکھتا ہے اور اسی پر کام کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں ایک بتیس کورڈیل کے ممبر ممالک کے انتہائی موثر اداروں نے معلومات حاصل کی ہیں اور کپارٹو کو صاف ستھرا پایا ہے۔
ترموداوانچی نے وہ سٹم بند کر دیا جس سے یہ گفتگو نشر ہو رہی تھی۔

”نہ کورڈیل کی انتہائی خفیہ گفتگو کی تفصیل ہے جو ملکوں کے سربراہوں نے ایک دوسرے سے کی۔“ مسٹر سارترے کی آواز ابھری۔

”اوہ مالی گاڈ، گویا اس گفتگو کا ریکارڈ آپ نے خفیہ طور پر حاصل کیا ہے پاپا سر۔“ میں نے شدید حیرت سے کہا۔
”ہاں ہمارے جینے کا یہی راستہ ہے۔ کارمیل ڈی سارترے نے کیا۔“

”نہ صرف ہمارے جینے کا، بلکہ پوری دنیا میں ان ناوار لوگوں کے جینے کا جو اپنی ناواری کی بنا پر اپنی مفروزی کا علاج نہیں کرا سکتے اور صرف اس لیے بی رہے ہیں کہ زندگی کھونے کے لیے نہیں ہے۔“ مسٹر وائیچی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”یہ سنو۔“ پاپا نے ایک اور آواز سنائی۔

”مسٹر کپارٹو ہم اس نام سے آپ کو مخاطب کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ کاش آپ بکھلے دل سے ہمارے ساتھ ہوتے۔ تاہم ہم ایک طرح سے آپ سے اتفاق بھی کرتے ہیں اگر آپ منظر عام پر ہوتے تو نہ جانے کون کون سی نگاہ آپ پر ہوتی۔ خیر ہم آپ سے اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔“
دوسری طرف لے آنے والی آواز نے جو لازمی طور پر صدر شائیکا کی تھی۔ ہیریونسکی کے بارے میں پوری کہانی سنائی، پھر کہا۔

”ہیریونسکی کے فرار کے مضمر اثرات کے بارے میں تفصیل بہت طویل ہے۔ یوں سمجھیں یہ بھی ایک عالمی خطرہ ہے۔ ہم جانتے ہیں آپ اپنی کوششوں سے اسے ہر قیمت پر واپس لائیں اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو اسے مروا دیا جائے۔ وہ اس وقت ہانگ کانگ میں ہے۔ ہم دوبارہ اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر وہ زندہ واپس لایا جاسکے تو اسے ترجیح دی جائے ہم اس انتہائی کارآمد شخص کو کھونا نہیں چاہتے۔ ہم اس کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہیں۔ یہ بات آپ کو اس لیے بتائی جا رہی ہے کہ اگر آپ کسی ایجنٹ کی یا اس لڑکی کی جسے ہم انسان نہیں رو بوٹ سمجھتے ہیں اس سے ملاقات کا موقع مل جائے تو وہ اسے واپس لانے پر آمادہ کر سکے۔“

اس سلسلے میں ہم آپ کا معاوضہ اور مزید ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خوشی سے آمادہ ہیں۔ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔“

آواز بند ہو گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر پاپا نے کہا۔

”اور ہم ان سے ضروری امور طے کر چکے ہیں جو ہمارے لیے بے حد کارآمد ہیں۔“
 میری ڈیوٹی پایا؟ میں نے سوال کیا۔
 ”تم ہانگ کانگ جا کر اس سے ملو اور اسے شائیکا واپس آنے پر آمادہ کرو۔“
 ”وہ میرے کہنے سے فوری تیار ہو جائے گا؟“ میں نے فس کر کہا۔
 ”نہیں، ہم نے اس ایگریمنٹ کے بعد اس پر ورک کیا ہے۔“ مسٹر واتچی نے کہا۔
 ”گڈ بتائیے۔“

”تم اس کی سیکریٹری ایلیسی کے روپ میں ہانگ کانگ جاؤ گی۔ ایلیسی کو چیک کر لیا گیا ہے اور اس کی رپورٹ ہمیں موصول ہو چکی ہے۔ اس کی تصویریں اس کے مشاغل اور اس کے چلنے پھرنے کا انداز۔ اس کی ویڈیو ہمیں موصول ہو چکی ہے۔ اس کا ڈیل ڈول سو فیصدی تمہاری مانند ہے۔“
 ”گویا بہت دیر سے کام ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”نہیں، لیکن جو کام ہمارا ہے وہ ہم ضرور کر رہے ہیں۔“
 ”مطلب۔“

”جہاں جہاں ہمارے سوئی جی آر گینو ہیں وہاں ہمارے ایجنٹ بھی خود کش ہو گئے ہیں۔ پھر تیلے اور برقی رفتاری سے کام کرنے والے۔ کس بھی مسئلے میں متحرک ہو کر وہ ہمیں رپورٹ دیتے ہیں۔ چونکہ ہمیں یہ کام کرنا تھا اس لیے یہ تفصیل معلوم کر لی گئی ہے۔“
 ”خود ایلیسی کو یہ پتا ہو گا کہ اس کی جگہ کوئی اور اس کے پاس سے ملے گا۔“
 ”نہیں اسے قہقہے میں لے لیا جائے گا اور کسی جگہ محصور کر دیا جائے گا۔“
 ”گویا مجھے پہلے ایلیسی سے ملاقات کرنی ہوگی۔“
 ”ہاں تم ایک بار صرف اس سے ملو گی۔ اس کے بعد اسے اسکرین آرڈنٹ کر دیا جائے گا۔“

”ایک اور سوال۔“
 ”ہاں میری جان اپنا پانے پیار بھرے لہجے میں کہا۔
 ”آپ نے ہمیں لیوسکی کی بیوی اور اس کے بیٹے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر لیوسکی کی بیوی اور بیٹا کہاں ہیں۔ میرا خیال ہے لیوسکی کے فرار کے بعد حکومت شائیکا نے ان دونوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ہو گا تاکہ ان کا ذریعہ لیوسکی کو واپسی پر آمادہ کیا جاسکے۔“
 ”نہیں، انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ لیوسکی نے فرار ہوتے ہوئے ان کے بارے میں ضرور سوچا ہو گا اور پھر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہو گا۔“
 ”کیا نام ہے اس کی بیوی کا؟“
 ”پریسلا لیوسکی۔“
 ”ایڈریس۔“

”میرا خیال ہے اس سے ملنا بے کار ہو گا کیوں کہ وہ شائیکا کی حکومت کو بھی کچھ نہیں بتا سکی۔“
 ”ایڈریس پلیز۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا اور پاپائس پڑے۔ پھر انہوں نے پریسلا کا ایڈریس مجھے دے دیا۔
 ☆.....☆

(ایٹی پارک..... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تھمکے چائے گی۔
 اُس کا اگلا شکار کون ہو گا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے)

فراغت کی سرزمین سے والیسی خاص کہانیاں، جو آپ کو مدتوں یاد رہیں گی

فرعون کے مجرم

بنتِ حوا

سرزمین مصر پر سوائے ہوئے فرعون کو قید سے بے دخل کرنے والوں کی اندوہناک داستان

کے لیے پھول ہوں گے یا کانٹے، خوشیاں ہوں گی یا غم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آنے والا کل اس کے لیے زندگی کا پیغام لائے گا یا موت اس کی منتظر ہوگی۔ انہی باتوں کو جاننے کے لیے کوئی طوطے سے فال نکلو اتنا نظر آتا ہے تو کوئی پامسٹ کی مدد سے اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں مستقبل کو تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس گروپ کے لوگ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں مستقبل سے زیادہ ماضی میں دلچسپی ہوتی ہے وہ یہ نہیں جانتا چاہتے کہ کیا ہونے والا ہے بلکہ وہ اس فکر میں غلطاں دکھائی دیتے ہیں کہ کیا کچھ گزر چکا ہے۔ لوگ انہیں آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے نام سے جانتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

سب سے آگے والی گاڑی میں ڈرائیور سمیت پانچ لوگ تھے۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا چھریرے بدن کا خوش شہل نوجوان لارنس اس گروپ کا گائیڈ بھی تھا اور ہیلپر بھی کیونکہ وہ مقامی تھا۔ پچھلی سیٹ پر دو مرد تھے ایک کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان معلوم ہوتی تھی لیکن اس عمر میں بھی وہ چاک و

دھوپ نے اپنا آچل سیٹ لیا تھا لیکن ابھی زمین نے اندھیرے کی اوڑھنی نہیں اوڑھی تھی۔ آگے پیچھے چلتی گاڑیوں نے ایک قافلے کی صورت اختیار کر رکھی تھی، یہ گاڑیاں خاص طور پر ایسے ہی علاقوں میں سفر کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں اسی لیے ناہموار راستوں پر اچھلتی کودتی بنا کسی دقت کے رواں دواں تھیں۔ گاڑیوں کے اندر بیٹھے اے سی کی ٹھنڈک سے لطف اندوز ہوتے نفوس باہر کے موسم سے بے نیاز چائے، کوئی کسک ہاتھوں میں لیے باتوں میں مصروف گا ہے بہ گا ہے باہر کے بھاگتے دوڑتے مناظر پر بھی نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ لمبے سفر کے باوجود ان کے چہروں پر تھکن اور بے زاری کی جھلک تک دکھائی نہ دیتی تھی بلکہ ان کی آنکھوں میں تجسس تھا اور ایک خاص چمک، جو صرف کچھ کر جانے والوں کی آنکھوں میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ عام طور پر انسان مستقبل کے بارے میں تجسس کا شکار ہوتے ہیں تقریباً ہر انسان کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے کسی طرح معلوم ہو جائے کہ آنے والے کل کے ہاتھ میں اس

www.paksocietytv.com



ارابرٹ خیمے لگانے میں مصروف ہو گئے جبکہ ایرک
ہوئی لائسنس آن کرنے کے بعد کھانے کا سامان
نکالنے لگا۔ جب تک خیمے لگے شام رات سے گلے
مل رہی تھی، سب کا تھکن سے نہ حال تھا اس لیے
کھانا کھانے کے بعد یہی فیصلہ کیا گیا کہ اس رات
آرام کریں اگلی صبح دن کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ
علاقے کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا بلکہ کام کا باقاعدہ
آغاز بھی ہو جائے گا، پروفیسر مرنی کے اس اعلان
کے ساتھ ہی سب ایک دوسرے کو گڈ نائٹ کہتے
ہوئے اپنے اپنے خیموں کی طرف چلے گئے۔ آنے
والی صبح کو تازہ دم ہو کر کام کرنے کے لیے اس رات
کا آرام بہت اہمیت رکھتا تھا۔

☆.....☆.....☆

سب کے چلے جانے کے بعد جب خیمے
میں پروفیسر مرنی اور ارینہ رہ گئے تو پروفیسر نے ایک
طرف رکھا لیڈر کا بیگ اٹھایا اور اس میں سے ایک
کتاب نکال کر بیگ بند کر کے واپس اسی جگہ پر رکھ
دیا "ڈیڈی ہیں تو۔۔۔" ارینہ کے لہجے میں خوف کا عنصر
میں لکھی ہیں تو۔۔۔" ارینہ کے لہجے میں خوف کا عنصر
نمایاں تھا "بنایا رکھنا کتابوں میں لکھی بہت سی باتیں
سچ ہوتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر بات سچ ہو اور وہ
بھی ایسی ہی خوفناک بات جس پر یقین کرنے کا کوئی
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" پروفیسر مرنی نے بیٹی کا ڈر دور
کرنے کے لیے دانستہ لاپرواہی لہجہ میں کہا۔

"لیکن ڈیڈی۔۔۔"

"مائی ڈیر یہ کوئی پہلی بار نہیں ہے کہ میں نے
اہرام میں سوئے لوگوں کے تابوت زمین سے
نکالے ہوں اور اس وقت کے لوگوں اور اس انسان
کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کی
ہوں، یہ صرف ایک کہانی ہے اور کچھ نہیں، بے فکر ہو
کر سو جاؤ کل کے دن بہت مصروفیت رہے گی" اس
سے پہلے کہ ارینہ اپنے مزید خدشات کا اظہار کرتی
پروفیسر نے اس کی بات کاٹ دی، ارینہ نے بے
بسی سے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو آنکھوں پر نظر کا
چشمہ لگائے کتاب کے صفحات پلٹنے میں مصروف

چوبند دکھائی دیتا تھا، ایرک پر چھائی تنہائی اس کی
شخصیت کو بارعب بنارہی تھی۔ وہ اس گروپ کا لیڈر
پروفیسر مرنی تھا۔ دوسرے نمبر پر بیٹھی ارینہ نام کی لڑکی
اس گروپ میں سب سے کم عمر تھی وہ اس بوڑھے شخص
کی شاگرد بھی تھی اور بیٹی بھی۔ اس کے ساتھ
بیٹھا مرد مائیکل تیس سے اوپر کا تھا وہ مسلسل گائیڈ کے
ساتھ محو گفتگو تھا پروفیسر مرنی کبھی کبھی ان کی گفتگو میں
شریک ہو جاتا تھا جبکہ خاموش بیٹھی ارینہ دلچسپی اور
پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھی وہ پہلی بار ایسی
غیم پر آئی تھی اس لیے سب سے زیادہ پر جوش تھی
اگرچہ کتابوں اور اپنے باپ پروفیسر مرنی کی مدد سے
وہ علم تو کافی رکھتی تھی لیکن کسی بات کا پڑھنا یا سننا اور
اس کا خود تجربہ کرنا دونوں میں بہت فرق ہوا کرتا ہے۔

ان کے پیچھے والی گاڑی میں ایرک اور جارج
تھے ایرک گاڑی چلا رہا تھا جبکہ جارج منہ پر ہیٹ
رکھے پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا یا شاید سوچکا تھا
تیسری گاڑی کو رابرٹ چلا رہا تھا اس گاڑی میں
ڈبہ بند کھانے منے کا سامان، فرسٹ ایڈ کا
سامان، خیمے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں تھیں جن کی
انہیں ضرورت پڑ سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

ہم کتنی دیر میں وہاں پہنچ جائیں گے؟" ارینہ نے
پہلی بار لارنس سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا شاید
اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

"بس تھوڑی دیر میں ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں
گے مادام" لارنس نے شستہ انگریزی میں بڑے ادب
سے اس کی بات کا جواب دیا اور دوبارہ مائیکل کو اس
علاقے کے بارے میں بتانے میں مصروف ہو گیا۔
ارینہ کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مگن ہو گئی۔ لارنس کے
کہنے کے مطابق وہ لوگ واقعی تھوڑی دیر بعد اپنی منزل
پر پہنچ چکے تھے۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمیں اپنا پڑاؤ ڈالنا ہے
"ایک قدرے کھلی جگہ پر پہنچ کر لارنس نے سفر کے
اختتام کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ سب لوگ گاڑیوں
سے اتر آئے اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگے۔ جارج اور

آوازوں سے اسے اندازہ ہو گیا کہ سب لوگ جاگ گئے ہیں کچھ دیر وہ یونہی لیٹی ہوئی بے دھیانی سے باہر سے آئی آوازوں کو سنتی رہی پھر جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کیوں ہے تو وہ فوراً بستر سے اٹھ بیٹھی اپنے کاندھے تک آتے سنہرے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے وہ اٹھ کر خیمے سے باہر آگئی "گڈ مارنگ" وہ سب کو گڈ مارنگ کہتے ہوئے ان مزدوروں کی طرف متوجہ ہو گئی جو کچھ فاصلے پر کھدائی کا کام شروع کر چکے تھے، پروفیسر مرنی ان کے پاس کھڑا مسلسل ہدایات دینے میں مصروف تھا ارینہ بھی اسی طرف چلی آئی۔

"ویلڈن سٹرلائرس آپ تو واقعی بہت کام کے آدمی ہیں" راستے میں کھڑے لائرس کو سراہتے ہوئے ارینہ نے اس کی تعریف کی تو وہ شکریہ ادا کرتا ہوا مسکراتے لگا۔ اتنی صبح مقامی لوگوں کا مزدوری کے لیے پہنچ جانا ہی اس بات کی دلیل تھا کہ لائرس کس قدر ذمہ دار انسان تھا۔

"ہیلو ڈیڈ" پروفیسر کے قریب پہنچ کر اس نے انہیں پکارا "جاگ گئیں تم، نیند کیسی آئی؟" پروفیسر نے خوشگوار موڈ میں اس سے پوچھا "بہت اچھی، اتنی اچھی کہ صبح سب سے آخر میں، میں جاگ رہی ہوں" ارینہ نے ہنستے ہوئے کہا تو جواب میں پروفیسر بھی ہنس دیا ارینہ کو ناشتا کرنے کا کہہ کر وہ ایک بار پھر مزدوروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پروفیسر مرنی کو اپنے کام سے عشق ہے اس کا کام اس کا جنون بھی ہے یہ بات اس کے ساتھ کام کرنے والے سب لوگ جانتے تھے اسی لیے سب بڑی سنجیدگی سے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆

کام شروع ہو تو پھر سب لوگ جیسے آرام کرنا ہی بھول گئے دن کے علاوہ رات کو بھی ہیوی لائٹس کی مدد سے کام جاری رہنے لگا۔ سب لوگ باری باری آرام کر لیا کرتے تھے لیکن کام جاری رہتا تھا۔ ان لوگوں کو وہاں آئے ہوئے دس دن گزر چکے تھے وہ

تھا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ اس بارے میں اور کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ مجبوراً ارینہ کو گڈ نائٹ کہتے ہوئے وہاں سے جانا پڑا۔

ارینہ کے جانے کے بعد پروفیسر چند لمحے کسی سوچ میں گم رہا اور پھر سر جھٹک کر ہاتھ میں پکڑی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

ارینہ اپنے خیمے میں آنے کے بعد بھی سو نہیں پا رہی تھی، ایک عجیب سی بے چینی تھی جس نے اس کے دل کو گھیر رکھا تھا۔ وہ بڑے شوق سے اس مہم پر آئی تھی لیکن جب سے وہ یہاں پہنچی تھی اسے اس جگہ سے خوف محسوس ہو رہا تھا اور اس کا ذہن بار بار اس کہانی کی طرف جارہا تھا جو اس اہرام کے بارے میں اس نے اپنے باپ کی زبان سے سنی تھی۔

"لوگ کہتے ہیں کہ جب بھی جن لوگوں نے اس جگہ پر کھدائی کا کام شروع کیا وہ سب پر سزا طریقے سے مر گئے، جب دوبار یہ ہوا تو اس جگہ کے بارے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ یہاں آکر جو بھی کھدائی کر کے تابوت نکالنے کی کوشش کرے گا وہ مارا جائے گا، اور یہی وہ بات ہے جس نے اس علاقے میں میری دلچسپی کو بڑھا دیا ہے، اب تو چاہیے جو بھی ہو جائے میں یہاں کام پورا کر کے ہی رہوں گا" روآگئی سے پہلے پروفیسر مرنی نے برفیٹنگ دیتے ہوئے کہا تھا۔ "لوگ بہت کمزور عقیدے کے مالک ہوتے ہیں سر چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کر کہانیاں بنا دینا انسان کی فطرت رہی ہے، یہ بھی ایسی ہی ایک کہانی ہے جسے ہم غلط ثابت کر کے رہیں گے" مائیکل کے کہنے پر باقی سب نے بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا تھا اور اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ اس سفر پر روانہ ہوا تھا۔ "یہ کس قدر فضول بات ہے کہ کسی مرے ہوئے انسان سے ڈرا جائے" ارینہ نے خود کلامی کی بھی بلکہ اپنی بزدلی پر خود کو ڈانٹا تھا اور اسی طرح خود کو سمجھاتے ہوئے وہ نیند کی آغوش میں کھو گئی۔

☆.....☆.....☆

صبح جب ارینہ کی ہلکی کھلی تو باہر سے آتی

ارینہ نے کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور پروفیسر کو اٹھا کر اپنے خیمے میں چلی آئی۔ ابھی اسے لیٹے کچھ ہی لمحے گزرے تھے جب اسے محسوس ہوا جیسے اس کے خیمے میں کوئی اور بھی موجود ہے اور سرگوشی میں کچھ کہہ رہا ہے۔ ارینہ نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ خیمے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی جیسی اسے دوبارہ یہی احساس ہوا کہ اس کے خیمے میں کوئی اور بھی موجود ہے اس نے چاہا کہ مڑ کر پیچھے دیکھے لیکن وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر پائی بھی اسے اپنے کانوں کے قریب سرگوشی سنائی دی جو شروع میں اتنی واضح نہیں تھی کہ ارینہ سمجھ پاتی لیکن بعد میں سرگوشی کی آواز تیز ہوتی چلی گئی لیکن وہ جو کوئی بھی تھا وہ کوئی ایسی زبان بول رہا تھا جس سے ارینہ ناواقف تھی، آنکھیں کھولنے کی ہر کوشش ناکام ہونے پر اس کے دل میں خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سرگوشی جس طرح آہستہ آہستہ بلند ہوئی تھی اسی طرح آہستہ آہستہ اس کی آواز کم ہونے لگی اور پھر جیسے ہی آواز ختم ہوئی ارینہ کو لگا جیسے وہ آزاد ہو گئی ہو۔ اس بار اس نے جسم کو حرکت دی تو وہ با آسانی اٹھ بیٹھی، خیمے میں چاروں طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ارینہ کا دل بہت شدت سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کسی طور یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ جو کچھ اس نے محسوس کیا اور سنا وہ اس کا وہم یا خواب تھا۔ اس سب کے بعد نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی اور دوبارہ سونے کے خیال سے بھی اسے خوف آ رہا تھا اسی لیے وہ واپس کام کی جگہ پر چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی کو بھی یہ بات بتائے گی تو کوئی اس کا یقین نہیں کرے گا خاص طور پر پروفیسر مرنی تو اسے اچھا خاصا لیکچر ہی دے ڈالتے اسی لیے جب پروفیسر نے اس سے واپس آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے نیند نہ آنے کا بہانہ کر کے انہیں نال دیا۔

☆.....☆.....☆

”کیا بات ہے سر آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟“ اگلی صبح پروفیسر کو سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر جارج اس کے پاس آ گیا۔

”اوہ نہیں کچھ خاص نہیں بس میں سوچ رہا تھا کہ شاید ارینہ کو ساتھ لاکر میں نے غلطی کی ہے، یہاں کے بارے میں جو قصے کہانیاں مشہور ہیں انہوں نے ارینہ کے لاشعور میں بہت سی الجھنیں پیدا کر دی ہیں پروفیسر کی بات سن کر جارج بھی سوچ میں پڑا

ارینہ نے کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور پروفیسر کو اٹھا کر اپنے خیمے میں چلی آئی۔ ابھی اسے لیٹے کچھ ہی لمحے گزرے تھے جب اسے محسوس ہوا جیسے اس کے خیمے میں کوئی اور بھی موجود ہے اور سرگوشی میں کچھ کہہ رہا ہے۔ ارینہ نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ خیمے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی جیسی اسے دوبارہ یہی احساس ہوا کہ اس کے خیمے میں کوئی اور بھی موجود ہے اس نے چاہا کہ مڑ کر پیچھے دیکھے لیکن وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر پائی بھی اسے اپنے کانوں کے قریب سرگوشی سنائی دی جو شروع میں اتنی واضح نہیں تھی کہ ارینہ سمجھ پاتی لیکن بعد میں سرگوشی کی آواز تیز ہوتی چلی گئی لیکن وہ جو کوئی بھی تھا وہ کوئی ایسی زبان بول رہا تھا جس سے ارینہ ناواقف تھی، آنکھیں کھولنے کی ہر کوشش ناکام ہونے پر اس کے دل میں خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سرگوشی جس طرح آہستہ آہستہ بلند ہوئی تھی اسی طرح آہستہ آہستہ اس کی آواز کم ہونے لگی اور پھر جیسے ہی آواز ختم ہوئی ارینہ کو لگا جیسے وہ آزاد ہو گئی ہو۔ اس بار اس نے جسم کو حرکت دی تو وہ با آسانی اٹھ بیٹھی، خیمے میں چاروں طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ارینہ کا دل بہت شدت سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کسی طور یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ جو کچھ اس نے محسوس کیا اور سنا وہ اس کا وہم یا خواب تھا۔ اس سب کے بعد نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی اور دوبارہ سونے کے خیال سے بھی اسے خوف آ رہا تھا اسی لیے وہ واپس کام کی جگہ پر چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی کو بھی یہ بات بتائے گی تو کوئی اس کا یقین نہیں کرے گا خاص طور پر پروفیسر مرنی تو اسے اچھا خاصا لیکچر ہی دے ڈالتے اسی لیے جب پروفیسر نے اس سے واپس آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے نیند نہ آنے کا بہانہ کر کے انہیں نال دیا۔

☆.....☆.....☆

اگلی رات آئی تو اپنے خیمے میں جانے کے خیال سے ہی ارینہ کو جھرجھری آگئی مگر اسے وہاں جانا تو تھا ہی، جیسے ہی اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند

WWW.PAKSOCIETY.COM

”ارینہ کو واپس بھجوا دیا جائے تو اس کی ابجھن اور آپ کی فکر دونوں دور ہو جائیں گی“ جارج کے مشورے پر پروفیسر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”ایسا کرنے سے ارینہ کی ابجھن دور نہیں ہوگی بلکہ اس کا خود پر سے اعتماد بھی ختم ہو جائے گا، اسے ہر صورت کام پورا کر کے ہی یہاں سے جانا ہوگا یہی اس کے لیے بہتر ہے“ پروفیسر کا جواب سن کر جارج خاموش ہو گیا۔

اور پھر دن معمول کے مطابق کاموں میں گزر گیا۔ ابھی دو پہر ہی تھی جب مزدوروں نے تابوت ملنے کی خوش خبری سنائی تو سب میں نئے سرے سے جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔

☆.....☆.....☆

بڑی احتیاط کے ساتھ تابوت کو باہر نکالا گیا اور سب لوگ اس کے گرد بیٹھ کر اس پر لکھی گئی عبارت کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگے جیسے جیسے پروفیسر تابوت پر لکھے الفاظ بلند آواز میں پڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے ارینہ کے چہرے کا رنگ اڑتا جا رہا تھا۔ وہ ان الفاظ کو کیسے بھول سکتی تھی یہ وہی الفاظ تھے جو اسے سرگوشی کی صورت میں بار بار سنائے گئے تھے۔ قدیم زبان میں لکھی گئی اس عبارت کا مطلب کچھ یوں بنتا تھا ”جو کوئی بھی ہمارے شہنشاہ کی گہری نیند میں خلل ڈالے گا وہ مارا جائے گا“ اس عبارت کو پڑھ کر سب ہنس دیے اور تابوت کھولنے کے لیے اس کا معائنہ کیا جانے لگا۔ تھوڑی کوشش کے بعد تابوت کا ڈھکن کھل گیا تابوت میں ایک مرد کی مٹی تھی جس کے دائیں گال پر زخم کا ایک بڑا نشان تھا۔ سب لوگ اپنی اس کامیابی پر بے حد خوش تھے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے تابوت کو حفاظت سے گاڑی میں رکھنے کے بعد واپسی کی تیاریاں ہونے لگیں تو ارینہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اسے اس جگہ سے وحشت ہونے لگی تھی لیکن کام کو ادھورا چھوڑ کر بھی نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اب جبکہ مٹی مل چکی تھی وہ جلد از جلد اس جگہ سے بہت دور چلے جانا چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

پروفیسر مرنی اور اس کے ساتھیوں کو ایک بڑے ہوٹل میں چھوڑنے کے بعد لارنس اور ڈرائیور شریف نے انہیں الوداع کہا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جائیں۔ اسی لیے گاڑی کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ خوش چنیاں

لگاتے ہوئے وہ اپنی منزل کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے کہ اچانک گاڑی کے سامنے ایک عورت آگئی شریف نے اسے بچانے کے لیے غیر ارادی طور پر اپنی گاڑی کا رخ دوسری طرف موڑا اور ان کی گاڑی پل پر سے نیچے جا گری۔ پولیس کے آنے تک وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور ہر کسی کا بیان یہی تھا کہ گاڑی اپنے راستے پر چلی جا رہی تھی کہ اچانک گاڑی کا رخ مڑ گیا حالانکہ سامنے سڑک پر کوئی بھی موجود نہ تھا جس کو بچانے کے لیے گاڑی کا رخ موڑا جاتا۔ شریف اور لارنس موقع پر ہی دم توڑ گئے لیکن جب ان کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے ہاسپٹل لے جاتی تھیں تو ڈاکٹر زکوا ایک بات نے بہت حیران کیا تھا دونوں لاشوں کے وائیں گال پر زخم کا ایک بڑا سا نشان موجود تھا، اگرچہ زخم کی وجہ کوئی پتھر وغیرہ ہو سکتا تھا لیکن ایک ہی وقت میں دو انسانوں کے گالوں پر بالکل ایک جیسے نشانوں کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔

☆.....☆.....☆

تقریباً سات سال بعد کی بات ہے ایسا ہی گروپ جن میں ایرک، جارج اور رابرٹ بھی شامل تھے ایک بار پھر ماضی کو کھوجتے نکلا وہ تینوں اتفاقاً ہی اکٹھے ہو گئے تھے اتنے سال بعد ایک دوسرے سے مل کر تینوں کو خوشگوار حیرت نے گھیر لیا تھا، رات کو مل کر بیٹھے تو پچھلے سفر کی باتیں دہرائی جانے لگیں، پروفیسر مرنی اور اریبہ کا ذکر آیا تو اریبہ کے خوف اور اس بھی سے بڑی کہانی بھی دہرائی گئی۔

”ایک بار تو میں بھی ڈر گیا تھا کہ کہیں واقعی کسی جادو وغیرہ کا چکر نہ ہو مگر دیکھ لو سات سال گزر گئے اور ہم سب بالکل ٹھیک ہیں اور بہت اچھی زندگی جی رہے ہیں“ ایرک کے کہنے پر جارج اور رابرٹ نے بھی تہقہہ لگایا۔

”ایک جام ہماری زندگی کے نام“ رابرٹ نے جام لہراتے ہوئے کہا تو ”چیرز چیرز“ کہتے ہوئے باقی دونوں بھی جام سے جام ٹکرانے لگے۔ رات ڈھلنے لگی تو تینوں ایک دوسرے کو گڈ نائٹ کہہ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح گروپ کے بھی لوگ اس دریا کے کنارے جمع تھے جہاں سے انہیں کشتیوں میں سوار ہو کر دریا کی دوسری طرف جانا تھا اور وہاں سے آگے کا سفر گاڑیوں پر کرنا تھا۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ ایرک، جارج اور رابرٹ ایک ہی کشتی میں سوار ہوئے، دریا پر سکون تھا تینوں ارد گرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے باتیں کرنے میں مصروف تھے اچانک نہ جانے کیا ہوا یوں لگا جیسے دریا کا پانی غصے سے پاگل ہو گیا ہو اور زور زور سے کشتی سے اپنا سر نکرا رہا ہو، کشتی چلانے والا اس اچانک آئی آفت پر پریشان تھا تو وہ تینوں بھی پریشانی سے اوجھل ہو کر دیکھ رہے تھے۔ ایک تیز طوفانی لہر آئی اور اس نے

اریبہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا چکی تھی پروفیسر مرنی حسب عادت سونے سے پہلے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا بھی موبائل پر آنے والی کال نے اس کا اسہاک توڑ دیا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو رات کا ایک بج رہی تھی۔

”اس وقت کسی کی کال آ سکتی ہے“ خود دکھائی کرتے ہوئے پروفیسر نے کال ریسیو کی دوسری طرف اس کا ایک پرانا دوست تھا جو اسے مائیکل کے مرنے کی خبر دے رہا تھا۔ فون سن کر پروفیسر مرنی کچھ پریشان دکھائی دینے لگا اس کے بعد وہ کتاب نہیں پڑھ سکا تھا بلکہ صبح تک مائیکل کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پولیس کے مطابق اس کے گھر ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی مزاحمت کرنے پر انہوں نے مائیکل کو گولی مار دی تھی لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مائیکل کی موت کی وجہ وہ گولی نہیں بلکہ ہارٹ ایک تھا اور سب سے اہم بات جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی وہ زخم کا نشان تھا جو مائیکل کے وائیں گال پر پایا گیا تھا۔ پروفیسر مرنی نے اریبہ سے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا وہ سمجھ

کشتی کو الٹ دیا، کچھ ہی دیر میں دریا حیرت انگیز طور پر سکون ہو گیا۔ کشتی بان بے ہوشی کی حالت میں دوسرے کنارے پر مل گیا تھا جبکہ ایرک، رابرٹ اور جارج کی لاشیں بھی قریب قریب پڑی ہوئی مل گئیں۔ وہ تینوں بہت اچھے تیراک تھے ان کے مرنے کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی البتہ ان تینوں کے دائیں گال پر زخم کا بڑا سا نشان سب کے لیے سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ارینہ ناشتے کے لیے نیچے آئی تو پروفیسر مرنی کو ناشتے کی ٹیبل پر بند پا کر ملازم سے اس کے بارے میں پوچھا، پروفیسر مرنی کی عادت تھی کہ وہ صبح سویرے داک گئے لیے ضرور جایا کرتا تھا مگر ناشتے کے وقت تک گھر لوٹ آیا کرتا تھا۔ ارینہ نے یونہی بے دھیانی میں ٹیبل پر رکھا اخبار اٹھا کر اپنے سامنے پھیلا دیا اور ایک خبر پر اس کی نظر جم کر رہ گئیں، وہ ایرک، رابرٹ اور جارج کی موت کی خبر تھی وہ تینوں اپنی فیلڈ میں ماہر سمجھے جاتے تھے ان کا اس طرح ایک ساتھ مر جانا یقیناً میڈیا کے لیے ایک بڑی خبر تھی۔ ارینہ جلدی جلدی خبر کی تفصیلات بڑھنے لگی تفصیلات میں زخم کے اس نشان کا بھی ذکر کیا گیا تھا جو ان تینوں کے گالوں پر تھا۔ ارینہ کی ریزہ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑ گئی وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ گاڑی نکال کر اس نے اس پارک کا رخ کیا جہاں پروفیسر مرنی سیر کے لیے جایا کرتا تھا وہ اچھا خاصا بڑا پارک تھا۔ پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے ارینہ دیوانہ وار پارک کی طرف دوڑی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنے باپ کو آوازیں دینے لگی جیسی ایک طرف لگے مجمع نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اس کے دل نے اسے کسی انہونی کی خبر دی وہ لرزے قدموں کے ساتھ مجمع کی طرف بڑھنے لگی گھیرے کو توڑتے ہوئے اس کی نظر گھاس پر پڑے پروفیسر مرنی پر پڑی اسے ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ دنیا سے اپنا رشتہ توڑ چکا ہے جیسے ہی ارینہ کی نظر پروفیسر کے دائیں گال پر موجود زخم کی نشان پر پڑی وہ بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑی۔

☆.....☆.....☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ حیرت انگیز تھی اس کے

مطابق پروفیسر مرنی کی موت دم گھٹنے سے ہوئی تھی جبکہ دیکھنے والوں نے بتایا تھا کہ پروفیسر اچانک ہی زپنے لگا تھا اور پھر زمین پر گر کر مر گیا تھا۔ پارک کے کھلے ماحول میں سانس گھٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ارینہ کی حالت بہت بری تھی اسے جب بھی ہوش آتا وہ ایک انجانی زبان میں کچھ کہتے ہوئے چیختے چلائے لگتی اسے پرسکون رکھنے کے لیے بار بار بے ہوشی کے انجکشن دینا پڑ رہے تھے مگر ڈاکٹر اس کے لیے فکر مند تھے ان کے مطابق ارینہ پر پاگل پن کا دورہ پڑنے والی کیفیات پائی جا رہی تھیں۔ پروفیسر مرنی کی موت کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا اس رات بھی ارینہ کو بے ہوشی کا انجکشن لگا کر سلا دیا گیا تھا ایک نرس پورا وقت اس کے پاس موجود رہتی تھی۔ آدھی رات کے قریب نرس نے ایک آواز سنی کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا وہ اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے سے نکل کر نیچے کی منزل کی طرف بڑھی جہاں سے اسے آواز آرہی تھی، نیچے اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے باوجود جب اسے کوئی دکھائی نہ دیا تو وہ واپس ارینہ کے کمرے کی طرف بڑھی اور یہ دیکھ کر حیران پریشان رہ گئی کہ ارینہ کا دروازہ اندر سے بند تھا، بہت کوشش کے باوجود جب وہ دروازہ کھولنے میں ناکام رہی تو آخر اس نے پولیس کو فون کر دیا۔ پولیس کے آنے پر ارینہ کے کمرے کا دروازہ توڑا گیا تو سامنے کا منظر دیکھ کر نرس کے منہ سے چیخ نکل گئی ارینہ کی لاش چھت کے ٹکے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ لاش کو نیچے اتارا گیا موت ٹکے میں موجود پھندے کی وجہ سے ہی ہوئی تھی۔ اگلے دن خبروں میں یہ خبر نمایاں تھی کہ پروفیسر مرنی کی بیٹی نے اپنے باپ کی موت کے صدمے سے پاگل ہو کر خود کو پچھلے سے لٹکا خودکشی کر لی۔ جانے والی جا چکی تھی لیکن کچھ سوال ایسے رہ گئے تھے جن کے جواب کسی کے پاس نہیں تھے، بے ہوشی کا انجکشن لگی ہوئی ارینہ نے خود کو پچھلے سے کیسے لٹکایا اور اس کے دائیں گال پر زخم کا بڑا سا نشان کیسے آیا تھا۔ اب یہ سوچنے والا کوئی نہیں بچا تھا کہ یہ سب کسی کی نیند میں خلل ڈالنے کی سزا تھی یا اتفاقات کا کوئی سلسلہ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سچی کہانیاں 159

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



فراعنہ کی سرزمین سے دوسری خاص کہانی

آخری فرعون

ملک صفدر عباس اعوان



فراعنہ کی سرزمین سے اُس آخری فرعون کی داستان عجب جس کا اہرام نابین سا تھا

شوق کی تحیل کر پاؤں گا۔ پھر میرے پاس اتنے وسائل بھی نہیں تھے۔ میرے والد اوسط درجے کے ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان کو جو تنخواہ ملتی، اس سے گھر کا گزارہ بھی بمشکل ہوتا۔ پھر ان سب حالات کے باوجود مجھے میرے مصر خواب کی تعبیر مل گئی۔

جب مجھے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اچانک ہی ایک ڈچ کمپنی میں نوکری کی آفر آئی۔ یہ ایک کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ کمپنی کا نام زونیٹرا تھا۔ کمپنی کا کام مصر کے قدیم اہراموں کی کھدائی کرنا اور ان کی مرمت کرنا شامل تھا۔ ویسے اس کمپنی میں نوکری دلانے میں میرے ایک دوست بلال نے بہت مدد کی تھی۔ ویسے یوں کہنا مناسب ہوگا۔ نوکری میرے دوست کی ہی مرہون منت تھی۔ کیونکہ میرے دوست بلال کے والد عرصہ دراز سے اس کمپنی سے منسلک تھے۔ جب ٹیلی فون پر میری اپنے دوست کے والد سے بات ہوئی تو وہ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے، میں ان سے کبھی ملا نہیں تھا مگر ٹیلی فون پر ان کا بہت شفقت اور پیار بھرا لہجہ میرے لیے بہت متاثر کن تھا پھر انکل کمال کہ اس بات کی خوشی

قاہرہ کے مصری عجائب گھر میں اس سٹی مجسمے کو دیکھ کر میں دم بخود ہو کر رہ گیا تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی جو مجھے چونکنے پر مجبور کر گئی تھی۔ وہ مجسمہ ہو بہو میری شکل و صورت کی نقل تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً اس مجسمے کے بنانے والے کے فن کو خراج تحسین پیش کیے بنا رہ نہیں سکتا تھا مگر اس وقت میرے ساتھ معاملہ ذرا مختلف تھا۔ میں تو مجسمے کو دیکھ کر درطہ حیرت میں بڑا ہوا تھا کہ مجسمے کی آخر اتنی شباهت میرے ساتھ کیونکر ممکن ہے۔ رتی برابر بھی کوئی فرق نہیں تھا بالکل ایسے لگ رہا تھا کہ مجھے دیکھ کر ہی اس کو بنایا گیا ہو۔ میں آج ہی مصر کے اس قدیم شہر قاہرہ پہنچا تھا۔ اہراموں کی یہ سرزمین میرے لیے حیرت و تجسس کے کئی پہلو لیے ہوئے تھے۔

میں اپنے بارے میں بتاتا جاؤں میں یعنی عارب صدیقی کو شروع دن سے ہی سیر و سیاحت کا شوق رہا ہے مگر مصر اور اس کی قدیم تاریخ میرے لیے خاصی دلچسپی کا باعث رہی۔ اپنے طالب علمی کے زمانے میں میرا یہ خواب تو خواب ہی تھا کہ میں مصر جاؤں گا اور میں اپنے



WWW.PAKSOCIETY.COM

موجود تھا۔ میں نے انگل کمال کی کہی ہوئی بات اس کو بتائی۔ تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ کلاک ابھی صبح کے آٹھ بج رہا تھا۔

”عرب صاحب! ابھی آپ آرام کریں۔ آپ فلاٹ سے ٹھکے ہوئے آئے ہیں۔ آپ جب کہیں گے۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ اس مصری گائیڈ کا لہجہ نہایت مودبانہ تھا۔ مجھے اہرام مصر دیکھنے کی اتنی بے تابی تھی۔ تمکُن ہونے کے باوجود بھی تمکُن کا احساس تک نہ تھا۔ میرا دل تو ابھی ساتھ جانے کا چاہ رہا تھا مگر ابھی اتنی صبح سویرے جانے کی بجائے میں نے اس کو دوپہر کا کہہ دیا اور سب سے پہلے اس کو اہرام دیکھنے کے لیے بھی کہا۔ چار ٹھکے گزارنے کے بعد وہ مصری وہاں دوبارہ آن پہنچا۔

اہرام دکھانے کے لیے میری خواہش کے مطابق مجھے قاہرہ شہر کے نواحی حصے کی طرف لے گیا۔ پہلے پہل جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ابوالہول نامی دیو قامت مجسمہ تھا۔ جو ایک نہایت بڑی سخت چٹان سے تراشا ہوا ایسا مجسمہ تھا جس کا دھڑ تو شیر جیسا تھا مگر سر انسان سے مشابہ تھا۔ ابوالہول مجسمے کا چہرہ پر وقار و عبودیت کا دبدبے والا تھا جس کی آنکھیں کھلی اور کشادہ تھیں۔ مانو ایسے جیسے آپ کی طرف ہی دیکھ رہی ہوں۔ اس دم اور بڑے بچے اس سگلی شیر والے مجسمے کو اور بھی ہولناک بنا رہے تھے۔

مصری گائیڈ نے مجھے بتایا کہ یہ فرعون کے چوتھے خاندان کے بادشاہ منفرع کا چہرہ ہے۔ ”کچھ دیر میں اس ابوالہول کے مجسمے کے پاس ہی کھڑا کیمرے سے اس کی تصاویر لیتا رہا۔

پھر وہاں سے ہم اہراموں کی طرف مڑ گئے جو مصر کے صحرا میں کسی شاہکار سے کم نہ تھا زیادہ تر سیاح اسی اہرام کو دیکھنے آتے تھے۔ پھر جو کتابیں میرے زیر مطالعہ ہیں ان اہرام کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔

دوپہر سے شام ڈھلنے کے قریب تک میں ان اہراموں کے پاس ہی رہا۔ جب سورج نے اپنا چہرہ چھپا کر انحراف کیا تو ہم نے بھی واپسی کا فیصلہ کیا۔

تھی کہ ان کی طرح ایک اور پاکستانی نے کمپنی جوائن کی ہے۔ کمپنی میں میری تقرری لیبر اسٹاف میں کی گئی اور مجھے لیبر اسٹاف کا ہیڈ مقرر کر دیا گیا۔ جب سے مجھے نوکری ملی تھی اور جب سے قاہرہ جانے کی بات ہوئی تھی میں تو دن انگلیوں پر گننے لگا تھا۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب میرا دیزامیرے ہاتھ میں تھا۔

اگلے دن رات کی فلاٹ تھی۔ میں تو خوشی سے پھولے نہیں سہا رہا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آن پہنچا جب میں جہاز میں بیٹھ چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں مصر کے قاہرہ انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ انگل کمال نے میری معاونت کے لیے کمپنی کا ایک مصری ورکر بطور گائیڈ ایئرپورٹ پر پہلے ہی بھجوا دیا تھا۔ وہ مصری جس نے اپنا نام ابوالخارث بتایا۔ بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملا مگر نجانے کیوں مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ چونکا ضرور تھا۔ کچھ دیر تو وہ میری طرف بڑی غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر ہی جم کر رہ گئی تھیں۔ میں نے یہ بات نوٹ کی اور اس کی وجہ بھی پوچھی مگر وہ نظریں چرانے لگا۔ میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ ویسے بھی میں اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ طویل تھکا دینے والی فلاٹ کی وجہ سے میں فریش ہو کر کچھ دیر آرام کرنے کے حق میں تھا۔ وہ مصری مجھے اپنی کار میں ایئرپورٹ سے قاہرہ کے ایک بڑے ریسٹورنٹ میں لے آیا جہاں میرے لیے ایک کمرہ پہلے ہی بک کر دیا گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کا وہ کمرہ نہایت شاندار اور آرام دہ تھا۔

میں نے یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے انگل کمال کو ٹیلی فون کیا اور اپنے آنے کی اطلاع دی۔ انگل یہاں قاہرہ شہر میں نہیں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ضروری کام کی وجہ سے شہر سے باہر ہیں۔ کل تک آجائیں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ عارب بیٹا اگر تم کچھ دیر ریست کرنے کے بعد قاہرہ گھومنا چاہو تو میں مصری گائیڈ کو تمہارے ساتھ بھجوا دوں گا۔ ”اعدھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں فوراً رضی ہو گیا۔

وہ مصری گائیڈ ابھی تک میرے کمرے میں ہی

آنکھوں کے سامنے ہی رہا تب ہو گیا۔
مجھے بیک دم بے بہہ خوف کا جھٹکا لگا۔ جسم میں ہلکی سی دوڑ گئی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور بے اختیار کسی سے جا ٹکرایا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ میرا مصری گائیڈ ہی تھا وہ مجھ سے ٹکرایا تھا۔

”اوہ! معاف کیجیے گا عارب صاحب..... وہ وہ بس اچانک ٹکر ہو گئی، مجھے نہیں پتا تھا آپ اتنے ڈر جائیں گے۔“ وہ میرے چہرے کے اڑتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر یقیناً بولا تھا۔ میرے جسم پر کچھ ٹاری تھی اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں کچھ نہیں بولا مگر وہ مصری گائیڈ کبھی میری طرف دیکھتا بھی اس عجیبے کی طرف۔ میں اگرچہ مضبوط اعصاب کا مالک تو جوان تھا مگر اس وقت میرے اعصاب جواب دیے ہوئے تھے۔

”کتنا عجیب اتفاق ہے عارب صاحب، یہ مجسمہ ہو ہوا آپ کے جیسا ہے۔“ میرے خیال میں آپ بھی اسی بات پر چونک کر پریشان ہیں۔ میری بھی حالت ایسی ہی تھی جب سے میں آپ سے ایئر پورٹ پر ملا ہوں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں مگر آپ کو بتا نہیں پایا۔“

”کیا تم مجھے بتا سکتے ہو یہ مجسمہ کس کا ہے؟“ میں نے بنا اس کی کسی بات کا جواب دیے بغیر اپنے دماغ میں گردش کرتا ہوا سوال اس کے سامنے رکھ ڈالا تھا، میں جلد از جلد اس مجسمے کے بارے میں جاننے کا مشتاق تھا۔

”نہیں..... کچھ خاص نہیں..... کیونکہ یہ مجسمہ ابھی حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔“ وہ مصری میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”جہاں تک میں نے سنا ہے یہ مصر کے فرعون بادشاہ افا تون کے اکلوتے بیٹے کا مجسمہ ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اس پر ریسرچ کر رہے ہیں اس کی باقیات کے بارے میں جاننے کے لیے۔ ویسے اس مجسمے والے شہزادے کا نام خاقان تھا۔“ وہ بولا اور کچھ دیر سوچنے کے انداز میں کھڑا رہا۔ پھر وہ دوبارہ جلدی سے مجھ سے گویا ہوا۔

”ہاں یاد آیا۔۔۔۔۔ اگر آپ کو اس مجسمے کے بارے

میں اگرچہ بہت تھک چکا تھا۔ اس مصری گائیڈ کا بھی حال ایسا ہی تھا۔ وہ بھی مجھے ہول کے کمرے میں چھوڑ کر جلد از جلد جانا چاہتا تھا مگر واپسی پر راستے میں مصری سے عجائب گھر پر جو نظر کی تو قدم جیسے جم سے گئے کہ عجائب گھر کا بھی نظارہ کرتا جاؤں۔ میں نے اس مصری عجائب گھر کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مصری گائیڈ بھی بنا کسی چوں چراں کے میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں نے اس کو جانے کی اجازت دے دی تھی مگر وہ مجھے اکیلے چھوڑ جانے پر راضی نہیں تھا۔

مصری عجائب گھر تو قدیم نوادرات کا میٹھ بھا خزانہ تھا۔ ہم صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے چبوترے پر میری نگاہ پڑی جہاں فرعون کے قد آدم مجسمے نصب تھے۔ دروازے کے اوپر خوب صورت پریوں جیسی دیوایاں اپنے پر پھیلانے ہوئے کھڑی تھیں۔ ہال میں داخل ہوئے تو درمیان میں بائیں گیلریاں تھیں جو ہال کے گرد گھومتی تھیں، جس میں میٹھ بھا خزانہ کی نوادرات رکھے ہوئے تھے۔ جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

یوں تو عجائب گھر میں ہر چیز ہی حیران کن تھی جس کو دیکھ کر انسان حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا مگر اس مجسمے کو دیکھ کر میرا منہ حیرت سے کھلا کھلا رہ گیا تھا۔ یہ واقعی کوئی عجوبہ کوئی انہونی جیسی بات ہی لگتی تھی اور اس مجسمے کو دیکھ کر میں کب سے یہی سوچ رہا تھا۔

میں نے اس مجسمے کے بارے میں جاننے کے لیے اس مصری گائیڈ سے پوچھنا چاہا مگر وہ مصری گائیڈ وہاں میرے آس پاس نہیں تھا۔ نجانے وہ مجھے چھوڑ کر کہاں چلا بنا تھا۔ میں مجسمے کے بہت قریب آ کر بہت غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے کمرے سے اس مجسمے کی نگاہ بہت سی تصویریں بھی اتاریں۔ ایک تصویر لیتے ہوئے مجھے کیمرے کی آنکھ میں کوئی سیاہ لہراتی ہوئی شے دکھائی دی۔ میں نے چونک کر فوراً کیمرے کو ہٹا کر دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں نے چند ایک تصاویر اور لیں۔ کیمرہ آنکھ سے ہٹاتے ہی اس بار مجھے واضح دکھائی دیا۔ اس مجسمے کے ساتھ کوئی تھا۔ کوئی سیاہ سا یہ ماحسوس ہوا جو بالکل مجسمے کے پاس لہرا رہا تھا اور پھر میری

میں مکمل معلومات نہیں ہیں تو ہمیں ابوالیا سیف کے پاس جانا ہوگا۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کو اس شخص کے بارے میں مکمل تفصیلات بتا سکے گا۔ وہ ماہر آثار قدیمہ رہا ہے اور کئی مصری تاریخ کی کتابوں کا مصنف بھی ہے۔ اب وہ سارا دن اپنے گھر میں ہی ہوتا ہے۔“ میں تو یہ سن کر ابھی اس مصری ابوالیا سیف کے پاس جانے پر رضا مند ہو گیا اور شاید میرا یہ ارادہ وہ مصری گائیڈ بھی بھانپ چکا تھا۔

“میرے خیال میں اس وقت آپ کو واپس جا کر آرام کرنا چاہیے۔ رات ہو چکی ہے یوں اس وقت اس کے گھر جانا مناسب بھی نہیں ہوگا۔ پھر ابوالیا سیف سے کل مل لیں گے۔ صبح سویرے ہی میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا۔“

وہ التجائیہ انداز میں بولا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی میری طرح کافی تھک چکا ہے۔ وہ تو میری اجازت ملنے پر یہاں سے بھاگنے پر تیار کھڑا تھا۔ ویسے میں بھی دوپہر سے نکلا ہوا تھا اب تو شام ڈھل کر رات میں تبدیل ہوئی تھی۔ میں نے مصری گائیڈ کی بات سے اتفاق کیا۔ اس کی بات کی تائید میں سر ہلکا کر واپس جانے کا ارادہ باندھا۔ ویسے بھی اس اوپری منزل پر اب یہاں کھومتے پھرتے لوگ مجھے بار بار گھور گھور کر دیکھنے لگے تھے۔ ظاہری بات تھی میری طرح ان سب کے لیے بھی اس جیسے کی ہو ہو میری طرح مشابہت حیرانگی کا باعث تھی۔ وہ حیرانگی جو مجھے یوں بار بار دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بخوبی نظر آرہی تھی۔ یوں یہاں اس مصری عجائب گھر میں مزید رہ کر اپنے آپ کو متاثر بنانے سے بہتر تھا کہ یہاں سے فوراً رفو چکر ہو جایا جائے۔

☆.....☆.....☆

“میں ہر حال میں اس عہد کو پورا کروں گا۔“ اس کے لب ملتے ہیں۔ میں غور سے اس نوجوان کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے کہ وہ نوجوان کوئی اور نہیں بلکہ میں خود ہی ہوتا ہوں اور پھر شدید گھبراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی اور پھر ایک بار جو میری آنکھ کھلی پھر تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ میں اس خواب کے متعلق سوچنے لگا۔ ایسا خواب پہلے بھی مجھے نہیں آیا تھا۔ یونہی سوچتے اور بیڈ پر اکروٹیں بدلتے کافی کوششوں کے بعد رات کے آخری پہر جا کر میری آنکھ لگی۔

صبح اٹھا تو نیند میری آنکھوں میں موجود تھی۔ نیند کی کمی کی وجہ سے میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے ابھی منہ دھو کر ناشتا کیا ہی تھا کہ وہ مصری گائیڈ آگیا۔

“گلتا ہے عارب صاحب آپ رات ٹھیک طرح سے سو نہیں پائے۔“ میری سرخ ہوئی آنکھیں دیکھ کر وہ شاید بخوبی سمجھ گیا تھا۔

مصری گائیڈ مجھے کار میں بیٹھا کر چند منٹوں میں ہی ہوٹل لے آیا۔ میں کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

“عارب صاحب! اب آپ ڈنر کر کے آرام کریں۔ صبح سویرے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ پھر میں ابوالیا سیف کے پاس آپ کو لے جاؤں گا۔“

میں نے اشارت میں سر ہلایا اور وہ سوویت کی

ہیں۔ اس بات پر میں نے اس بوڑھے کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ بوڑھا بھی میرا رویہ بھائیپ گیا تھا۔

ان میں حال ہی میں وادی الملوک میں دریائے نیل کے پہاڑی مقام کے پاس ایک مقبرہ دریافت ہوا جو افنا تون فرعون کا مقبرہ تھا۔ اس مقبرے سے ہی اس کے بیٹے خاقان کا مجسمہ بھی ملا مگر اس کے مقبرے کا کچھ اتنا پتا نہیں چل پایا۔

کہتے ہیں افنا تون فرعون کی یوں تو کئی ایک پٹا میں تھیں مگر ان سب میں ملکہ نفر تینی کو سبقت حاصل تھی ملکہ نفر تینی فرعون کی پسندیدہ ملکہ تھی۔ فرعون اس ملکہ سے بہت والہانہ پیار کرتا تھا اب فرعون افنا تون اور ملکہ نفر تینی کے مجسمے مصری عجائب گھر کی زینت بنے ہوئے ہیں پھر ملکہ نفر تینی کا مجسمہ قدیم وقت سے آج بھی قابل دید اور عجیب رعنائی لیے ہوئے ہے۔ یہی مجسمہ تو پورے مصر کی پہچان ہے۔ آج مصر کے ڈاک ٹکٹوں اور نوٹوں پر بھی اسی ملکہ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ وہ بوڑھا پھر میرے چہرے کی طرف دیکھتا ہا پھر اس نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

”دونوں کا بیمار مثالی تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے مرنے تھے مگر ایک ملکہ کو کسی پراسرار بیماری نے گھیر لیا۔ سارا جسم پچک کر سکنز گیا تھا اور جسم کا گوشت جھڑنے لگا۔ فرعون ملکہ کی اس بیماری پر بہت گھبرا گیا۔ اس نے مصر بھر کے حکیموں، ویدوں سے ملکہ کا علاج کروایا مگر کوئی علاج کارگر نہ ہوسکا۔ یہ پراسرار بیماری لا علاج ثابت ہوئی اور ملکہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ یہ پراسرار بیماری فرعون کی پہلی ملکہ کے جادو ٹونہ کی کارستانی تھی جس نے مصر کے ایک جادوگر سے ملکہ پر جادو کر دیا تھا۔ وہ ملکہ نفر تینی سے شروع ون سے دل میں حسد اور نفرت رکھتی تھی۔ فرعون ملکہ کی موت پر ٹوٹ سا گیا تھا۔

فرعون نے ملکہ کی لاش کو حنوط کروا کے اہرام کے اندر دفن کروا دیا۔ وہ اہرام تمام ماہر آثار قدیمہ کے لیے معمہ بنا ہوا ہے۔ باوجود کوشش کے تا حال وہ اہرام ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا۔

”ہاں میں...“ میں نے اس سے زیادہ بات نہیں کی۔ وہ بھی کچھ نہیں بولا۔ ریسٹورنٹ کے باہر اس کی گاڑی موجود تھی۔ ہم لوگ ہی اس مصری ابوالیا سیف کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔

اس ابوالیا سیف کا گھر شہر کے وسط میں ہی تھا۔ چھوٹا سا ڈربہ نما مکان جس میں دو کمرے اور ایک کچن اور باتھ روم تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے ایک ہی نظر میں سارے مکان کا جائزہ لے لیا تھا۔ ہم جس کمرے کی طرف گئے اگر اس کمرے کو لا بیری کہا جاتا تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ کمرے کی چاروں دیواروں پر الماریاں بنی ہوئی تھیں اور وہ تمام الماریاں کتابوں سے پُر تھیں اور تو اور کمرے کی اکلوتی میز بھی کتابوں سے بھری پڑی تھی۔ کمرے کے اندر دو چار پائیاں تھیں جس میں سے ایک پر بوڑھا سا سفید بالوں اور پچھڑی داڑھی والا بزرگ آدمی لیٹا ہوا تھا جس کی آنکھیں چھوٹی اور چہرہ گول تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مصری گائیڈ نے آگے بڑھ کر اس سے سلام دعا لی۔ وہ بھی جلدی سے اٹھا، عینک لگا کر اس نے ہم دونوں سے مصافحہ کیا مگر اس کی نظر میں میرے چہرے پر ٹک سی گئیں۔ وہ مصری گائیڈ تو ایسی ضروری کام کے سلسلے میں کچھ دیر میں واپس آنے کا کہہ کر چلا گیا تھا۔

”خامان شہزادے کے عہد پورے کرنے کا وقت آن پہنچا۔“ وہ بوڑھا مصری ابوالیا سیف مجھے دیکھتے ہی چونک کر بہت دھیمے لہجے میں بولا مگر میں نے اس کے الفاظ سن لیے تھے پر میں نے کچھ خاص توجہ نہیں دی۔

”حضور والا۔“ میں اس سے مخاطب ہوا۔

”ابوالحارث میرے گائیڈ نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ ماہر آثار قدیمہ ہیں۔ آپ کے پاس معلومات کا خزانہ ہے۔ میں تو اس مجسمے کے متعلق معلومات لینے آپ کے پاس آیا تھا جو میں نے عجائب گھر میں دیکھا۔ وہ بوہو میری شبیہ ہے۔ کہتے ہیں وہ کسی خاقان نای شہزادے کا مجسمہ ہے۔ آپ مجھے اس کے بارے میں بتائیے۔“

”ہاں..... بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ خاقان شہزادہ تھا۔ جس کو مار دیا گیا مگر آج لوٹ آیا۔ تھوڑی شکل

حصہ دار بادشاہ دیا کہ کوئی اس اہرام میں جا نہیں سکتا تھا۔
شہزادے کے وفادار سپاہیوں نے فرعون کی خواہش
پوری کرنے کی کوشش کی مگر اہرام میں داخل ہوتے ہی
ان سب کی موت واقع ہو گئی۔

صدیاں بیت گئی ہیں اس بات کو مگر فرعون کی آخری
خواہش پوری نہ ہو سکی۔ پھر ملکہ نفرتیتی کے اہرام کا نام و
نشان ہی مٹ گیا مگر مجھے پتا ہے ملکہ کا اہرام موجود ہے
اور اس کی تم کھوج لگاؤ گے اور شہزادے کے اس
ادھورے کام کو تم سرانجام دو گے۔ کیونکہ تم ہی وہ ہو جو
اتنے ہزار سال گزارنے کے باوجود بھی اس ایفائے عہد
کو پورا کر دو گے جو فرعون نے اپنے بیٹے سے لیا تھا۔ وہ
بوڑھا مصری یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

اب مزید اس کے پاس بظہر کر اپنا دل جلانے اور
اس کی بے ٹکی فضول باتوں پر غصہ کرنے کی بجائے وہاں
سے جانے میں ہی عافیت تھی۔

میں بوڑھے سے بنا اجازت لیے وہاں سے اٹھ
کھڑا ہوا میرا مصری گائیڈ فوراً آن دھمکا۔

ہم کار میں بیٹھے تو اس نے کار اشارت کی۔
"عارب صاحب اب کہاں جانے کا ارادہ ہے۔"

"کہیں نہیں۔ تم مجھے ریسٹ ہاؤس چھوڑ دو۔ آج
میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔" اس بوڑھے مصری کی
باتوں نے میرا سارا موڈ ہی خراب کر دیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس میں اپنے کمرے میں جا کر میں ٹی
وی آن کر کے بیٹھ گیا۔

ابھی مجھے آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ افضل کمال کی
کال آ گئی۔ وہ قاہرہ واپس لوٹ آئے تھے اس وقت
اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے وہاں بلا رہے
تھے۔ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ پھر ان سے مجھے ملنے کا
اشتقاق بھی بہت تھا۔ وہ میرے محسن بھی تھے۔ فوراً ہی
میں نے ہوٹل سے نکل کر ٹیکسی پکڑی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو
میں نے کمپنی کا ایڈریس بتایا جو انکل نے مجھے کال پر سمجھا
دیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور بڑی مہارت سے ٹیکسی قاہرہ کی
سڑکوں پر دوڑاتا ہوا مجھے تقریباً آدھے پونے گھنٹے میں
زونیرا کمپنی کے شاندار آفس لے آیا۔ میں انکل کمال
سے ان کے آفس میں ملا۔

ملکہ کی موت کے بعد فرعون نے سلطنت کے امور
میں دلچسپی لینا بھی بالکل ترک کر دی اور سلطنت کے
سارے معاملوں کی ذمہ داری اپنے اکلوتے بیٹے
شہزادے خافان کو سونپ دی جو اس کا تنہا وارث تھا۔

فرعون کی حالت بتدریج خراب سے خراب ہوتی
گئی۔ آخر کار وہ وقت آن پہنچا جب فرعون کا وقت
رخصت شروع ہو گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بلا کر نصیحت
کی۔ اس کی لاش کی می بنا کر اہرام میں دفن کر دیا جائے
مگر ہر صورت میں ملکہ کے تابوت کو اہرام سے نکال کر
اس کے اہرام میں اس کے تابوت کے ساتھ دفن کر دیا
جائے تاکہ وہ اور ملکہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں لیکن یہ کام
اتنا آسان نہیں تھا۔ خود فرعون یہ بات جانتا تھا۔ کیونکہ
اس قدیم مصر میں کاہنوں کے نزدیک دو لاشوں کی میاں
ایک ساتھ ایک اہرام میں نہیں رہ سکتی تھیں۔ کاہنوں
کے خیال میں اس طرح کرنے سے ان کے دیوتا ناراض
ہو سکتے تھے۔ مرنے وقت بھی اس نے اپنے بیٹے سے
نصیحت لی کہ وہ یہ کام ضرور کرے گا۔ اس کے بیٹے
خافان نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی یہ خواہش ضرور پوری
کرے گا اور ملکہ کا تابوت ضرور فرعون کے اہرام میں
پہنچائے گا مگر ایسا ہونہ سکا۔

شہزادے نے چپکے سے رات کی تاریکی میں ملکہ
کے اہرام میں جا کر ملکہ کے تابوت کو لے جانے کی
کوشش کی مگر کاہنوں کو کسی طریقے سے یہ خبر پہلے ہی
پہنچ گئی تھی۔ فرعون کی پہلی ملکہ کو جب فرعون کی آخری
خواہش کا پتا چلا تو اس نے اس بات سے کاہنوں کو
خبردار کر دیا۔

شہزادہ ملکہ کے اہرام میں داخل ہوا ابھی اس نے
ملکہ کا تابوت اٹھایا ہی تھا کہ چھپے کاہنوں نے تلوار کے
دار کر کے اس کو شدید زخمی کر دیا۔ آخری وار انہوں نے
شہزادے کے عین دل پر کیا اور شہزادہ اہرام میں دم توڑ
گیا۔ انہوں نے شہزادے کا کوئی اہرام نہیں بنایا تھا بلکہ
صحرا میں کسی جگہ اس کی لاش کو ڈال کر دفن کر دیا ملکہ کے
اہرام کی طرح شہزادے کے تابوت کا بھی آج تک پتا
نہیں چل پایا۔ فرعون کی پہلی ملکہ نے اس وقت کے جادو
مکروں کے جادو سے ملکہ نفرتیتی کے اہرام کے گرد ایسا

انگل واقعی بہت شائستہ، شفیق، نرم و خوش طبیعت کے مالک تھے۔ پہلی ہی نظر میں، میں ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ انگل کمال بھی مجھ سے بڑے یرتپاک انداز میں ملے مگر وہ بھی مجھے دیکھ کر ایک بار چونکے ضرور تھے۔ انگل اپنی کمری پر براجمان ہوئے تو انہوں نے بات شروع کی۔ میں نے بھی سامنے والی نشست سنبھال لی تھی۔

”عارب بیٹا اگر تم برا نہ مانو ایک بات کہوں۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”جی انگل! کیوں نہیں، کیا بات ہے۔“

”بیٹا! عارب تمہاری شکل اس مجھے سے ہو بہو ملتی ہے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں اور پھر جس کسی نے اس مجھے کو دیکھا ہوگا اگر اس کی تمہارے ساتھ ملاقات ہو تو لازماً وہ بھی یہی کہے گا۔ کیسا حسین اتفاق ہے۔“ میں واقعی بہت حیران ہوا ہوں۔

”میں جانتا ہوں انگل۔“ میں مسکرا دیا۔ میرے ذہن میں پہلے ہی یہ تھا کہ انگل کمال یہی سوال لازماً کریں گے۔

”تم کو پتا ہے؟“ انگل کمال حیران تھے۔ ”پر کیسے عارب بیٹا؟“

”وہ میں نے انگل عجائب گھر میں مجسما اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا ہے۔ کل کی بات ہے جب اس مصری گائیڈ کے ساتھ میں عجائب گھر گیا تھا۔“

”اوہ..... اچھا۔“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔

”ویسے واقعی اس کو اتفاق کا ہی نام دیا جاسکتا ہے۔ عارب بیٹا ویسے مجھے کل ابو الجارث نے بتایا تو تھا مگر میں نے اس کی بات پر خاص دھیان نہیں دیا مگر تم تو واقعی قدیم مصری تاریخ کا حصہ لکھے۔“ انہوں نے بات ختم کی اور زوردار تہققہ لگایا۔

”وہیے بیٹا سنڈ نہ کرنا میں تم سے صرف مذاق کر رہا تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”نہ..... نو..... انگل! اس او کے۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”پر انگل یہ قدیم مصری تاریخ کا حصہ بننے والی بات میرے ساتھ پہلے بھی ہو چکی ہے۔“ میں نے اس بوڑھے مصری والو الیا سینٹ کے ساتھ ہونے والی ملاقات

”وہیے بیٹا سنڈ نہ کرنا میں تم سے صرف مذاق کر رہا تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”نہ..... نو..... انگل! اس او کے۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”پر انگل یہ قدیم مصری تاریخ کا حصہ بننے والی بات میرے ساتھ پہلے بھی ہو چکی ہے۔“ میں نے اس بوڑھے مصری والو الیا سینٹ کے ساتھ ہونے والی ملاقات

”نہ..... نو..... انگل! اس او کے۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”پر انگل یہ قدیم مصری تاریخ کا حصہ بننے والی بات میرے ساتھ پہلے بھی ہو چکی ہے۔“ میں نے اس بوڑھے مصری والو الیا سینٹ کے ساتھ ہونے والی ملاقات

ذہن کو جھٹکا۔ انکل پہلے پہل تو مجھے اس اہرام کی طرف لے گئے جو حال ہی میں انہوں نے دریافت کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ فرعون افتاتون کا اہرام ہے۔ مجھے خیال گزرا کہ فرعون کے بارے میں اس بوڑھے مصری نے بھی بہت کچھ بتایا تھا۔

اہرام کے اندر داخل ہوتے ہی نہ جانے پھر مجھے کیوں احساس ہوا کہ میں اس اہرام میں بھی پہلے داخل ہو چکا ہوں۔

فرعون افتاتون کے اہرام سے باہر نکلے تو ہم اس جگہ کی طرف چل پڑے جہاں کھدائی کا کام کیا جا رہا تھا۔ یہاں کسی مقبرے کے ہونے کے آثار تھے اور دو دن سے مزدور یہاں کھدائی کرنے میں لگے ہوئے تھے مگر تاحال کوئی خاص کامیابی نہیں ملی تھی۔ انکل نے یہاں کی کھدائی اور تحقیق کے سارے معاملات میرے سپرد کر دیے۔ میں کیونکہ لیبر اسٹاف کا ہیڈ مقرر ہوا تھا کہ چونکہ میں ابھی اس فیلڈ میں نیا تھا اس لیے میری معاونت اور مدد کے لیے اس مصری گائیڈ ابوالحارث کو میرے ساتھ لگا دیا گیا۔ دریائے نیل کے ساحل کے پاس تین سے چار دن تک مزدوروں کے ہاتھوں اس جگہ کی کھدائی یونہی چلتی رہی۔ امید تھی کچھ نہ کچھ تو وہاں سے ہاتھ لگے گا مگر کوئی خاطر خواہ کامیابی ہاتھ نہیں لگ پائی تھی۔ میں کافی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ مصری گائیڈ کے مطابق بھی یہاں ریت مٹی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ میں نے اس بات سے پہلے ہی انکل کمال کو باور کرایا تھا۔ چوتھے دن سہ پہر کو وہ خود بھی وہاں آن پہنچے۔ شام ہونے سے پہلے ہی مزدوروں کو کھدائی سے ہٹا دیا گیا تھا۔ سارے مزدوروں نے اپنا اپنا سامان باندھا اور وہاں سے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ہم نے بھی تھک ہار کر وہاں سے واپس لوٹنے کا پروگرام بنایا۔

☆.....☆.....☆

میں نے آج رات پھر ایک خواب دیکھا مگر آج خواب پہلے خواب سے مختلف تھا۔ میں نے دیکھا میں قدیم شاہی لباس پہنے ایک صحرا میں بڑے سے ٹیلے پر کھڑا ہوں۔ رات کا وقت ہے مگر پورے چاند کی رات ہونے کی وجہ سے کمال اندھیرا نہیں ہے۔ میں پھر ریت

کے ٹیلے سے اتر کر دائیں طرف بھٹدی ریت پر چلنے لگتا ہوں۔ میں چلتا جاتا ہوں۔ دور مجھے فرعون افتاتون کے اہرام کی عمارت نظر آتی ہے۔ اس فرعون کے اہرام کے تقریباً 20 فٹ کے فاصلے پر بالکل سیدھے جاتے ہوئے ایک اور اہرام نما عمارت مجھے نظر آتی ہے۔ میں چلتا ہوا اس اہرام کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ اہرام کے سرخ رنگ کے پتھروں کو دھکیلتا ہوں تو مجھے اندر جانے کا رستہ نظر آتا ہے۔ میری منزل ملکہ نفرتینی کے مقام تابوت پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ مجھے سامنے اپنے چبوترے پر ملکہ کا تابوت بڑا ہوا نظر آتا ہے۔ میں جلدی سے لپک کر اس کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں تو میری پشت پر کوئی تلوار سے گہری ضرب لگاتا ہے۔ میں درد سے بے حال ہو کر نیچے زمین پر گر پڑتا ہوں۔ مجھے اہرام کے اندر پانچ آدمی دکھائی دیتے ہیں جن کے ہاتھوں میں تیز دھار کی چمکتی ہوئی تلواں ہیں۔ میں وہاں سے اٹھنا چاہتا ہوں۔ ان سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں پر وہ آدمی وار پر وار کر کے مجھے شدید زخمی کر دیتے ہیں۔ میں ان سے کچھ بولنا چاہتا ہوں ان کو پکڑنے سے روکنا چاہتا ہوں مگر سب بے سود ثابت ہوتا ہے ان میں سے ایک آدمی حقارت اور نفرت انگیز چہرے سے میری طرف دیکھتے ہوئے میرے سینے پر اپنی ٹانگ رکھ کر آخری تلوار کا وار میرے دل پر کرتا ہے میرے سینے سے خون کا فوارہ نکلتا ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

صبح صادق کا وقت ہوتا ہے۔ میں پہلے خواب کی طرح اس خواب سے ڈرا نہیں تھا۔ یہ خواب تو مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کڑیاں سے لڑیاں ملنے لگتی ہیں۔ فرعون کا اہرام اور اس کے بالکل بیس منٹ کے فاصلے پر ملکہ نفرتینی کا اہرام.....!

☆.....☆.....☆

میں نے صبح سویرے نہادھو کر جلدی سے ناشتا کیا اور گاڑی دوڑاتا ہوا انکل کمال کے آفس جا پہنچا۔ انکل کمال بھی ابھی ابھی آفس پہنچے تھے۔ انہوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ٹیل بجا کر سیکرٹری کو چائے لانے کا کہا۔ خواب میں مجھے اسی جگہ ملکہ کے اہرام ملنے لگے۔ میں جلدی ہوئی تھی۔ میں جلد از جلد اس جگہ کی کھدائی

دوبارہ شروع کر دینے والی بات بتا کر ان سے بس اجازت لینے خواہش مند تھا۔ میری بے تابی کو دیکھ کر انگل خود ہی بول پڑے۔

”عارب بیٹا خیریت! اتنے بے چین کیوں دکھائی دے رہے ہو۔“

”انگل دریائے نیل کے ساحل والی جگہ کی کھدائی جاری رکھنی چاہیے۔ ہمیں وہاں لازماً کچھ نہ کچھ تو ضرور ملے گا۔ اس لیے میں آپ کی اجازت طلب کرنے آیا تھا۔ تاکہ میں مزدوروں کو ساتھ لے جا سکوں۔“ مجھے پکا اندازہ تھا کہ ملکہ نفرتیسی کا مقبرہ بالکل اسی جگہ ملے گا۔ میں نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی اور انگل کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے اس اچانک فیصلے پر انگل بھی کچھ حیران تھے۔

”پر عارب بیٹا تم نے خود تو وہاں دیکھا ہے اتنے دن کھدائی جاری رہی مگر وہاں سے کچھ نہ ملا۔ پھر کھدائی بند کرنے کی بات تم نے خود ہی تو کی تھی۔“

”نہیں انگل..... ہمیں واقعی وہاں کھدائی جاری رکھنا چاہیے تھی۔ اگر میں وہاں کے بارے میں بتاؤں گا تو یقیناً آپ کو یقین نہیں آئے گا انگل وہاں ہونہ ہو فرعون کی ملکہ نفرتیسی کا مقبرہ ہے۔“

میری اس بات پر انگل کمال واقعی حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے تھے۔

”پر عارب تم کو کیسے پتا چلا؟ تم اتنے یقین سے یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو۔“

تو میں نے رات والا سارا خواب من وعن انگل کو سنا دیا۔ انگل کچھ دیر میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے تو ان کا لہجہ سہاٹ تھا۔

”عارب بیٹا! مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بھی ان خوابوں پر یقین کرتے ہو۔ بیٹا یہ خواب وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ خوابوں پر یوں یقین نہیں کرنا چاہیے۔“

انگل کا لہجہ اجازت نہ دینے والا تھا۔

”پر انگل صرف ایک بار..... میری خاطر..... میں ان کی طرف دیکھ کر بولا۔“ میں اپنے دل کی تسلی کرنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک دن کے لیے آپ کی اجازت

درکار ہے اگر کچھ کھدائی میں نظر نہ آیا تو پھر کھدائی بند کروا دوں گا۔ میرے بار بار کہنے پر آخر ان کو میری بات ماننا پڑی۔ میں نے فوراً ہی مزدوروں کو ساتھ لے جا کر پھر سے کھدائی کا کام شروع کروا دیا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں سے کچھ نہ کچھ تو ضرور نکلے گا۔ یہ بالکل وہی جگہ تھی۔ میں نے کئی بار فرعون افتاتون کے اہرام سے اس جگہ کے فاصلے کا معائنہ کیا۔ سو فیصد یہی جگہ تھی۔ پھر سورج نکلنے سے لے کر دوپہر دن چڑھنے تک سارے مزدور بنا کر مختلف اوزاروں سے اسی جگہ سے ریت اور مٹی ہٹا رہے تھے مگر کامیابی تھی جو نظر ہی نہ آرہی تھی۔ میں پھر سے مایوس ہونے لگا تھا۔ میں سوچنے لگا اب کی بار واقعی کھدائی سے کچھ نہ نکلا تو ناحق انگل کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ پھر اچانک چھٹاک کی آواز اس ریگستان میں گونجی۔ جس پر مجھ سمیت تمام کام کرنے والے مزدور تک چونک گئے تھے۔ کھدائی کے دوران نیچے زمین میں کوئی پتھر تھا جس پر کدال کے ٹکٹے ہی آواز گونجی تھی۔ پتھر ہونے کی موجودگی اس بات کا پیش خیمہ تھی کہ یقیناً نیچے مزید بھی کئی پتھر ہوں گے۔ وہ پتھر جن سے قدیم دور مصر میں اہرام تعمیر ہوتے تھے۔ پھر میرا خواب حقیقت بننے کے قریب تر تھا کہ ہونہ ہو یقیناً یہاں مقبرہ تو ضرور ہے۔ چاہے وہ جس کسی کا بھی ہو۔ میں نے مزدوروں کو مزید تیزی کے ساتھ اس جگہ کی کھدائی کرنے کا کہا۔ میں بھی اب کھدائی والی جگہ کے بالکل قریب آ گیا تھا تاکہ اس جگہ کا مکمل جائزہ لے سکوں کہ کیا ایک دم تیز بخ شہنڈی ہوا کا جھونکا میرے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ میرے جسم کو شہنڈک کا احساس ہوا۔

مارچ کے اوائل دن تھے۔ گرمی اتنی نہیں تھی جتنی پھر بھی یوں دوپہر کو ریگستان میں اس شہنڈی ہوا کا کوئی جواز تو نہیں بنتا تھا۔ پھر وہاں کوئی ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ میں نے پہلے پہل اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ میری خاص توجہ کھدائی پر مرکوز تھی کہ دوبارہ وہی اسی شہنڈی ہوا کا جھونکا مجھ سے ٹکرایا جس نے مجھے واضح طور پر چوکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یکا یک مجھے لگا جیسے کوئی بالکل میرے ساتھ کھڑا ہے۔ میں فوراً اپنے دائیں اور بائیں دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ میرے جسم پر کبھی سی طاری ہو گئی تھی۔

مزدور میری حالت سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھے۔ مجھے واقعی محسوس ہوا تھا کوئی میرے آگے پاس تھا ضرور۔

اب کی بار تو مجھے صاف واضح لگا کہ کوئی میرے پیچھے کھڑا ہے۔ میں نے فوراً گردن گھما کر دیکھا، پیچھے تو کوئی نہیں تھا مگر آگے.....!

”او میرے خدا!“ میرے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میرے بالکل سامنے سیاہ انسانی ہیولا تھا۔ میری آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ ابھی میں وہاں سے بھاگتا یا کچھ اور کرتا وہ سیاہ ہیولا فضا میں بھر کر غائب ہو گیا۔ یہ ایسا لمحہ تھا اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا مگر میں نے اپنے اعصاب بحال رکھے اور اپنے قدموں کو وہاں جھانکے رکھا۔ ویسے بھی میں دلیر اور نڈر نو جوان ثابت ہوا تھا۔ مگر پھر بھی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور ہاتھ پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔

میں نے فوراً ہی انکل کمال کو خبر دی۔ ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اسی وقت مصری گائیڈ کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

”عارب بیٹا! واہ آج تو تم نے کمال کر دیا۔ تم نے تو اپنی نوکری کے چند ہی دن میں کارنامہ سرائیج دے ڈالا۔ تم واقعی ذہین ہونے کے ساتھ خاصے محنتی ہو مجھے تم پر فخر ہے۔“ مصری گائیڈ بھی میری کامیابی پر مسرت تھا۔

شام ہونے سے پہلے پہلے کافی کھدائی کا کام مکمل ہو چکا تھا کہ مقبرے کے بیرونی دروازے تک جایا جاسکتا تھا۔ میں نے نیچے اتر کر مقبرے کے اندر جانے کا فیصلہ کیا تو انکل بھی میرے ساتھ چل دے۔ اندر خاصی وھول، منی اور فضا گھٹن زدہ تھی۔ اندیرا الجھی بہت تھا۔ اس لیے انکل اپنے ساتھ ٹارچ لے آئے تھے۔ ٹارچ روشن کی تو اندر جانے کے لیے کوئی رہنمائی ملی۔ اندر جانے کے سارے راستے بالکل فرعون افاتون کے مقبرے جیسے تھے جو انکل کمال کو بخوبی پتا تھے۔ اس لیے مقبرے کے اندر جانے میں ہمیں ذرہ برابر بھی کوئی

مشکل درپیش نہیں ہوئی۔ مجھے بار بار جانے کیوں یہ لگ رہا تھا کہ پہلے سے ہی میں ان دروازوں سے بخوبی واقف ہوں۔ مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے ہم ملکہ کے تابوت کے چبوترے پر پہنچ گئے۔ یہ بھی فرعون افاتون کے شاہی ایوان جیسا ہی تھا اور ساری دیواروں پر ملکہ نفرتی کی تصویروں کے نقش نمایاں تھے۔ تابوت کے اوپری ڈھکن پر بھی ملکہ کی تصویر کے مدھم نقش بنے ہوئے تھے اور کچھ عجیب زبان میں بھی لکھا ہوا تھا۔ انکل کمال کے مطابق یہ ہیردلسنی زبان تھی جو انکل کچھ کچھ سمجھتے تھے۔ یہ قدیم مصری زبان تھی۔ انکل پڑھنے لگے۔

”مصر کی خوب صورت ملکہ نفرتی کا تابوت“ انکل نے خود اونچی آواز میں یہ الفاظ پڑھے اور وہ خود ہی اپنے ان الفاظ پر حیران ہونے لگے۔ ملکہ کے مقبرے اور تابوت کا ملنا اور اس پر انکل کمال کی خوشی ہوئی تھی۔ مجھے صاف لگ رہا تھا کہ ان کا بس نہیں چل رہا تھا درندہ دانا چنے لگتے۔

”عارب بیٹا! تم کو اندازہ نہیں کہ تم نے یہ کیا کر دیا۔ کمال..... بھی..... کمال ہم نے ملکہ نفرتی کا مقبرہ دریافت کر لیا۔ یہ تو عجوبہ ہو گیا بیٹا عجوبے سے بھی بڑا عجوبہ۔“ انکل کمال کے خوشی کے مارے الفاظ منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ میں بھی ان کی خوشی میں خوش ہو رہا تھا۔

جب اس بات کی خبر پھیلے گی تو مصر کی پوری دنیا میں بھونچال آجائے گا۔ تحقیق کی نئی راہیں کھلیں گی ملکہ نفرتی کا مقبرہ دریافت ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ سب سے زیادہ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ اس سے ہماری کمپنی کو ہزاروں ڈالر کا فائدہ ہوگا۔ ویسے یہ سب اتنا جلدی اور اتنی آسانی سے ہو گیا مجھے اس بات کا اتنی جلدی اندازہ نہیں تھا۔ یوں مجھے خواب آنا اور خواب کو حقیقت مان کر اس جگہ کی کھدائی شروع کروادینا مجھے کئی بار رہ رہ کر یہ خیال آیا جیسے مجھ سے یہ سب کوئی نادیدہ طاقت ہے جو یہ کام کر رہی ہے۔

بہر حال مجھے تو مسرت اس بات کی تھی۔ انکل کے سامنے جو کہادہ سچ ثابت ہوا تھا۔

شام تک مزید کھدائی کا کام جاری رہا۔ انکل کمال کے مطابق ابھی اس مقبرے میں مزید کئی راز ہوں گے جن سے ابھی پردہ اٹھنا باقی ہے۔ مقبرے کے اندر بھی ابھی بہت کھدائی کرنا باقی تھی۔ پھر شام کے گہرے سائے پھلتے ہی کھدائی کا کام کل کے لیے روک دیا گیا۔ مزدوروں کو واپس بھیجا دیا گیا۔ انکل کمال اور مصری گائیڈ بھی چلے گئے۔ میرے پاس چونکہ گاڑی تھی اس لیے میں نے کہہ دیا کہ میں آخر میں اکیلا آ جاؤں گا۔

سب چلے گئے تو آخر میں، میں نے ایک بار پھر ملکہ کے مقبرے کی طرف دیکھا اور کچھ دیر وہیں کھڑے رہنے کے بعد گاڑی پر واپسی کے لیے مڑ گیا کہ اچانک ہی ریت کے طوفان نے مجھے گھیر لیا۔ یوں اچانک طوفان کے آنے پر میں شش و پنج میں بڑ گیا تھا۔ حالانکہ طوفان آنے کے دور دور تک کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یوں اس ریت بھرے طوفان میں گاڑی چلانا خاصا مشکل ہونے لگا۔ طوفان تیز سے تیز تر ہونے لگا تھا۔ ہر طرف ہی تاریکی سی چھا گئی تھی۔ چاند کی چاندنی ریت کی اوٹ میں جا چھپی تھی۔ آگے رستہ دکھائی دینا ناممکن ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی کو روکنا چاہا مگر بے سود۔ گاڑی میرے ہاتھوں سے نکلتی ہوئی ادھر ادھر بل کھاتی ہوئی کسی ریت کے ٹیلے میں جا پھنسی تھی۔ مجھے گاڑی کے دھماکے کی آواز بخوبی سنائی دی تھی۔ یوں گاڑی کے ٹکرانے کی وجہ سے میرا سر تیزی سے اسپیئرنگ سے جالگا۔ میں سیٹ پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور میرا کندھا زور سے سیٹ کے ساتھ والے دروازے سے جو ٹکرایا تو دروازہ کھل گیا اور میں گاڑی سے لڑکھڑاتا ہوا باہر ریت پر جا گر اب باہریوں کھلے میں آنے کی وجہ سے طوفان میں اڑتی ہوئی ریت میری آنکھوں، منہ، نچھنوں میں جا پھنسی جس سے سانس لینا مشکل ہی نہیں دو بھر ہو رہا تھا۔

میں ریت سے بچنے کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اتنا تیز اڑتا ہوا دھول ریت بھرا طوفان آخر کب تھا۔ گرد و غبار جب ہٹا تو میں نے خود کو ریگستان میں ہی ریت کے بڑے سے ٹیلے پر پایا۔ چاندنی چھن چھن کر سارے

ریگستان پر پڑ رہی تھی۔ ہر سو اجالا سا بکھرا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ میں یہاں کیسے آ گیا۔ میں ٹیلے سے فوراً نیچے اترا۔ میری گاڑی کا کہیں اتنا پتا نہیں تھا۔ میں گاڑی کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ میرے پاؤں کے بالکل قریب ہی تیز گزرا ہٹ کی آواز آئی اور ساتھ ریتنی زمین شک ہو گئی۔ وہاں ایک گہرا سا گڑھا ابھرا جس سے ایک پرانا لکڑی کا تابوت برآمد ہوا۔ میرے لیے یوں اچانک یہ سب کچھ ناقابل یقین منظر تھا۔ خوف کی ایک لہر میں جسم میں دوڑ گئی مگر شدید جھس کے مارے میں تابوت کو کچھ دیر غور سے دیکھتا رہا۔ تابوت کے ڈھکن کے اوپری طرف قدیم مصری تاریخ کے نقش نگار بنے ہوئے تھے۔ میرے دل میں وہاں کھڑے ہوئے طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ ایک خیال آیا کہ فوراً یہاں سے بھاگ جاؤں۔ دوسرا خیال مجھے اس تابوت کا ڈھکن کھول کر اندر دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ بالآخر میں نے سارا حوصلہ یکجا کیا اور وہاں سے کسی بڑول کی طرح بھاگ جانے کی بجائے اس تابوت کی حقیقت جاننے کا فیصلہ کیا۔ تابوت کا اوپری ڈھکن مضبوطی سے بند تھا مگر میری دو تین بار کوشش سے ڈھکن اوپر سے ہٹ گیا۔

”اف خدا یا.....“ میرے منہ سے اتنی زوردار چیخ نکلی جس کی آواز ریگستان بھر میں گونج اٹھی تھی۔ اندر میرے ہی جیسا بالکل میری شکل و صورت سے مشابہہ کوئی نوجوان پڑا ہوا تھا۔ مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں ہی سامنے پڑا ہوں اور اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ نوجوان کی لاش بہت قدیم لباس میں ملبوس تھی اور اس کے جسم پر جگہ جگہ گھاؤ کے نشان تھے۔ دل کے مقام پر گھاؤ کا نشان بہت گہرا تھا۔ اس تابوت میں پڑی لاش کو دیکھ کر میرے دل میں جو پہلا خیال آیا وہ یہ تھا کہ کیا یہ ای شہزادے خاقان کی لاش کا تابوت ہے جسے اس بوڑھے مصری کی سنائی ہوئی کہانی اور میرے خواب کے مطابق ملکہ نفرتینی کے اہرام میں قفل کر دیا گیا تھا اور ای ریگستان میں کسی ریت کے ٹیلے کے پاس دفن کر دیا گیا تھا۔ تو کیا اس بوڑھے مصری کی بتائی ہوئی بات سچ تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لاش کی طرف دیکھ رہا تھا کہ فوراً ہی

لاش میرے لیے بنائے دھوئیں میں تبدیل ہو گئی اور وہ دھواں اوپر فضا میں سیاہ انسانی ہونے کی شکل اختیار کر گیا جس کو میں نے ابھی کھدائی والی جگہ پر دیکھا تھا۔ میں خوف سے اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس پر اسرار ہونے کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

”آخر تم آگئے۔ مجھے یوں تمہاری شکل میں اپنے آپ کو دیکھ کر بہت خوش محسوس ہوئی ہے۔ پر تم نے مجھے بہت انتظار کروایا۔ سینکڑوں سال سے میں تمہاری راہ تک رہا تھا۔ میری روح اس وقت سے بھٹک رہی ہے جب سے مجھے بے موت مارا گیا تھا اور میں اپنا کیا ہوا عہد پورا نہ کر سکا۔“ ہونے کی پر اسرار مہمنائی آواز میرے کانوں سے نکرائی تو میں سحرزدہ سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے جا رہا تھا۔

”اس لیے تو میری روح اب تک بھٹکتی رہی۔ مجھے پتا تھا کہ ہر صورت مجھے یہ عہد پورا کرنا ہے جو میں نے بادشاہ فرعون سے کیا تھا۔ اس عہد کو نبھانا تھا۔ پر میری روح تو زندہ تھی مگر جسم مردہ ہو چکا تھا۔ مجھے اس جسم کی تلاش تھی جو ہو ہو بالکل میرے مشابہ ہو۔ وہ انسانی وجود جس کا مجھ سے رتی برابر بھی فرق نہ ہو، بس اس انتظار میں ہزاروں سال گزر گئے اور دیکھو تم آگئے آج تمہاری وجہ سے میرا وہ کیا ہوا عہد پورا ہو گا اے میرے ہم وجود انسان۔“ اس پر اسرار انسانی ہونے کا ہر لفظ میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ میں اپنی شدید خواہش کے باوجود بھی وہاں سے بھاگ نہیں پارہا تھا۔ میرے پاؤں ایسے جیسے ریت میں دھنس گئے ہوں۔ وہ انسانی ہونے کے فضا میں میرے ارد گرد ایک چکر کاٹا اور بالکل میرے سامنے آکھڑا ہوا۔

”مم..... مم..... مجھے جانے دو.....“ میرے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔ میرے منہ سے بمشکل ہی لفظ نکلے۔

”چلے جانے سے میں تم کو رد کوں گا نہیں مگر پہلے تم نے میرے ادھورے کام کو پورا کرنا ہے۔“ ہونے کے منہ سے یہ لفظ نکلے اور وہ تیزی سے میرے جسم سے نکرائی۔ ایسے جیسے کہ کسی ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا میرے

جسم سے چھو کر گزرا ہوا اور وہ ہونے کے جسم میں جذب ہو گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے میرے جسم کو زردار جھکا لگا یا۔ ایسے جیسے میں نے کسی بجلی کے تار کو چھوا ہوں۔ مجھے اتنا یاد تھا کہ میرے ہوش و حواس میرے قابو میں تھے۔ پر میرے جسم پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس لیے بلا ارادہ ہی میرا جسم شمال کی طرف مڑا اور میرے پاؤں تیزی سے اس جانب آگے ہی آگے بڑھنے لگے۔ مجھے یہ اندازہ تک نہیں تھا کہ آخر میں جا کہاں رہا ہوں۔ چاند کی ٹھنڈی روشنی میں ٹھنڈی ہی ریت پر میں کسی ردیوٹ کی طرح چلتا ہوا بہت دور نکل آیا تھا کہ ایک جگہ آ کر میرے قدم بے اختیار رک سے گئے تھے۔ میرے جسم کے اندر سے آتی ہوئی ایک آواز نے مجھے ایسا کرے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے ایک نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا۔ میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں کھدائی کے دوران ملکہ نفرتی کا مقبرہ دریافت ہوا تھا۔

”اب اس مقبرے کے اندر جا کر ملکہ نفرتی کے تابوت کو نہیں اٹھا کر باہر لانا پڑے گا۔“ اندر سے آتی ہوئی آواز نے جیسے مجھے حکم دیا اور میں معمول کے انداز میں قدم بڑھتا ہوا مقبرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اب کی بار مقبرے میں اندھیرا نہیں تھا۔ ایک روشنی تھی جس نے سارے مقبرے کے در و دیوار کو منور کر دیا تھا۔ میں چلتا ہوا اس جگہ آن رکا جہاں ملکہ کا تابوت پڑا ہوا تھا۔ ملکہ کا تابوت سنگی اور نہایت وزنی تھا۔

”میں جب ملکہ کا تابوت اٹھانے آیا تھا۔ اس وقت تابوت لکڑی کا تھا۔ میرے پاس اس کو اٹھانے کے لیے رتھ بھی تھی۔“ پھر وہی اندر سے آتی آواز میرے کانوں سے نکرائی۔

”مگر اب ملکہ کا تابوت اور چوڑا سنگی حالت میں ہے۔ اگر چہ تابوت کا وزن کئی ٹن ہے مگر پھر بھی تم کو اسے اٹھا کر اپنے کاندھے پر لا کر فرعون افتاتون کے اہرام تک لے جانا ہو گا اور تم یہ کام کر دو گے۔“

میرا ذہن اس بات کی نشی کر رہا تھا مگر میرا جسم فوراً نیچے کو جھکا اور تابوت کو دونوں اطراف سے پکڑ کر زور سے اٹھا لیا۔ وہ سنگی تابوت چوڑے سے اکھڑ کر

میرے ہاتھوں سے اور اٹھ گیا تھا۔ یا تو میرے جسم میں ایسی طاقت آگئی تھی کہ مجھے لگا اگر میں پہاڑ کو بھی ہاتھ ماروں گا تو وہ ٹوٹ جائے گا۔ تابوت کو اوپر اٹھا کر میں نے اسے اپنے کاندھے پر سوار کیا جیسے میرے لیے تابوت کوئی موم کا بنا ہوا ہو۔ میں تابوت کو اٹھائے ملک کے مقبرے سے باہر آ گیا۔

”اب تم کو فرعون اقاتون کے اہرام کی طرف جانا ہو گا تاکہ تم اہرام کے اندر جا کر اس تابوت کو فرعون کے چوتھے کے عین درمیان میں اس کے تابوت کے ساتھ رکھ سکو۔“ اس آواز نے مجھے اگلا کام کرنے کی راہ بتلائی۔ میں پھر معمول کی سی حالت میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹھنڈی ریت کو عبور کرتا ہوا بہت جلد ہی فرعون اقاتون کے اہرام کے پاس آن کھڑا ہوا۔

میں نے اہرام کی سامنے والی دیوار پر ہاتھ رکھا تو دیوار شق ہو گئی اور اندر جانے کا راستہ نظر آنے لگا۔ میں تابوت کو اٹھا کر اندر آ گیا اور اندر خود کو فرعون کے اس شاہی ایوان میں پایا جہاں فرعون کا تابوت رکھا ہوا تھا۔ ”اب دیر نہ کرو۔ جلدی سے اس تابوت کو فرعون کے تابوت کے ساتھ رکھ دو۔“

آواز کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے میں چوتھے پر چڑھ کر ملک کے تابوت کو کندھے سے اتارا اور فرعون کے تابوت کے ساتھ رکھ دیا۔ چوتھے پر گر گڑا ہت کی تیز آواز ابھری اور ملک فرعون کا تابوت آدھے سے زیادہ چوتھے کے اندر دھنس گیا۔ فوراً ہی چوتھے کا سنگی فرش ہموار ہو کر برابر ہو گیا۔ مانو ایسے جیسے ملک کا تابوت صدیوں سے یہیں پر نصب ہو۔ میں بھی یہ سب دیکھ کر شاک کی کیفیت میں آ گیا تھا۔

”جاد اب تمہارا کام ختم..... اس کے ساتھ میرا تم سے رابطہ بھی ختم۔“

اندر سے آواز ابھری اور ساتھ ہی میرے جسم کو دوبارہ شدید قسم کا جھٹکا لگا۔ میرا جسم اکڑنے لگا۔ آنکھوں اور ذہن پر اندھیرا چھانے لگا کہ اب سامنے کچھ دیکھنا مشکل ہونے لگا تھا۔ ایک شور تھا جو کانوں میں تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ سامنے سامنے کرتی آوازیں جیسے کہیں بہت تیز ریت جھرا طوفان چل رہا ہو۔

آوازوں بے نیچے گئے لیے اسے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ ذہن پر چھائے۔ اندھیرے کو جھٹکنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ آخر کار بے بس ہو کر میں نیچے زمین پر جا پڑا اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ریت پر گر ہوا پایا۔ بالکل اسی جگہ جہاں میں گاڑی سے نکل کر گر ا تھا۔ سورج کی تیز حدت کی روشنی نے مجھے یہ باور کرایا کہ رات جانے کب کی ڈھل چکی ہے۔ دن خاصا چڑھ چکا ہے۔ گاڑی کچھ فاصلے پر ہی ریت کے نیلے میں دھنسی ہوئی تھی۔

میں نے بمشکل اوپر اٹھنے کی کوشش کی مگر میری کمر اور دائیں کندھے میں شدید درد تھا۔ میں گاڑی کا سہارا لے کر اٹھا ضرور مگر بے انتہا درد کی وجہ سے دوبارہ ریت پر اوندھے منہ جا گرا۔ دور کسی اور گاڑی کے آنے کی آواز جو قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ میں نے پھر ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی۔ میرے ذہن میں بس یہی خیال آ رہا تھا کہ میں نے ساری رات آن ریگستان میں گزاری۔ میں نے سر اٹھا کر اپنی طرف آنے والی گاڑی کو دیکھنا چاہا مگر اتنی مہلت نہ ملی، میں بے ہوشی کی نیند اوڑھ چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک بار پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اس بار خود کو اسپتال کے کمرے میں بید پر لیٹے پایا۔ میری حیرانگی کی انتہا تھی کہ میں ریگستان میں پڑا تھا یہاں تک کیسے آن پہنچا۔ میرا ذہن خالی خالی سا تھا۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر کچھ خاص یاد نہیں آ رہا تھا۔ سب کچھ دھندلا دھندلا کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا جیسے میں ابھی کسی گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں۔ میں نے اپنے سامنے ہی انگل کمال اور ابوالحارث مصری گا بیز کو اپنے لیے متفکر بیٹھا دیکھا۔

مجھے مکمل صحت یاب ہونے کے بعد ڈسچارج کر دیا گیا۔ اتنے دنوں میں، میں سب کچھ بھلا چکا تھا۔ میں آفس دوبارہ جوائن کرنے کا سوچ رہا تھا۔ فارغ بیٹھ کر قدرے بوریت محسوس کرنے لگا تھا مگر انگل مجھے کچھ دن اور بیڈ ریسٹ کا مشورہ دے رہے تھے۔ ان کی بات مانگتے ہوئے دو دن مزید آرام کیا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اور اگلے دن میں صبح ہی ناشتا کر کے ہفتس کے لیے نکل گیا۔ اس دن ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی جس کی وجہ سے موسم خاصا اچھا خوشگوار سا ہو گیا تھا۔ موسم انجوائے کرتے ہوئے گاڑی کو دھیمی رفتار سے روڈ پر ڈرائیور کرتے ہوئے ٹریفک سگنل پر میں نے گاڑی چند منٹ کے لیے روکی تو کسی نے گاڑی کے شیشے پر دستک دی۔ میں نے توجہ کی تو مجھے وہ بوڑھا مصری کھڑا نظر آیا جو مسکرا کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم نے آخر وہ کام کر دیا۔ فرعون افاتون سے کیا ہوا وعدہ پورا ہوا۔ میں جانتا تھا تم ہی تھے جس کے ہاتھوں سے یہ کام سرانجام ہونا تھا۔“

وہ بولا تو میں دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ کیا واقعی ملکہ نفرتینی کا تابوت فرعون کے اہرام میں جا پہنچا ہے اور یہ سب میں نے کیا ہے۔ یہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو انکل مجھے ضرور بتاتے۔ میں سوچ کر رہ گیا تھا کہ یہ وہ خواب نہیں بلکہ سچ تھا؟

میں اس بوڑھے مصری سے مزید بات کرنا چاہتا تھا۔ میں گاڑی سے باہر نکلا مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ میں جتنی جلدی ہو سکتا تھا گاڑی دوڑاتا ہوا انکل کمال کے آفس جا پہنچا۔ میں نے انکل کے سامنے یہی سوال کیا۔ انکل کمال نے بنا کوئی بات کہے میز کی دراز سے ایک اخبار نکالا اور میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔

”عرب بیٹا! اس اخبار کے پہلے صفحے کو غور سے پڑھو۔“ میں نے بنا کچھ سوچے کچھ اچھے ذہن کے ساتھ پہلے اخبار کو سیدھا کیا اور پہلے صفحے پر نگاہ دوڑائی۔ وہ کوئی پانچ روز پہلے کا اخبار تھا۔

پہلے صفحے پر بڑی سی ہیڈ لائن تھی میں پڑھنے لگ گیا۔

”دریائے نیل کے ساحل کے مشرق کی طرف ملکہ نفرتینی کا مقبرہ دریافت..... ساتھ ہی پراسرار طریقے سے ملکہ نفرتینی کے تابوت کی چوری..... تیسری ہیڈ لائن تھی کہ تابوت آخر فرعون افاتون کے اہرام سے برآمد.....“

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اخبار میں ان ہیڈ لائنز کے نیچے تفصیل لکھی ہوئی تھی۔

میں اس کوئی کئی سال گزر چکے ہیں۔ میں آج بھی اس کہانی سے منسلک ہوں۔ اہراموں کی کھدائی اب میرا روز کا معمول ہے مگر اس جیسا پھر کوئی واقعہ بھی پیش نہیں آیا میں آج بھی اس واقعے کے متعلق سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ ٹھوس شواہد کے باوجود مجھے اب بھی اس واقعے کی حقیقت پر شک گزرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اب بھی کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ یوں اچانک مصر کا ویزا ملنا، یوں بیٹھے بٹھائے نوکری مل جانا، شہزادے خاقان کا مجسمہ ملکہ نفرتینی کے اہرام کی کھدائی اور پھر ملکہ نفرتینی کے تابوت کا فرعون افاتون کے اہرام تک کا سفر۔ سب خواب سا لگتا ہے۔ مجھے واقعی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی گہری نیند میں ہوں جب انٹوں گا تو یہ میرا بیٹا ہوا کل کسی خواب کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اخبار میں ان ہیڈ لائنز کے نیچے تفصیل لکھی ہوئی تھی۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اخبار میں ان ہیڈ لائنز کے نیچے تفصیل لکھی ہوئی تھی۔

مون سُون..... اور ہم



ساتھیو! اس وقت ہمارے ملک میں مون سُون پوری شان سے اپنی جولانی دکھا رہا ہے۔ کاش کہ مون سُون بارشوں میں ہمارے ملک کا نکاحی آب کا نظام بھی اتنا اچھا ہوتا کہ ہم پاکستانی پوری شان سے اس خوب صورت موسم کا لطف اٹھا سکتے۔ بارش کی پہلی بوند ہی ہمیں فکرات لاحق کر دیتی ہے۔ اور مون سُون پوری شان سے ہماری شاہراہوں پر عرصے تک اپنے رنگ دکھاتا ہے۔

زیر نظر تصویر میں برسات کے بعد سڑکیں دریا، تالاب کا نظارہ پیش کر رہی ہیں اور منچلے بچے بغیر کسی ڈر کے دریا کی سیر کر رہے ہیں۔

ارے ارے..... طریقہ نہ دیکھیں..... یہ ہمارا اپنا ایجاد کیا ہوا ہے بھئی..... نہ ہنگ لگے نہ پھٹکری..... رنگ بھی چوکھا آئے۔



بھارت میں ہلکے سب سے

محمود شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ بے نقاب کرتا۔
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفر نامہ بھارت

آٹھواں حصہ

غلام بھی تھا۔ یہ عظیم یادگار، جہاں لاکھوں غیر ملکی اور ملکی سیاح آتے ہیں اور اس عظیم بادشاہ کو سلام کرتے ہیں جس نے اس دور میں یہ فلک بوس مینار بنایا اور خود اس کا بنانے والا لاہور کے ایک گنجان محلے میں ایک چھوٹی سی جگہ میں معیوبی کی قبر میں ابدی غنیمت سو رہا ہے۔ کہاں مغل بادشاہوں کی آخری آگاہ گاہیں ہیں؟ کہاں قطب الدین ایبک کی قبر، بادشاہ تو بننا مگر تھا تو غلام ہی..... زندہ لوگوں کے رہنے کی جگہ تو نہیں گھیری۔ ڈرائیور ہیرا لال مجھے مختلف علاقوں سے گزارتے ہوئے قطب مینار پر لے آیا ہے۔ میں آج اکیلا ہی آیا ہوں میرے ساتھ کوئی سرکاری صاحب نہیں ہیں۔ یہ پروگرام بھی میں نے اپنے طور پر اچانک بنایا ہے۔ تاریخ ہندوستان میں مجھے قطب الدین ایبک کی شخصیت نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ بادشاہ ضرور تھا مگر اس میں عوامی پن بہت جھلکتا تھا۔ یہاں بھی گائیڈ لیکچر گھیرتے ہیں لیکن میں معذرت کر کے آگے نکل جاتا ہوں۔ کیونکہ میں اپنی ہی تاریخ کے اوراق میں داخل ہو رہا ہوں، یہاں مجھے کسی کی رہنمائی کی کیا ضرورت ہے۔

جب بھی ایوزیشن کی طرف سے کوئی رکن حکومت پر کوئی الزام لگاتا ہے۔ تو حکمران پارٹی کانگریس کے چاروں قطاروں میں بیٹھے۔ ارکان بیک آواز شور مچا کر اس رکن کو خاموش کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اپنی قومی اسمبلی میں بھی ہوتا ہے اور پہلے بھی ہوتا رہا ہے لیکن بھارت کی ایوزیشن والے زیادہ سخت جان ہیں، وہ اپنی بات پوری کر کے ہی بیٹھتے ہیں۔

پارلیمنٹ سے باہر نکلتے ہوں تو بھارت کے وزارت خارجہ کے جو افسر میرے ہمراہ آئے تھے، وہ میرا تاثر جاننا چاہتے ہیں کہ میرا کیا رد عمل ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ آپ کی جمہوری روایات ہر چند ہم سے ویرینہ اور بہتر سہی لیکن پارلیمانی معیار ایک سا ہی ہے۔ چیخنے میں ہمارے ارکان بھی آج سے کم نہیں ہیں۔ بحث کا انداز بھی آپ کا کچھ ایسا بہتر نہیں ہے۔ بس یہ غنیمت ہے کہ آپ کی پارلیمنٹ سیشن میں رہتی ہے۔

قطب صاحب کی لاٹ پر

میں وہی اچھی طرح دیکھ چکا ہوں لیکن قطب صاحب کی لاٹ باقی ہے۔ آج ارادہ ہے کہ ادھر بھی ہوں۔ عہد رفت کی ایک عظیم یادگار، عظیم بادشاہ جو

میرا تاریخ کھنڈرات میں لکھی ہے۔ یہ شگفتہ دیواریں۔

اجڑی ہوئی مسجد قوت الاسلام

میرے ماضی کی یادگار ہے، بادشاہ کے وقت کی یاد کیسے مجھ سے لپٹی چارہی ہے۔ یہ عمارتیں کتنی سرخ ہوئی تھیں۔ کتنا قدرتی رنگ تھا ان کا۔ کوئی تصنع تھا، نہ کوئی تکلف۔ یہ قطب مینار ہے۔ آسمان چومتا ہوا۔ اس کی قدامت کے پیش نظر اب صرف پہلی منزل تک چڑھنے کی اجازت ہے۔ یہاں ٹکٹ لگتا ہے۔ آس پاس کھنڈرات ہیں مگر انہیں محفوظ رکھا گیا ہے۔ گھاس کے لان بھی ہیں۔ یہ ایسے کھنڈرات ہیں جو کھنڈر کی بجائے قابل دید عمارتیں بنے ہوئے ہیں۔ ان سے خوف نہیں آتا۔ یہ شمس الدین التمش کی آخری آرام گاہ ہے، اجڑی ہوئی، امتدادِ زمانہ کے نشانات ہر سمت ہیں۔ چھت پر بھی گھاس اگ رہی ہے۔ بر مزار ماغریباں نے چراغ نے گلے یہ لوگ کتنی عظمت رکھتے تھے، ان سے زمیں کانپتی تھی۔ کروڑوں افراد ان کے حکم پر چلتے تھے۔ آج یہ منوں مٹی کے نیچے سو رہے ہیں۔ آج یہاں لوگ صرف یادگاریں دیکھنے آتے ہیں۔ مسجد قوت الاسلام بھی اب ایک خرابہ ہے۔ چاروں طرف احاطہ ہے۔ بیچ میں گھاس کے لان ہیں۔ سیاح یہاں آرام کر سکتے ہیں۔ آکس کریم کھا سکتے ہیں۔ چائے پی سکتے ہیں، ٹھنڈا ملتا ہے۔ قطب مینار کے بارے میں تصویریں، کتابیں بھی مل رہی ہیں۔ ادھر ساتھ ہی سیاحتی کارپوریشن کی طرف سے ایک ریسٹوران بھی موجود ہے۔ ہندوستان کی سیاحتی کارپوریشن نے تمام تاریخی یادگاروں کے ساتھ ساتھ ریسٹوران بنارکھے ہیں تاکہ سیاحوں کو کوئی دقت نہ ہو اور اس کے ساتھ ہی ایک ہی ڈی کرافٹ سینٹر بھی۔ یہ سینٹر بھی ہر جگہ ملتے ہیں۔ یہاں امریکی اور یورپی سیاح ہندوستان کی دستکاری کی مصنوعات خریدتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بڑی نادر چیز ہیں۔ ایک اپنی سیاحتی کارپوریشن بھی ہے، جواب

کوئی روگ جان کو نہیں لگاتی۔ ہیں ڈی کرافٹ سینٹر شہروں میں موجود ہیں کسی سیاح کو اتنا ہی شوق ہے تو شہر سے جا کر کیوں نہیں خرید لیتا۔ میں ہیرالال کے ساتھ ریسٹوران میں آ بیٹھا ہوں وہ میرے ساتھ بیٹھنے سے ہچکچا رہا ہے۔ میں اسے کہتا ہوں ایسی کوئی بات نہیں ہم سب انسان ہیں۔ ڈرائیور بھی انسان ہوتے ہیں۔ اتنی دیر سے ساتھ سفر کر رہے ہیں تو یہاں ساتھ بیٹھنے میں کیا ہرج ہے۔ ہیں ڈی کرافٹ سینٹر کا ایک نمائندہ میرے پاس آتا ہے اور مجھے ایک کارڈ دیتا ہے اور ساتھ یہ کہتا ہے کہ آپ ایک بار دکان پر تشریف ضرور لائیں، چاہے خریدیں کچھ نہیں۔ اب دکان پر جاتے ہی بنتی ہے۔ دکان پر وہی چیزیں ہیں جو دوسرے سینٹروں میں ہیں۔ ظاہر ہے مجھے یہ چیزیں خریدنے سے کیا دلچسپی باہر نکلتے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھتا ہوں تو ایک نو عمر سردار جی گھیر لیتے ہیں اور بڑی گاڑی انگریزی میں۔ مجھے اپنے ہیں ڈی کرافٹ سینٹر کی طرف چلنے کی دعوت دے رہے ہیں جہاں ہندوستان کی بہترین مصنوعات مل سکیں گی۔ میں انتہائی انہماک سے ان کی انگریزی سن رہا ہوں، جب ان کی انگریزی ”مک“ جانی ہے تو میں ان سے ٹھیکہ پنجابی میں کہتا ہوں۔

”سردار جی خیریت تے ہے، ایڈی کی انگریزی مار رہے او پنجابی وچ کل کروناں۔“

سردار بڑے پریشان ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے پر خفت سی جھلکتی ہے۔

اور پھر کہنے لگتے ہیں۔ ”معاف کرنا جی۔ میں سمجھیاں۔ کوئی یوگنڈا توں کدے ہوئے ہندوستانی او ایس لئی انگریزی بول رہیا ساں۔“

خیر انہوں نے پھر مجھے کہا کہ مجھے راستے میں دکان پر چھوڑ دیجیے۔ پھر بھی موقع ہو تو ضرور آئیے گا۔ وہ راستے میں مجھے بتاتے ہیں کہ وہ وہی میں رہے ہیں جہاں پاکستانی بھی رہتے تھے۔ ان کے ساتھ رہ کر انہیں اپنے بڑوں کے ساتھ ہونے قصوں کی سچائی

معلوم ہوئی۔ وہ تو نوجوان ہیں انہیں ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن ان کے بڑوں نے مسلمانوں کی دوستی اور ایمانداری کے قصے سنائے تھے۔ دینی میں جب مسلمان نوجوان ان کے دوست بنے تو اس کی تصدیق ہوئی۔ ان کی دکان آگنی ہے اور وہ رخصت ہو رہے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ ان کی انگریزی میں نے چلنے نہیں دی۔

(جمنا داس اختر کے ساتھ)

شام دہلی کو اپنی آغوش میں لے رہی ہے۔ مجھے دہلی میں آئے ہوئے 9 روز گزر گئے ہیں۔ اب دہلی جانا بیچنا لگتا ہے۔ میرے پاس کمرے میں فلم ختم ہو گئی ہے۔ ڈرائیور سے کہتا ہوں تو وہ راستے ہیں ایک نئی آبادی میں لے لیتا ہے۔ جو بالکل کراچی کی سوسائٹی کی طرح کی ہے۔ ساؤتھ اسٹیشن ایسے بلاک کی بلاک۔ یہاں ایک فوٹو گرافر کی دکان سے فلم خریدتا ہوں۔ پاکستان میں جو فلم ساڑھے چار روپے کی ملتی تھی یہاں ساڑھے چھ کی ہے۔ حالانکہ ہمارے روپے کی قیمت میں حال ہی میں کمی ہوئی ہے۔ میں دکاندار سے کہتا ہوں۔ ہمارے پاکستان میں تو یہ فلم سستی ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے اچی ہاں آپ سچ کہتے ہیں۔ وہاں کی کیا بات ہے۔ ادھر تو مہنگائی بہت ہے۔ ہوٹل پہنچتا ہوں تو رات ڈھل رہی ہے۔ آج مجھے ہندوستان کے ایک بزرگ صحافی جمنا داس اختر سے ملنا ہے۔ ان کی کتاب ”پاکستان میں سیاسی سازشیں۔ قائد ملت کی شہادت سے لے کر ایوب خان کے زوال تک“ کی بہت شہرت سنی تھی اور پھر انشاجی لندن سے یہ کتاب لائے تو اسے پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا ہے طے یہ ہوا ہے کہ میں ہوٹل کے لاونچ میں ان کا انتظار کروں۔ ان کے سر پر قرابلی کی ٹوپی ہوگی۔ ہاتھ میں تھیلا۔ دو صاحبان ہوٹل میں داخل ہوئے ہیں۔ ایک کے سر پر ٹوپی تو ہے مگر ہاتھ میں تھیلا نہیں ہے۔ مجھے حاکم گزرتا ہے۔ میں پھر

اطمینان سے بیٹھ جاتا ہوں، وہ استقبالیہ پر پوچھتے ہیں۔ استقبالیہ پر کمرائی دیوئی 362 نمبر پر ملتی ہوئی چابی دیکھ کر کہہ دیتی ہے کہ وہ نہیں ہیں لیکن کاؤنٹر پر جو صاحب کھڑے ہیں وہ سن لیتے ہیں، وہ فوراً میری طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ وہ ادھر بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بڑے تپاک سے ادھر آکر ملتے ہیں۔ ان کے ساتھ کھڑے خان ہیں یہ پشاور کے رہنے والے ہیں۔ تقسیم ملک انہیں دہلی لے آئی ہے۔ نیکنی باہر کھڑی ہے۔ جمنا داس اختر صاحب کے گھر جا رہے ہیں، روشن راستوں کے بعد ویران اندھیرا راستہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ کبھی دہلی ہے اور پھر ایک ایسے محلے میں جا پہنچتے ہیں جسے دیکھ کر مجھے پنجاب یاد آ جاتا ہے۔ گلی میں کچھ چار پائیاں، بچے کھیلنے ہوئے جمنا داس اختر صاحب کی لاہر بری کافی بڑی ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ سیاسیات پر تو انہوں نے یونہی کتابیں لکھ دی ہیں، ان کا اصل موضوع برصغیر کی قدیم تاریخ ہے۔ ان کے ہاں اس سلسلے میں بھی بڑی کتابیں موجود ہیں اور وہ کچھ کتابیں حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہیں جو پاکستان میں اس موضوع پر شائع ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر انجم ایف خان، ڈاکٹر حسن دانی، جیسے محققین کی تصنیفات پھر حکومت نے گندھارا تہذیب پر جو تحقیقی کتابیں غیر ملکی ماہرین سے لکھوائی ہیں۔ کھڑے خان انجمن اتحاد پختون کے سرپرست ہیں۔ وہ صوبہ سرحد کی سیاست کے اسرار و رموز سے خوب واقف ہیں۔ باجا خان، ولی خان، قیوم خان سب کے ماضی، قبائلی جھگڑوں اور خاندانی رقابتوں سے آشنا ہیں۔ وہ بتا رہے تھے کہ ہم پہلے تحریک پختونستان کی بہت امداد کرتے رہے ہیں، اس سلسلے میں سیمینار بھی منعقد کرتے رہے ہیں لیکن جب سے آپ کے ہاں منتخب حکومت قائم ہوئی ہے ہم نے پختونستان کا نام لینا چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ منتخب جمہوری حکومتیں لوگوں کے مسائل حل کر لیں گی۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر باجا خان اور بھٹو

پارلیمنٹ میں ایک بار پھر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ کل پھر شاید کچھ پاک و ہند تعلقات پر بات چیت ہو۔

☆.....☆

صبح سویرے اپنا تمام سامان میں نے پیک کر دیا ہے۔ سامان بڑھتا جا رہا ہے۔ اس میں کتابیں زیادہ ہیں واپسی میں کافی دقت ہوگی۔ آج مجھے یہ ہوٹل چھوڑنا ہے۔

آج اخبارات میں ”بلیک ڈمبر“ نامی تنظیم نے لندن میں بھارتی ہائی کمیشن پر حملے کی ذمہ داری قبول کی ہے اور دھمکی دی ہے کہ وہ ایسے اور بھی حملے کرے گی اور بھی تفصیلات شائع ہوتی ہیں۔ جملہ آوروں کے پستول بھی نقلی تھے مگر لندن پولیس نے خاصی تیزی دکھائی اور ایک نو جوان کی جان ہی لے لی۔ آج میں پھر کچھ دیر کے لیے پارلیمنٹ میں جا رہا ہوں۔ پارلیمنٹ میں آج زیادہ گرما گرمی ہے۔ کیونست پارٹی مارکسٹ کے باسو اسپیکر سے معرکہ آراء ہیں۔ اسپیکر ان سے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو سوال اٹھانے کی اجازت دی جائے گی۔ وہ اصرار کر رہے ہیں کہ انہی میرا سوال سنا جائے اور وزیر داخلہ ابھی جواب دیں کیونکہ یہ انتہائی اہم اور فوری نوعیت کا ہے۔ اسپیکر صاحب موقع دینے کے موڈ میں نہیں ہیں مگر شرعی باسو کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ اپوزیشن کے دوسرے ارکان بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ معاملہ بڑھ رہا ہے۔ اسپیکر کہتے ہیں۔ باسو صاحب! میں آپ کو ایوان سے باہر نکلنے کا حکم بھی دے سکتا ہوں۔ اس پر شرعی باسو اور پھر جاتے ہیں۔ ایک تو آپ سوال کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ دوسرے آپ باہر نکالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ یہ الفاظ آپ کو واپس لینے ہوں گے۔ اس پر اپوزیشن کے دوسرے ارکان بھی کھڑے ہو گئے۔ بے پناہ شور مچ رہا ہے ادھر حکمران پارٹی کے ارکان بھی بیچ بجا بجا کر کہہ رہے ہیں کہ انہیں باہر نکالا جائے۔ سار جٹ بھی اسپیکر کے حکم کا منظر ہے لیکن اپوزیشن اپنا دباؤ

صاحب کی ملاقات ہو جائے۔ دونوں مل کر کوئی لائحہ عمل بنائیں تو پاکستان کو بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔ یقیناً جلیسے باچا خان سرحد کو پاکستان سے الگ نہیں کرنا چاہتے جن دنوں باچا خان احمد آباد میں مسلم ہندو فسادات کے سلسلے میں ہندوستان آئے تھے۔ میں ان سے ملا تھا کچھ اور پٹھان لڑکے بھی ملے تھے جنہوں نے کہا تھا کہ وہ آزاد پختونستان کی حمایت کیوں نہیں کرتے۔ باچا خان نے کہا تھا کہ میں جانتا ہوں۔ افغانستان کے اپنے مسائل ہیں اور صوبہ سرحد کے پٹھانوں کا مستقبل خود ان سے ہی وابستہ ہے خیر کے اس بار افغانستان سے نہیں۔ باچا خان نے ان نوجوانوں کو سختی سے منع کر دیا تھا پھر دوبارہ ان لوگوں سے ملے بھی نہیں۔

کھیزے خان نہایت سنجیدگی اور خلوص سے کہہ رہے ہیں کہ ولی خان اور بھٹو صاحب کی آپس میں بن سکتی تھی اگر قیوم خان بیچ میں نہ ہوتا۔ جمناداس اختر صاحب کی بیگم جھنگ کی رہنے والی ہیں، انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ پٹیاہ سے جانکر جھنگ میں آباد ہوئے ہیں تو وہ جھنگ کے بارے میں پوچھنے لگتی ہیں اور ایک دم ٹھیکو جھنگو جی لہجے میں گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ میں بھی برسوں بعد جھنگو جی بولتا ہوں۔ وہ جھنگ کے بارے میں پوچھتی ہیں؟ کتنی ترقی ہوئی ہے۔ جھنگ اور مکھیانہ آپس میں مل گئے ہیں کہ نہیں۔ اسکول کتنے ہیں، کالج کتنے ہیں۔ اپنا شہر، اپنا ہی ہوتا ہے۔ جہاں لوگوں نے عمر گزار لی ہوں۔ وہ کیسے بھول سکتے ہیں۔

رات کا کھانا کناٹ سرگس میں ہوٹل ایکسی میں کھاتے ہیں، یہ شاید کھیزے صاحب اور اختر صاحب کا پسندیدہ ہوٹل ہے۔ یہاں دیکی کھانے کچھ اچھی قسم کے مل جاتے ہیں۔

اگلے روز مجھے شام کو بمبئی جانا ہے لیکن اس سے پہلے دوپہر کو اختر صاحب کے گھر کھانا ہے۔ دیوان بریندر ناتھ اور ان کی بیگم بھی مدعو ہیں۔ اس سے پہلے میں

ڈالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسپیکر الفاظ ابھرتے ہیں۔
لے کر اس طوفان کو مزید ہونے سے روک دیتے ہیں۔ ایوان میں پھر کچھ سکون پیدا ہوتا ہے۔ اب اپنے حق میں پانسہ دیکھ کر اپوزیشن کے ارکان میں سے مختلف لوگ اپنا سوال پہلے پیش کرنے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ چند لمحوں پہلے اپوزیشن کا آپس میں جو اتحاد تھا۔ وہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور پھر مختلف پارٹیوں کے مختلف ارکان اپنی اپنی بات منوانا چاہتے ہیں میں سوچتا ہوں کیا اپوزیشن کا اتحاد ہمیشہ عارضی ہی ہوتا ہے۔ چند لمحے ایک بات پر اتحاد ظاہر کیا، مسئلہ حل ہو گیا تو پھر منتشر ہو گئے۔

اس کے بعد کھانے کا وقفہ ہونے والا ہے۔ مجھے جننا داس اختر صاحب کے ہاں دعوت پر جانا ہے۔ اس لیے میں اٹھ آتا ہوں۔ جننا داس اختر صاحب خود راولپنڈی کے رہنے والے ہیں۔ آزادی سے قبل لاہور میں ”دیر بھارت“ سے منسلک رہے۔ بعد میں ”تیج“ کے نمائندے کی حیثیت سے لاہور، راولپنڈی میں مقیم رہے۔ مغویہ خواتین کی برآمد کے لیے بھی کافی کام کیا۔ اس سلسلے میں کئی کتابیں اور ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کے گھر خالص پنجابی ماحول تھا۔ کھانے بھی پنجابی تھے۔ سبزی، وال اور پنجابی قصبے، کہانیاں، جننا داس اختر نے مجھے اپنی کتابیں بھی پیش کیں۔

بہمنی کی سست

اب مجھے اپنے ہوٹل رش کرنا ہے کیونکہ 5 بجے کے جہاز سے بہمنی روانہ ہوتا ہے۔ صبح ایکسٹرنل پبلیٹی کے ڈائریکٹر سے متعلقہ اسٹنٹ سے پوچھ لیا تھا کہ ٹکٹ تو OK ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ بالکل اوکے ہے۔ اختر صاحب کے مکان سے اشوکا ہوٹل تک کافی طویل راستہ ہے۔ نئی دہلی میں اسکول کالج سے چھٹی کے وقت ساڑیوں، جینز اور بیل باٹم میں ملبوس بعض بڑی ماڈرن اور پوش قسم کی لڑکیاں زبردستی لفٹ مانگتی بھی دکھائی دیتی ہیں۔ میں جس گاڑی سے ہوٹل جا رہا ہوں اس سے ڈرائیور بڑے خوش پوش سر دار جی

ہیں۔ گاڑی بھی پوش قسم کی ہے۔ لڑکیوں کے لفٹ مانگنے کا انداز بھی خوب ہے۔ سڑک پر وہ تقریباً کمان کی طرح جھک جاتی ہیں۔ میں تو ایسا خاص خیال نہیں کرتا ہوں کیونکہ بہر حال میں سرکاری مہمان ہوں اس منصب کا احترام لازم ہے۔ سردار جی بعد میں ٹھیکہ پنجاب میں بتاتے ہیں۔ ”دیکھیا جی۔ کڑیاں کیہ کرویاں ہیں۔ کس انگ نال لفٹ منگدیاں ہیں۔“ سردار جی نے بتایا کہ بعض اوقات وہ خالی جا رہے ہوں تو ان لڑکیوں کو ان کے گھر تک پہنچا بھی آتے ہیں۔ کچھ لڑکیاں ان میں دوسرے قماش کی بھی ہوتی ہیں۔ وہ اپنا قصہ سنانے لگے کہ ایک بار دو لڑکیوں کو میں نے بٹھالیا۔ میں نے پوچھا کہ کدھر چھوڑ دوں۔ کہنے لگیں جہاں تمہاری مرضی۔ اب میں بہت صبرایا۔ میں نے سوچا کہ صدر لے جا کر چھوڑ دیتا ہوں۔ اس طرف لے گیا۔ کپڑے کی ایک دکان کے سامنے انہوں نے گاڑی رکوائی۔ ایک اندر اتر کر گئیں۔ پھر واپس آئیں اور مجھے کہنے لگیں۔ 200 روپے دو۔ میں نے کہا کس لیے۔ میرے پاس تو نہیں ہیں، کہنے لگیں ہم پھر ابھی شور مچاتی ہیں کہ یہ ہمیں اغوا کر کے لایا ہے۔ اب میں براپریشان ہوا۔ میں نے کہا اچھا میں یہ گاڑی یہاں چھوڑ کر جاتا ہوں۔ اپنے دفتر سے لے کر آتا ہوں گاڑی میں نے کھلی چھوڑی۔ چابی لے کر وہاں سے چلا آیا۔ کوئی دو تین گھنٹے بعد گیا تو وہ جا چکی تھیں۔ دیکھ میں سرا ان میں ایسی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ زمانہ بہت بگڑ گیا ہے جی۔“

ہوٹل سے سامان اٹھا کر ایئر پورٹ پہنچتے ہیں۔ ٹکٹ کاؤنٹر پر دیتے ہیں تو کھلتا ہے کہ سیٹ اوکے نہیں ہے بلکہ چانس پر ہے۔ میرے ساتھ جو آفیسر آئے ہیں۔ وہ ٹکٹ غور سے دیکھتے ہیں۔ بہمنی سے واپسی دو روز بعد اوکے ہے۔ جانا اوکے نہیں لیکن بہمنی سے واپس آنا پکا ہے۔ یہ آفیسر انڈین ایئر لائنز والوں سے کچھ بات چیت کر کے سیٹ حاصل کر لیتے ہیں۔ آج مجھے پہلی بار انڈین ایئر لائن سے سفر کرنا ہے۔

سیاہی سود ہے نازی کیوں کی جارہی ہے۔ کڑن چندر سے کہوں گا۔ تمہیں مزدوروں کسانوں کا غم بہت ستاتا رہا ہے۔ ان میں مزدوروں کسانوں کے ہزاروں بیٹے ہیں۔ جو اپنے وطن کی سرزمین کی حفاظت کر رہے تھے۔ اب ان کے ساتھ تمہارا ملک جانوروں سے زیادہ بدسلوکی کر رہا ہے۔ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تمہاری انسانیت نوازی کے دعوے کیا ہوئے۔

ایئر ہوسنس نے ہندی اور انگریزی میں اعلان کر دیا ہے۔ بمبئی آرہا ہے۔ ایئر پورٹ پر روشنیاں اجنبی روشنیاں۔ جو میرے لیے بالکل خاموش ہیں۔ میں ان کی زبان نہیں سمجھتا۔ جہاز کے پاس ہی سوٹ میں ملبوس ایک بھارتی افسر آگے بڑھتے ہیں۔ انگریزی میں پوچھتے ہیں آپ محمود شام ہیں۔

”میں نہیں ہوں۔ مبارک اشرا گورنمنٹ کا انفارمیشن ڈائریکٹر، بمبئی میں قیام کے دوران میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ ان کے ایک اسٹنٹ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ ٹیلی فون پر انہیں اطلاع پہنچ گئی ہے اور میرا حلیہ بھی بتا دیا گیا ہے۔ میں سامان ساتھ لے کر نہیں گیا ہوں صرف ایک دستی بیگ ہے۔ وہ مجھے وی آئی پی روم میں لے جانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ میں اپنی اوقات جانتا ہوں اس لیے میں انہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس سامان تو ہے نہیں انتظار کا ہے۔ کا۔ چلیے۔ ہوٹل چلتے ہیں۔ عام طور پر سرکاری مہمانوں کو تاج محل انٹرکانیٹینل میں ٹھہرایا جاتا ہے جو انڈیا گیٹ کے بالکل سامنے ہے لیکن اس سے بھی برا ہوٹل حال ہی میں بنا ہے اور برائے شیرٹن۔ مجھے وہاں ٹھہرایا گیا ہے یہ زیریماں پوائنٹ پر ہے۔ بمبئی کے شاننا کروڑ ایئر پورٹ سے اب موٹر کار کا سفر شروع ہوتا ہے جو دہلی سے بمبئی تک کے سفر سے کم نہیں ہے۔ گلیاں، سڑکیں، موڑ، چوک، چوراہے، روشنیاں قدم قدم پر کراچی یا آٹا سے۔ دونوں طرف

دشمن ملک کی ایئر لائن۔ جس سے ہماری قومی ایئر لائن پی آئی اے کا بین الاقوامی راستوں پر مقابلہ رہتا ہے۔ دہلی ایئر پورٹ، کراچی کی نسبت بہت پرانا اور بڑا بھی لیکن اس میں بین الاقوامی ایئر پورٹوں والی کوئی خاص عظمت نہیں ہے۔ یہ انڈین ایئر لائن کا بونگ 737 ہے۔ سیٹ کوئی مخصوص نہیں ہے جس وقت آجائے جو سیٹ خالی ملے، اس پر بیٹھ جائے۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ اس بونگ میں بھی فرسٹ کلاس نہیں ہے۔ ایک ہی کلاس ہے۔ ہمارے ہاں بعض طیاروں میں اب بھی کلاس سسٹم ہے۔ کچھ میں ختم بھی کر دیا گیا ہے۔ ایئر ہوسنس پر عہد ساز یوں میں ملبوس ہیں، دو رنگ کی ساڑیاں ہیں، اپنی ایئر ہوسنس ان سے پھر بھی غنیمت ہوتی ہیں۔ یہ چائے کا وقت ہے۔ پی آئی اے میں اس وقت چائے، کیک پیس اور پیس ملتا ہے یہاں صرف چائے اور وہسکٹ مل رہے ہیں۔ اس وقت پی آئی اے کی قدر محسوس ہو رہی ہے فاصلہ اتنا ہی جتنا کراچی، لاہور، کراچی پنڈی براہ راست پرواز کا ہے مگر بوریت زیادہ ہے۔ میں ایک اجنبی مسافر ہوں، تنہا۔ ہندوستانی ہیں، کچھ غیر ملکی ہیں مگر میں واحد پاکستانی ہوں۔ کوئی جانتا بھی نہیں کہ میں پاکستانی ہوں۔ ابھی مجھے مزید اجنبی لوگوں میں پہنچنا ہے۔ بمبئی جہاں سترہ لاکھ اجنبی ہوں گے۔ میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ صرف کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔ کسی اور زمانے میں آتا تو شاید بمبئی مجھے متاثر بھی کرتا، حسین بھی لگتا یہ تو ماحول ہی مختلف ہے۔ یہ جہاز جن علاقوں پر سے پرواز کر رہا ہے، وہاں نہ جانے کتنے کیمپ ہیں جن میں میرے 90 ہزار بھائی جنگی قیدیوں کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ میں ان کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔ سوائے لوگوں سے مذاکرات اور بحث مباحثہ کے۔ بمبئی جا رہا ہوں۔ میں خواجہ احمد عباس کے ضمیر کو آواز دوں گا۔ بلراج سہنی بہت انسان دوست ہے۔ اس سے کہوں گا کہ اس بیسویں صدی میں گوشت پوسٹ ہے انسانوں پر

فلیٹ پر اٹھائے کھڑے ہیں۔ جیسے اپنی باہنوں میں جکڑنا چاہتے ہوں۔ دونوں کٹرف کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ فلیٹ، روشنیاں، بار بار ٹریفک جام ہوتا ہے کہیں ٹریفک انجوں کے حساب سے سرکتا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں، اس لیے بات چیت کا سلسلہ زیادہ نہیں چلتا۔ وہ سبے چارے دونوں بڑے تکلف بلکہ پروٹوکول سے کام لے رہے ہیں۔ ڈیلی گیٹ سے پوچھتے ہیں۔ سفر کیسا رہا۔ تھک گئے ہوں گے۔ آرام کرنا چاہیں گے۔ آپ کے لیے او برائے میں انتظام کیا گیا ہے۔ بالکل نیا ہوٹل ہے۔ سمندر کے عین اوپر۔ امید ہے آپ کا قیام اچھا رہے گا۔ پھر مجھے ایک ٹامپ شدہ پروگرام پیش کرتے ہیں۔ آپ نے جن حضرات سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اس کے مطابق یہ پروگرام ہے۔ دلیپ گمار نہیں مل سکیں گے۔ وہ آج شام کو دہلی جا رہے ہیں۔ سنبھل میں مشاعرہ ہے۔ کمال امر و ہوی صاحب نے رکھا ہے۔ دلیپ وہاں مہمان خصوصی ہیں خواجہ احمد عباس سے کل کا وقت مقرر ہے باقی آپ جیسے چاہیں گے۔ پروگرام بن جائے گا۔

میں گھڑی دیکھ رہا ہوں۔ ایئر پورٹ سے چلے 35 منٹ سے اوپر ہو چکے ہیں۔ نئی دہلی میں ویرانی کا جو احساس ہوتا تھا۔ یہاں بالکل نہیں ہو رہا ہے۔ ٹریفک کا سمندر ہے۔ دہلی میں اسکوٹریں، موٹر سائیکلیں تیزی سے دوڑاتے جوڑے بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یہاں بہت سے اسکوٹروں پر نوجوان جوڑے سمندر کی ہوا سے کھیلتے گاڑیوں کے درمیان سے موڑ کاٹتے گزر رہے ہیں۔ فٹ پاتھ کیا ہے۔ ساحل سمجھ لیں۔ سڑک سے پرے ریت ہے۔ سمندر کی ہوا کا احساس حاصل کرنے کے لیے لوگ گرم فلیٹوں سے باہر نکل آئے ہیں۔ ایک ہجوم ہے۔ زعمی ہے۔ بمبئی کی میونسپل کارپوریشن کے انتخابات بھی نزدیک ہیں، اس لیے جگہ جگہ سڑکوں گلیوں پر بیئر لگے ہوئے ہیں۔ مسلم لیگ کے امیدوار بھی خاصی تعداد

میں ہیں اور بیئروں سے لاشعوری طور پر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ بمبئی میں مسلمان کافی تعداد میں ہیں اور دہلی کی نسبت کچھ نمایاں بھی ہیں۔ میں مسٹر مینی سے پوچھ رہا ہوں، یہاں مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ وہ بتا رہے ہیں کہ یہاں مسلمان تاجر بھی ہیں۔ فرنیچر اور جیولری پر زیادہ تر مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ سمندر سے متعلق کاروبار میں بھی زیادہ ہیں۔ ملاجی سے لے کر لانچوں کی ملکیت تک۔ راستے میں کئی بازاروں میں مجھے بڑے بڑے شوروم والی دکانوں پر احمد فرنیچرز، حاجی عبداللہ فرنیچر امپوریم وغیرہ کے بورڈ نظر آ رہے ہیں۔ بمبئی میں سڑکوں کے اوپر چلنے والی سڑکیں بھی ہیں، جگہ جگہ ہو تو پھر ٹریفک کنٹرول کرنے کا یہی طریقہ رہ جاتا ہے۔ مسٹر مینی کہہ رہے ہیں ہوٹل نزدیک آ گیا ہے۔ سیدھے ہاتھ سمندر ہے، اٹنے ہاتھ فلیٹ۔ پھر کچھ نامکمل فلک بوس عمارتیں، سمندر کے عین کنارے پر جھکنا اور برائے شیرٹن۔ اس کے دو طرفہ سمندر ہے۔ دروازے پر چوہدار کی وردی میں سردار جی ہمارا استقبال کر رہے ہیں۔ چوہدار کا کام زیادہ تر سرداروں کے سپرد ہے۔ ہوٹل کی وسعتیں، سبے پناہ، نیا نیا ہوٹل ہے۔ زیبائش و آرائش ابھی تازہ ترین ہے۔ نامکمل بھی۔ استقبالیہ پر فیروزی رنگ کی رسمی ساڑیاں پہنے ملک لگائے لڑکیاں کھڑی ہیں۔ فیروزی ساڑی شاید ان کی یونیفارم ہے کمرے کی پہلے سے بنگ موجود ہے لیکن کارڈ پر کرتے وقت سوال پیدا ہو چلا ہے۔ ادائیگی کون کرے گا۔ مسٹر مینی کہہ رہے ہیں کہ بھارت سرکار کرے گی۔ خاتون کہہ رہی ہیں۔ ہمارے پاس سرکاری خط نہیں آیا ہم کیسے کہیں۔ اسٹنٹ مینیجر صاحب جو شاید پاری ہیں۔ وہ ہوٹل کے وسیع لاؤنج میں دکان سجائے بیٹھے ہیں، انہیں بلایا جاتا ہے، وہ بھی کہتے ہیں خط نہیں ہے، اس لیے ہم کمرہ نہیں دے سکتے۔ مینی صاحب شریف آدی ہیں، دھیمے دھیمے کچھ بھی کہہ رہے ہیں خط تو بھیج دیا ہے۔ ہمیں معلوم

جائے مجھے ایک سکون کا احساس ہو رہا ہے۔ میں اپنی ذات میں سمٹا ہوا ہوں۔ اپنے شہروں میں، اپنے لوگوں میں گھومتے ہوئے کتنا بکھرنا پڑتا ہے۔ جاننے والے بے شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے قدم قدم پر ذات کا حصار ٹوٹ جاتا ہے۔ اپنے اندر سمٹنے کا بھی اپنا ایک نشہ ہے۔ میں اسی نشے میں محو ہوں۔ یہ کوئی ہاؤس ہے، بمبئی کے خوش پوش نو عمر نوجوان جمع ہیں۔ بینڈ ٹروپ مصروف ہیں۔ ادھر مغل روم ہے۔ تمام ہندوستانی کھانے مغلوں کے نام پر کھلائے جاتے ہیں۔ ہندوستان والے مغلوں کو خوب بدنام کر رہے ہیں۔ جعلی بارہ دریاں، دیوان، پارسی، میمن، سیتھ، بزنس مین۔ ڈنر میں مصروف ہیں۔ سیٹ پہلے سے محفوظ کروانا پڑتی ہے اس لیے مجھے کمرے میں ہی کھانا منگوانا پڑے گا۔ ہوٹل میں بہت سے جے ابھی زیر تعمیر ہیں۔

کمرے میں واپس آکر میں پاکستان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ریڈیو پاکستان تلاش کرتا ہوں۔ خبریں سننا ہیں، یہاں جانے کون سا اسٹیشن ہے۔ یہاں بھی لاہور ہی ملا ہے۔ بہت صاف اور واضح۔ دہلی میں بھی لاہور اسٹیشن اور بمبئی میں بھی لاہور اسٹیشن سے ہی رابطہ قائم ہوتا ہے۔ پاکستان قائم ہے۔ ہر طرف امن و امان ہے۔ میں اب آرام سے سو سکتا ہوں۔

خواجه احمد عباس اور بلراج سہنی کے ساتھ چند لمحے

بمبئی کی صبح کراچی کی صبح سے مختلف نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہی لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ زیر تعمیر عمارتوں پر کرینیں سر اٹھانے لگ گئیں۔ سمندر میں کشتیاں دوڑنے لگیں۔ شہر تو رات بھر ایسے ہی جاگتا رہا تھا۔ میں ہی سو گیا تھا۔ شہر صدیاں جاگتے رہتے ہیں۔ ہم ہی سو جاتے ہیں۔ گیارہ بجے شری خواجہ احمد عباس صاحب کی طرف جاتا ہے۔ وہ جو ہو میں رہتے ہیں۔ اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا ایئر پورٹ سے اُدھر آتے ہوئے تھا کہ شری خنجر کا فون آیا ہے کہ بلراج سہنی

ہے۔ وہ شرمندہ بھی ہیں کہ ایک غیر ملکی مہمان کے سامنے یہ عجیب صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ پھر طے ہوتا ہے کہ ہم لاؤنج میں آرام کرتے ہیں، اتنے میں فون وغیرہ کر کے مسئلہ طے کرتے ہیں، لاؤنج بہت خوب صورت ہے۔ سامنے بیسیوں فٹ بلند شیشے لگے ہیں اور آگے سمندر کی لہریں ہیں۔ رات قریب ہے، سمندر اور زیادہ لہریں مار رہا ہے اسٹنٹ منیجر صاحب تھوڑی دیر بعد آئے۔ ”سرا خط آ گیا ہے۔ اب وہ اپنی خفت چھپانے کے لیے کہہ رہے ہیں خط ابھی آیا ہے۔“ خیر مجھے گمرہ نمبر 1639 ملا ہے۔ ساتھ ایک اسٹیورڈ صاحب ہیں، وہ کمرے تک لے جائیں گے۔ ہوٹل میں رکھ رکھاؤ کچھ ضرورت سے زیادہ ہے۔ سلیقہ کم ہے۔ اسٹیورڈ صاحب مجھے اس کمرے کی خوبیاں گنوا رہے ہیں۔ یہ بینڈ ہے، یہ فون ہے یہ غسل خانہ ہے یہ گرم پانی ہے یہ ٹھنڈا پانی ہے۔ یہ ایریز کنڈیشنرز ہے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بڑے شہروں میں دیہاتی میزیں رکھ دیں تو فیشن بن جاتا ہے۔ یہاں صوفوں کی جگہ پیڑھیاں رکھنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ صوفوں کے ساتھ کچھ ایسا سلوک بھی کیا گیا ہے۔ غسل خانے میں بھی ٹیلی فون لگا رکھا ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف بینڈ کے ساتھ ٹیبل لیپ نہیں ہے۔ آپ کو فون کرنا ہے تو ڈائریکٹری کا مطالعہ سامنے سنگھار میز پر جا کر کیجیے۔ پھر فون کے لیے بینڈ پر آئیے۔ نیا نیا ہوٹل بنا ہے۔ میں شاید اس کمرے کی تاریخ میں پہلا مہمان ہوں۔ آج کوئی پروگرام نہیں ہے۔ میں اس ہوٹل کا جائزہ لے رہا ہوں۔ ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے ہوٹل ہیں مگر اتنے بڑے نہیں۔ اس کے لاؤنج میں فراخی کا جو احساس ہوتا ہے وہ کہیں نہیں ہوتا۔ سامنے سمندر اس کی دستکوں میں اور اضافہ کر رہا ہے۔ میں اس کے مختلف ریستورانوں میں یونہی گھوم رہا ہوں۔ مجھے یہاں بڑا اطمینان محسوس ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے، ابھی چہروں سے پہچانائی کی

سے ان کی بات اور سچی ہے۔ وہ بھی وہیں خواجہ احمد عباس کے پاس آجائیں گے۔ چلیے یہ بھی اچھا ہے ایک بار پھر فلیٹ مجھے اپنی ہانہوں میں اٹھائے آگے آگے لے جا رہے ہیں۔ فٹ پاتھ، کراچی کی طرح صبح کی ہلکی ہلکی ہوا، دیواروں کے اندر چھوٹے چھوٹے ڈربوں میں بجی پانوں کی دکانیں، جہاں زیادہ تر مسلمان بیٹھے ہیں۔ گاڑیاں یہاں دہلی سے زیادہ ہیں مگر ہیں وہی ایمبڈر یا فیٹ، جو ہوسا علی علاقہ ہے۔ بحیرہ عرب ساتھ ہی بہتا ہے، یہاں کھجور کے درخت عرب کی یاد دلاتے ہیں۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ کسی عرب علاقے میں گھوم رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کا دفتر چوتھی منزل پر ہے۔ کتابیں، پوسٹر، فرش پر چاندنی بچھا کر بیٹھے ہیں۔ خواجہ صاحب پاکستان چند برس پہلے آئے تھے۔ وہ ترقی پسند افسانے ناول لکھنے کے ساتھ ترقی پسند فلموں کے خالق بھی ہیں۔ کئی فلموں کی ہدایت کاری بھی کر چکے ہیں۔ پاکستان، ہندوستان کے مسئلوں پر بات ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علی سردار جعفری اور کچھ دوسرے دانشور پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی کے لیے دھڑکی مہم چلا رہے ہیں، مجھے یہ دہلی میں بھی معلوم ہوا تھا مگر تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔ خواجہ صاحب ان لوگوں میں سے ہیں، جو تقسیم ہند کے مخالف تھے مگر اب وہ دونوں ملکوں کی سالمیت کے قائل ہیں ان کے بہت سے رشتے دار پاکستان میں بھی ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ تمام تر ترقی پسندوں اور انسان دوستی کے باوجود خواجہ صاحب یا کسی بھی اور ہندوستانی ادیب نے پاکستانی جنگی قیدیوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ میں اس سلسلے میں سب سے بات کرتا ہوں مگر وجہ وہی سیاسی مصلحتیں نظر آتی ہیں۔ البتہ مشرقی پاکستان سے فوجی کارروائی کے دوران ہندوستان آنے والے پناہ گزینوں پر ان قلم کاروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ پاکستان کے معاملے میں زیادہ تر پرانے ادیبوں، شاعروں کا وہی رویہ ہے جو

جا رہے ہیں پرانے ادیبوں اور شاعروں کا ہندوستان کے معاملے میں ہے۔ خواجہ صاحب پاکستان کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ بلوچستان سرحد کے معاملات۔ میں ان سے فلموں کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ وہ میرے پوچھنے پر بتاتے ہیں کہ گانوں کے بغیر فلمیں بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اتنا فرق ہو گیا ہے کہ اب ہندوستان میں کافی فلمیں کسی مقصد کے لیے بنتی ہیں صرف پیسے کمانے کے لیے نہیں۔ وہ ستیہ جیت رائے کو خراج پیش کر رہے ہیں۔ یہ روایت اگرچہ آگے تو نہیں بڑھی لیکن اکثر فلسفہ ساز کوشش کرتے ہیں کہ وہ زیادہ تر آڈٹ ڈور شوٹنگ کریں۔ خواجہ صاحب اب تک دھرتی کے لال (1946)، انہولی (1951)، راہی (1952)، منا (1954)، پردہ کی (1957) چاروں چار راتیں (1959) شہزادہ پنا (1964) ہمارا گھر (1965) آسمان محل (1966) بمبئی کی ہانہوں میں (1968) سات ہندوستانی (1970) بنا چکے ہیں۔ ان کی تازہ ترین فلم دو بوند پانی۔ جو مختلف زبانوں میں ڈب ہو کر باہر بھی پیش کی جا چکی ہے۔ خواجہ صاحب کی فلموں کا موضوع ہندوستان ہے۔ تقسیم ہند، ہندوستان، مسئلوں میں پھنسا ہوا ہندوستان۔ پانی، خشک سالی، بھوک، بچوں کے اغواء، بین الصوبائی سیکنجی کے موضوعات پر انہوں نے اثر انگیز کہانیاں بھی لکھی ہیں اور پھر انہیں فلم میں بھی کامیابی سے ڈھالا ہے۔ مجھے اگرچہ ان کی فلموں کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت ان کی کوئی فلم کہیں لگی ہوئی نہیں ہے۔ البتہ سنا بہت لوگوں سے ان کے پمفلٹ وغیرہ دیکھے۔ انہوں نے سات ہندوستانی فلم کی کہانی پر مبنی ناول بھی دیا۔ یہ ناول مختلف مذہب رکھنے، مختلف زبانیں بولنے والے ہندوستانیوں کی سیکنجی کے بارے میں ہے گواہ ہندوستان کا قبضہ اس کا محور ہے جس سے سارے ہندوستانیوں میں سیکنجی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب ظاہر ہے کہ ہندوستان کے شہری ہیں اس لیے

کو اپر ہندوستان کی خارجیت کو وہ پر نکال کے مقابلے میں جنگ آزادی قرار دیتے ہیں، میں اس کے ساتھ ساتھ یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں کتنے فلمساز، کتنے کہانی لکھنے والے، اپنے وطن کے جائز موقف اور اپنے وطن کے مسائل پر فلمیں بناتے ہیں۔ ہندوستانی فلم بین رومانی فلمیں بھی دیکھتے ہیں لیکن اب انہیں ایسی موضوعاتی فلمیں دیکھنے کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ یہ فلمیں بھی کئی کئی سینما گھروں میں لگتی ہیں اور ان پر بھی بڑا رش پڑتا ہے۔

بلراج سہنی بھی آگئے ہیں۔ میں انہیں مدت بعد مل رہا ہوں۔ سر پر برف پوری طرح گر چکی ہے مگر چہرے پر وہی تازگی ہے۔ اسمارٹ، سادہ، ہنستا مسکراتا بلراج سہنی ہم لوگ کا بلراج سہنی..... اسے جھنگ یاد آ گیا ہے۔ شارب انصاری کا کیا حال ہے شیر افضل جعفری کیسے ہیں۔ جھنگ کیسا ہے۔ خواجہ صاحب! میں جھنگ گیا تو یہ لوگ یہ اجنبی لوگ میرے لیے ایسے دوڑے بھاگے پھرتے تھے جیسے مجھے صدیوں سے جانتے ہوں۔ ان کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ مجھے ہر روز کئی کئی ناشتے کرنے پڑتے تھے۔ بلراج سہنی کہہ رہے ہیں۔ چل بھی خواجہ صاحب نال تیری اردو ملک لکھی آئے تھے چلیے، گھر بہہ کے کچھ پنجابی مارنے آں۔

چلیے ان کا گھر نزدیک ہی ہے۔ کھجوروں کے ایک چھنڈ کے قریب یہ سادہ سا بنگلہ، بہت پیارا لگ رہا ہے۔ ڈرائنگ روم جسے بیٹھک کہنا چاہیے۔ بیڑھیاں، پنجاب کی یاد دلانی ہیں اور جانے کیا کاٹھ کباڑ..... لیکن بڑے سلیقے سے رکھا ہوا ہے۔ آخر پنجابی ہے نا۔ وہ اپنی بیگم سے ملوار ہے ہیں۔ مسز توش سہنی۔ وہ ان سے بھی زیادہ پنجابی ہیں۔ لاہور کی یادوں میں گرفتار۔ یہ ان کی دوسری بیوی ہیں پہلی 26 برس کی عمر میں چل بسیں۔ ان سے بلراج سہنی کی بیٹی شبنم بھی 26 سال کی عمر میں پچھلے دنوں فوت ہو گئیں۔ اتنے بڑے صدمے۔ لگتا نہیں ہے کہ بلراج

نے بروایت کیے ہوں۔ ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر ہمیشہ رہتی ہے۔ مسز سہنی نے لاہور کی باتیں چھیڑ دی ہیں۔ میرے ساتھ مہاراشٹر گورنمنٹ کے افسر بڑے حیران ہیں کہ یہ پنجابی عجیب لوگ ہیں۔ جب ہزارہ ہوا تو پنجابیوں نے ہی سب سے زیادہ ایک دوسرے کو مارا۔ ادھر کے پنجاب میں چلے جاؤ مشکل سے ہی کوئی مسلمان ملتا ہے۔ ادھر کے پنجاب میں مشکل سے کوئی ہندو یا سکھ ملتا ہے۔ پھر بھی یہ کیسے باتیں کر رہے ہیں مسز سہنی کو گورنمنٹ کالج لاہور کے درویش منٹس سابق پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد بہمنی میں زاہدہ پروین کی لگائی ہوئی کافی کا ریکارڈ دے گئے تھے۔ بتا رہی ہیں کہ ایک روز صبح انہوں نے ریکارڈ سنا تو جانے لاہور کی یادوں نے ایک دم جملہ کر دیا اور وہ ایک نظم لکھنے بیٹھ گئیں۔ میں ان سے یہ نظم سن رہا ہوں۔ پانچ پانچوں میں دھلے ہوئے لفظ۔ تین چار سطروں کے بعد مسز سہنی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ہیں۔ وہ خود ہی کہہ رہی ہیں کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اپنی مٹی کی خوشبو تو ہمیشہ ستانی رہتی ہے۔ نظم بھی جاری ہے آنسو بھی۔ بہمنی میں پنجاب جاگ اٹھا ہے۔ میں ساحر لدھیانوی سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتا ہوں۔ وہ ساتھ ہی رہتے ہیں۔ بلراج اسے بلانے چلے جاتے ہیں۔ ساحر کہیں جارہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے آ جاتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کا حال پوچھتے ہیں۔ فیض صاحب کیسے ہیں۔ قاسمی صاحب کا کیا حال ہے۔ میرے دوست قتیل شفائی کا کیا حال ہے۔ کبھی کبھی اس کے گیت ریڈیو سے سننے کو مل جاتے ہیں۔ یہاں کے فلمی حلقوں میں قتیل کے گیتوں کا اکثر چرچا رہتا ہے اور میوزک ڈائریکٹر بہت محبت سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ میں قتیل صاحب کے بارے میں بتاتا ہوں کہ وہ اپنی ایک اردو فلم بنا رہے ہیں۔ ان کی پشتو فلم مارکیٹ میں آچکی ہے۔ ابھی تک فلمی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ بلراج ضیا سرحدی کے بارے میں پوچھتے ہیں کسی فلمی

اخبار میں خبر شائع ہوئی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے بلراج کو بہت دکھ ہوا تھا۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ وہ بالکل خیریت سے ہیں کراچی میں فلم بنارہے ہیں بچے بھی فلموں ڈراموں میں کام کر رہے ہیں۔ ساحر معذرت کر رہے ہیں کہ مجھے ایک جگہ جلد پہنچنا ہے ورنہ میں رکتا اور پاکستان کے دوستوں کے بارے میں مزید پوچھتا۔ بلراج مجھے رات کے کھانے کی دعوت دے رہے ہیں اگر کوئی اور پروگرام نہ ہو تو یہاں کھانا کھائیں۔ خواجہ صاحب کو بلا لیں گے۔ کرشن چندر بھی آجائیں گے۔ ساحر بھی ہوں گے۔ السٹریٹ ویلکس کے ایڈیٹر خوشونت سنگھ کو بھی دیکھتے ہیں اگر وہ آسکیں۔

بہمنی کی دوپہر کافی گرم ہے۔ ہوٹل سن اینڈ سینڈز میں لنچ کے لیے جانا ہے۔ یہ ریسٹوران ٹیمن ساحل پر ہے۔ ساتھ ساحل کی ریت ہے سمندر میں نہاتے لوگ رنگ ہی رنگ بکھرے ہیں۔ سیاحوں کے لیے ایسے ساحلوں میں بڑی دلکشی ہوتی ہے۔ یہاں غیر ملکی بڑی تعداد میں نظر آ رہے ہیں۔ لنچ کے لیے میز پہلے سے بک کر انا پڑتی ہے ورنہ مشکل ہی ہے کہ جگہ ملے۔ گرمی اور زیادہ ہو گئی ہے۔ بلراج نے اپنے سیکریٹری سے محبوب اسٹوڈیو میں فون کروا دیا ہے کہ ایک پاکستانی مہمان اسٹوڈیو دیکھنا چاہیں گے۔ اسٹوڈیو پہنچتے تو معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کا وقفہ ہے اور اب چار بجے سے پہلے شوٹنگ شروع نہیں ہوگی۔ ابھی پورے دو گھنٹے باقی ہیں۔ کون انتظار کرے۔ ہمیں کیا خبر کہ بھارت کے فلم ساز وقت کے استنہ پابند ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ یہاں باقاعدہ اوقات کار ہیں۔ شام سارھے چھ بجے کے بعد اسٹوڈیو بند ہو جاتا ہے۔ رات کی شوٹنگ ضروری ہو تو اس کے لیے اتنا اشاف آ جاتا ہے۔ اتوار کو شوٹنگ بند رہتی ہے۔ ہمیں پاکستان کے اسٹوڈیوز کی عادت پڑی ہے۔ اس لیے اس وقت آ گئے ہیں۔ چھوڑ دیئے۔ شہر دیکھتے ہیں۔ ریوے اسٹیشن ہے۔ بک اسٹال سے

کچھ برساتا ہے خریدتے ہیں۔ تمام سینما گھروں میں ہاؤس فل کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ کہیں نئی فلمیں ہیں، کہیں پرانی۔ اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ دھوپ کڑا کے کی پڑ رہی ہے۔ بہمنی کی گرمی جس میں جس ہی جس ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے کسی ایئر کنڈیشنڈ سینما میں کچھ وقت گزر جائے۔ ریٹل، ریوالی، پیلس نام کے سینما ہر شہر میں ہوتے ہیں سو یہاں بھی ہیں لیکن آج ہفتہ ہے۔ اس لیے سب ہاؤس فل ہیں۔ بالآخر طے ہوتا ہے کہ اپنے ہوٹل چلتے ہیں آرام کر کے شام کو کھانے کے لیے بلراج سہنی کی طرف چلیں گے۔

بلراج کے ہاں رات کو پھر پنجاب جاگ رہا ہے۔ بلراج اپنی بیٹی کا تعارف کراتے ہیں۔ اس کا نام صنوبر ہے۔ بلراج کا بیٹا بھی اداکار ہے مگر وہ ادھر نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ احمد عباس بھی آ جاتے ہیں، کرشن چندر بھی۔ کرشن چندر کی بیگم کسی اور تقریب میں گئی ہیں۔ اس لیے ساتھ نہیں آتی ہیں اب باتیں پاکستان اور بھارت پر بھی چل پڑتی ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ پاکستان کے لوگ کیا چاہتے ہیں۔ میں بتاتا ہوں پاکستان کے لوگ تو ہمیشہ سے امن چاہتے رہے ہیں۔ عوام کا تو کبھی کوئی قصور نہیں تھا۔ ہماری بد قسمتی صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں جمہوریت نصیب نہیں ہوئی۔ غیر نمائندہ فوجی حکومتیں چلتی رہیں آپ کو ہمیشہ جمہوریت ملی رہی لیکن آپ نے ہمیشہ ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔ اس پر باقی لوگ تو چیپ رہتے ہیں۔ کرشن چندر کچھ چمکتے ہیں اور کہتے ہیں کیا مطلب۔ میں مختلف واقعات گنواتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ یہ بنگلہ دیش تو وہاں کے لوگوں کی اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں اور پاکستان کے عوام اسے بھارت اور روس کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ کہتے ہیں۔ کرشن چندر کہتے ہیں۔ ”مجھے تو اب بھی لگتا ہے کہ چین آپ کو ہم سے لڑوائے گا۔“ میں کہتا ہوں۔ کرشن صاحب میں ادب میں آپ سے بہت جوئیر ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ لڑنے کے لیے ہمیں چین کی

اس کا جواب ان کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نے ایک دستخطی مہم چلائی تھی اور اس پر کافی اویسوں اور دانشوروں کے دستخط لے لیے تھے۔ سردار علی جعفری اس کے لیے پیش پیش تھے لیکن اندراجی نے کہا کہ یہ پریس میں نہ دی جائے کیونکہ اس سے ہمارے موقف پر زد پڑے گی۔ میں کہتا ہوں کہ کرشن جی! انسانوں کے درمیان جب یہ سیاسی مصلحتیں آتی ہیں تو آفاقی ادب دم توڑ دیتا ہے۔ بلراج کہہ رہے ہیں کہ میں شوٹنگ کے لیے آگے گیا۔ شوٹنگ کے مقام سے تھوڑی دیر بعد ایک کمپ تھا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں اس کے پاس سے گزرا، کیسا کیسا پنجابی جوان خاردار تاروں کے پیچھے تھا۔ مجھے بڑا دکھ محسوس ہوا میں کیا کر سکتا تھا۔ کرشن جی۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ صرف کرشن چندر کا لہجہ جارحانہ ہے۔ خواجہ صاحب بھی، بلراج بھی محبت سے بات کر رہے ہیں۔ خواجہ صاحب تو بتا رہے ہیں کہ حال ہی میں ایک تقریب ہوئی۔ اس میں مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ایک گلوکارہ نے وادو غزلیں گائیں گا میں اس میں ایک قہقہہ شفا کی تھی۔ جو اس گلوکارہ نے شاید ریڈیو پاکستان سے سن کر تیار کی تھی میں نے اس پر ہلنر میں لکھا تھا۔ انہی باتوں کے درمیان کھانا ہو رہا ہے۔ مسز سہنی اور صنوبر سہنی مجھے پنجابی چیزیں کھلانے پر مصر ہیں۔ سب چہروں پر ایک تعطل کی سی کیفیت ہے۔ ہم صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں پہچانتے ہیں۔ اپنے مسائل بھی جانتے ہیں۔ انہیں طے کرنے کی بجائے قوت کے مظاہروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، بلراج سہنی جن زبانوں میں لکھتے ہیں ان میں، میں بھی لکھتا ہوں۔ ایک دوسرے کی زبان بھی سمجھتے ہیں لیکن مسئلوں کی دیواروں کو گراتے نہیں ہیں۔

اس دلچسپ سفر نامے کی سنسنی خیز روداد

شہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم کہیں گے کہ لڑنا ضروری ہے تو ضرور لڑیں گے۔ ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ روس آپ کو ہم سے لڑواتا ہے لیکن نہیں کہتے کیونکہ ہندوستان خود ہم سے لڑتا ہے۔ بعد میں مدد کرنے والے بہت سے ہو سکتے ہیں، کرشن صاحب مصر ہیں کہ نہیں چین آپ کو ہم سے پھر لڑوائے گا۔ مسز سہنی کہہ رہی ہیں۔ کرشن جی آپ کو کیا ہو گیا ہے ہمیں تو ایسی باتیں کرنی ہیں کہ یہ لڑائی جھگڑا ختم ہو۔ ہمارے آپس کے مسئلے ہیں۔ انہیں طے کرنا ہے۔ میں خواجہ صاحب اور کرشن صاحب سے کہتا ہوں کہ آپ کے ہاں کچھ بھی تصور ہو۔ ہمارے چین سے ایسے تعلقات نہیں ہیں جیسے آپ کے روس سے ہیں۔ یہ اصولوں کی دوستی ہے۔ چین نے بھی ہمارے معاملات میں مداخلت نہیں کی ہے مجھے معلوم ہے کہ روس مختلف اداروں کے ذریعے ہندوستان میں بھی پیسے بانٹتا ہے۔ پاکستان میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ مزدوروں کی انجمنوں میں، ادیبوں میں، صحافیوں میں۔ اس کے ثبوت بھی ملے ہیں لیکن چین نے کبھی یہ رویہ اختیار نہیں کیا ہے۔ آپ کے اور ہمارے درمیان مسائل موجود ہیں جن پر کسی وقت بھی لڑائی ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے۔ اس وقت بھی ہوئی تھی جب چین آپ کا دوست تھا۔ مسئلے جب تک نہ طے ہوں تو کیسے امن ہو سکتا ہے۔

میں ان سے کہتا ہوں کہ سیاست دان تو چلیے اپنی مصلحتوں کے تحت لڑتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو لڑواتے بھی ہیں۔ ہم ادیب کیا کرتے ہیں۔ ہم تو انسانیت کے دکھ کو ان سرحدوں کے حوالے سے نہیں جانتے۔ نوے ہزار انسان آپ کی قید میں ہیں۔ ریڈ کر اس نے لکھا ہے کہ پنجرے کا لفظ اتنے بھرپور معنوں میں آج تک ہی شاید کہیں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ میرٹھ کے کمپ کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے۔ آپ میں کسی نے ان کے لیے کچھ کیا؟ تمام بین الاقوامی اصول بھی پس پشت ڈال دیے گئے ہیں۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

پراسرار اور شہر کا آئینہ ہولناک رات بیانیاں: آئینہ کا آئینا
جس کے گھر ملا، اسے اس پاس کسی بھی صورت میں موجود ہیں

وہ میرا دلہا ہے

فرح انیس

خوشیاں اچانک ماتم میں بدل گئیں اور پھر وہ پانچوں بھائیوں دلہاسیت کی اور دنیا میں پہنچ گئے

”نہیں چند ایسی کوئی بات نہیں۔“ ندا مسکرا کر چھوٹی بہن کو ٹالتے ہوئے بولی۔

روحی بیگم کو اللہ نے پانچ بیٹیوں سے نوازا تھا۔ سب سے بڑی ندا، ماہم، عائشہ، زوہا اور پھر سب سے چھوٹی علیہ تھی۔ اللہ نے بیٹا کوئی دیا نہیں تھا۔ ارشد صاحب کی اپنی پانچ بیٹیوں میں جان بھی۔ روحی بیگم پہلے سسرال کے ساتھ رہتی تھیں۔ کچھ دنوں پہلے ہی وہ اس نئے گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ پانچوں بہنوں میں اتنی محبت تھی کہ نئے گھر میں بھی پانچوں بہنوں نے اپنے لیے ایک ہی کمر لیا۔ کچھ دنوں سے سب محسوس کر رہے تھے کہ ندا جب سے نئے گھر میں آئی ہے بہت چپ سی ہو گئی ہے۔

☆.....☆.....☆

رات تین بجے ندا کی خوف سے گھبرا کر آنکھ کھل گئی۔ پندرہ دن سے وہ مستقل ایک ہی خواب دیکھے جا رہی تھی کہ وہ وہن کالال لباس پہنے ایک لڑکے کے پیچھے بھاگ رہی ہے، جو دولہا بنا ہوا ہے وہ اس کے پیچھے بری طرح سے دوڑ رہی ہے۔

وہ سانس نہ لے سکتی تھی اور جب سے گلاس میں پانی ڈال

تھرڈ فلور کے فلیٹ نمبر 125 سے رات بارہ بجے دل دہلا دینے والی چیخوں نے آس پاس کے فلیٹ کے مکینوں پر خوف سا طاری کیا ہوا تھا۔ پوری بلڈنگ میں ان چیخوں سے عجیب سی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ روز رات بارہ بجے سے فجر تک وقفے وقفے سے فلیٹ نمبر 125 سے آنے والی پانچ لڑکیوں کی چیخوں کے پیچھے کیا ماجرا تھا۔ آئیے آپ کو بتاتے ہیں۔

”دو ہفتے ہو گئے۔ شفٹ ہوئے پر کام سمٹنے کا نام نہیں لے رہا۔“ ماہم بیڈ پر بیٹھتے ہوئے عائشہ سے بولی۔

”صحیح کہہ رہی ہو یا۔ میرا تو تھکن سے برا حال ہو گیا۔“ زوہا بیڈ پر لیٹی شرارت سے بولی۔

زوہا کی بات پر ماہم، عائشہ اور علیہ اسے غصے سے گھورنے لگیں۔ ان پانچ بہنوں میں سب سے کام چور زوہا تھی۔

”آپ کیوں اتنی چپ چپ سی ہیں۔ جب سے ہم نئے گھر میں آئے ہیں آپ بہت چپ سی رہنے لگی ہیں۔“ سب سے چھوٹی علیہ، ندا کو خاموش پا کر بولی جو سب کے درمیان خاموش سی بیٹھی تھی۔



”تمہیں نظر نہیں آرہا، میں اپنے دولہا سے بات کر رہی ہوں۔ اندھی ہو گیا۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔“ ندا چیختے ہوئے بولی۔ اس شور سے علینہ، زوہبا کی بھی آنکھ کھل گئی۔

”یہ ندا آپ کی کو کیا ہو گیا؟“ علینہ، زوہبا کا خوف سے باز و پکڑتے ہوئے بولی۔ روجی بیگم بھی گھبرا کر کمرے میں آ گئی تھیں۔

”کیا شور مچا رکھا ہے اس وقت تم لوگوں نے۔“ امی دیکھیں نا! آپ کے داماد آئے ہوئے ہیں اور یہ سب بدتمیزی کر رہی ہیں۔“ ندا ناراضگی سے بولی۔

”احمد سلام کریں امی کو۔“ ندا اپنے برابر میں نادیدہ ہستی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”السلام علیکم ساس جی۔“ بھاری مردانہ آواز پر روجی بیگم چکرا کر گر گئیں۔

☆.....☆.....☆

کل رات سے روجی بیگم ندا کو لے کر پریشان اور خوفزدہ تھیں۔ ارشد صاحب سے انہوں نے کسی روحانی بزرگ کو ندا کو دکھانے کے لیے کہا تھا۔

”آج ندا کو لے کر ان بزرگ کے پاس پہنچے تھے۔ ابھی ان بزرگ نے اس پر پڑے کر پتھر کا ایسا قہقہہ بھرا کہ ندا

کر پینے ہی لگی تھی کہ عجیب سی آواز پر اچھل پڑی اور جب سامنے نگاہ گئی تو اس کی خوف سے آنکھیں پھٹ گئیں۔

☆.....☆.....☆

روچی بیگم نے اپنی پانچویں بیٹیوں کو شاپنگ کے میسے دیے تھے۔ ندا سارے کے سارے ایک ہی رنگ کے لال جوڑے لے آئی۔ روجی بیگم حیران تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ندا کو تو لال رنگ ہی پسند نہ تھا۔

رات دو بجے ماہم کی کسی کے بولنے کی آواز پر آنکھ کھلی تو سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس رکھی کرسی پر ندا کو بولتے پایا۔ لال لباس میں سر پر دوپٹے لیے ہوئے، فل میک اپ میں وہ کسی سے شرماسرما کر ندا کو باتیں کرنا دیکھ کر ماہم کا خوف سے برا حال ہو گیا تھا۔ اس کی ہمت نہیں نہ ہو رہی تھی کہ اٹھ کر ندا کے پاس جائے۔

اس نے اپنے برابر میں لیٹی عائشہ کو آہستگی سے اٹھایا۔ عائشہ اٹھ کر ندا کے پاس گئی۔ کمرے کی لائٹ جلا کر اس نے ندا کو غور سے دیکھا جس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

”ندا یہاں کیا کر رہی ہو۔ اٹھو یہاں سے۔“ عائشہ ندا کو اس حال میں پیچھے دیکھ کر غصے سے بولی۔

بھاری مردانہ آواز میں چیخی۔
 خبردار میری دھن کو کچھ کھا۔ میں اس کا دولہا ہوں
 میں نہیں چھوڑوں گا اس کو۔“ یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئی۔

☆.....☆.....☆
 ”زود ہا بیٹا گھر سمیٹ لو، دیکھو کس قدر پھیلا ہوا
 ہے۔“ روجی بیگم ابھی گھر آئی تھیں۔ آج وہ صبح سے تینوں
 بیٹیوں کو ان کے روحانی علاج کے لیے لے کر گئی ہوئی
 تھیں۔ ارشد صاحب بھی آفس گئے ہوئے تھے۔
 ”ارے زود ہا بیٹا سمیٹ لو۔“ روجی بیگم تھکن سے
 چور صوفے پر لیٹتے ہوئے بولیں۔

”اچھا بیٹی ہوں۔“ زود ہا کی آواز پر وہ چونک کر اس
 کو دیکھنے لگیں مگر زوردار آواز پر وہ اچھل کر بیٹھ گئیں۔
 ایک ہاتھ سے زود ہا کرسی اٹھا کر رکھ رہی تھی۔ اتنی جان
 زود ہا میں کیسے آگئی کہ وہ اتنا بھاری صوفہ اٹھا کر رکھ رہی
 تھی۔ روجی بیگم خوفزدہ سی زود ہا کو دیکھتے ہوئے چیخیں۔
 ”زود ہا یہ کیا کر رہی ہو؟“

”اجی جان گھر سمیٹ رہی ہوں۔“ مردانہ آواز میں
 زود ہا بولتی ایک ایک ہاتھ سے چیزیں اٹھا کر ادھر ادھر
 کر رہی تھی۔ روجی بیگم نے زود ہا کا خوف سے ہاتھ پکڑا تو
 اس نے ایک ہاتھ سے ماں کو دھکا دیا۔ جس پر وہ کافی دور
 جا گری تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے گھر کا
 فرنیچر اٹھا کر ادھر ادھر پھینکا شروع کر دیا تھا۔ روجی بیگم کا
 رورو کر برا حال تھا۔

اب سب سے چھوٹی بیٹی علینہ ہر وقت چیختی رہتی کہ
 مجھے کوئی مادر رہا ہے۔ کوئی پکڑ رہا ہے۔“

ارشد صاحب اور روجی بیگم دونوں میں بوڑھے لگنے
 لگے تھے۔ پانچ بیٹیوں کی ازیت نے ان کی کمر توڑ کر رکھ
 دی تھی۔ بہت سی جگہوں سے علاج کروانے کے باوجود
 کوئی فرق نہ آیا تھا۔

اب رات بارہ بجتے ہی ندا بابا ہریٹ کی طرف دوڑ
 لگاتی کہ احمد آگئے۔ ماہم گوشت کھانے کے چلاتی۔
 عائشہ خواب سے ڈر کر چپچپیں مار کر اٹھ جاتی کہ مجھے جانے
 دو، ماڑہ آئی باہر کھڑی ہیں۔ زود ہا پورے گھر کا فرنیچر اٹھا
 کر پھینکے لگتی اور علینہ یہ کہہ کر چیختی رہتی کہ مجھے چھوڑو، مت
 پکڑو مجھے۔“

ارشد صاحب اور روجی بیگم پانچوں بیٹیوں کو

☆.....☆.....☆
 ”ارشد صاحب آپ گوشت نہیں لائے۔“ کچن
 میں کھڑی روجی بیگم بولیں۔

”ارے آج صبح ہی تو لایا ہوں بیگم۔“ ارشد صاحب
 ٹی وی دیکھتے ہوئے بولے۔ فریج سے گوشت غائب تھا۔
 روجی بیگم پریشان کھڑی ہوئی تھیں۔

راست پیاس کی شدت سے روجی بیگم کی آنکھ کھلی تو
 کمرے میں پانی ختم دیکھ کر وہ کچن میں آ گئیں۔ کچن سے
 آتی عجیب آواز پر ان کے قدم ٹھٹھک سے ٹگے مگر سامنے
 کے منظر نے ان کے پیروں تلے سے زمین ہی کھینچ لی
 تھی۔ ماہم فرش پر بیٹھی گوشت کو دونوں ہاتھوں سے نوج
 نوج کر کھا رہی تھی۔ اس کے منہ سے کھاتے ہوئے
 بلیوں جیسی غراہٹ اور آنکھوں میں بلیوں جیسی چٹک
 تھی۔ منہ ہاتھ پر لگے خون کو وہ اب ہاتھ سے چاٹ رہی
 تھی۔ روجی بیگم منہ پر ہاتھ رکھ کر خوف سے اپنے کمرے
 کی جانب بھاگیں۔ روجی بیگم کو کمرے میں یوں آنا دیکھ
 کر ارشد صاحب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انہوں نے سانس
 بحال کرتے ہی میاں کے گوش گز ارسا را معاملہ کر دیا۔
 دونوں میاں بیوی اس نئی افتاد سے بہت بری طرح
 سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆
 رات بارہ بجتے ہی ندا بابا ہر جانے کے لیے چلانے لگتی
 کہ مجھے جانے دو۔ میرا دولہا بلارہا ہے۔“
 دوسری جانب ماہم کچا گوشت کھانے کے لیے مچلتی
 رہتی تھی۔

روجی بیگم نے فریج کو تالا لگا دیا تھا۔
 ”ای مجھے روز خواب میں ماڑہ آپی دکھتی ہیں۔ وہ
 مجھے ایک گندی گلی میں کھڑی ہو کر بلاتی ہیں۔“ عائشہ اپنی
 ماں سے روتے ہوئے بولی۔

”میں جگ آگئی ہوں۔ روز رات وہ مجھے خواب
 میں بلاتی ہیں۔“ روجی بیگم خوفزدہ سی اپنی تیسری بیٹی کو دیکھ
 رہی تھیں۔ ماڑہ ان کی بھانجی حسن کی وفات کو دس سال

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہوئی چاہیے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L-5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

سنجبا لے سنبھا لے بڑھال ہو جائے بے فجر ہوئے ہی
پانچوں بے ہوش ہو کر گر جاتیں۔

☆.....☆.....☆

”کیسی ہے آپ کی بیٹیوں کی طبیعت۔“ برابر والے
فلیٹ سے مہوش بیگم آئی ہوئی تھیں۔
”بس ویسی ہی ہے۔“ روجی بیگم اتنا کہہ کر پھوٹ
پھوٹ کر رو دیں۔

”ایک بات پوچھوں برا نہ مانیے گا۔ آپ کی بیٹی کسی
احمد کا نام لے کر رات کے وقت چلتی ہے۔“
”پتا نہیں کون احمد ہے مہوش۔ میں جانتی ہوں میری
بیٹی کی زندگی میں کوئی احمد نام کا نہیں تھا۔ پر جب سے
یہاں آئے ہیں تب سے.....“ یہ کہہ کر وہ اپنے آنسوؤں
کو روکنے لگیں۔ مہوش بیگم ہمدردی سے روجی بیگم کو دیکھنے
لگیں جن کی آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے واضح
دکھائی دیتے تھے۔

”پر میں جانتی ہوں احمد کون ہے؟“ مہوش بیگم کی
بات پر روجی بیگم چونک کر مہوش بیگم کو دیکھنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

”نفیسہ کے شوہر کا انتقال بہت پہلے ہی ہو گیا تھا۔
اس کے پانچ بیٹے تھے سب سے بڑا احمد پھر روحیل، علی،
نوی اور سب سے چھوٹا شان، نفیسہ اسی فلیٹ میں ایک
عرصے سے مقیم تھیں۔ اپنے پانچ بیٹوں کے ساتھ
پوری بلڈنگ کو بڑی محبت کی۔ نفیسہ کے بیٹوں سے۔ وہ
پانچوں بھی سب کا بہت خیال رکھتے تھے۔ نفیسہ اپنے
بڑے بیٹے احمد کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں اور پھر
انہیں ندانا لڑکی اپنے بڑے بیٹے احمد کے لیے پسند
آگئی۔ پوری بلڈنگ احمد کی شادی کی تیاریوں میں بڑھ
چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ بارات والے دن ایک ہی
گاڑی میں پانچوں بھائی ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ روحیل
گاڑی چلا رہا تھا۔ چاروں مل کر احمد کو چھیڑ رہے تھے۔
احمد کی خوشی بھی دیکھنے والی تھی۔ گاڑی میرج ہال سے اب
تھوڑے ہی فاصلے پر تھی کہ سامنے سے آتے آئل ٹینکر
سے ٹکرائی۔ ایک دھماکہ ہوا اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ ایک
کہرام مچ گیا تھا۔ ایک ہی گھر سے پانچ بھائی ایک ساتھ
اٹھیں تو نفیسہ شش کھما کر گر پڑیں۔ ہر ایک کے اگلے بار تھی۔

تھوڑے ہی دن بعد نفیسہ کا کبھی انتقال ہو گیا۔ ان کا دل
اس بڑے صدمے کو بہا نہیں پایا تھا۔
مہوش بیگم آنکھوں میں آبی نمی کو صاف کرتے ہوئے
بولیں۔ ان کو وہ پانچوں آج بے تحاشا یاد آ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

مہوش بیگم کے میاں ہی ایک بزرگ کو لے کر روجی
بیگم کے گھر آئے تھے۔ پورے گھر کو دیکھنے کے بعد وہ
لڑکیوں کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ سب خاموش بیٹھے
تھے۔ آنکھیں بند کیے وہ قرآنی آیات پڑھ رہے تھے کہ ندا
میں سے آئی مروانہ آواز پر انہوں نے آنکھیں کھول دیں
اور اب وہ ندا کو دیکھنے لگے تھے۔
”احمد تم جاؤ، اس کو چھوڑ کر یہاں سے۔“ بزرگ
کے بولنے پر وہ بولا۔

”میں نہیں جاؤں گا۔ یہ میری لہن ہے۔“
”اور ہم بھی نہیں چائیں گے یہاں سے یہ ہمارا گھر
اور ہمارا گمراہ ہے۔“ بانی چاروں لڑکیوں میں سے بھی
مروانہ آواز میں ایک ساتھ برا بد ہوئی تھیں۔

”دیکھو تم لوگوں کا اب اس دنیا میں کوئی کام نہیں۔ تم
پانچوں ان کو چھوڑ دو۔ تم لوگوں کی موت حادثاتی تھی۔
اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور۔ تم لوگ تو سب سے
اتنی محبت کرتے تھے۔ پھر اپنی موت کا بدلہ ان سے کیوں
لے رہے ہو۔ تم لوگوں کی موت اسی طرح نکلی ہوئی تھی۔
اس میں ان کا کیا قصور، اب یہ گھر تمہارا نہیں ہے، ان کا
ہے۔ ان کو سکون سے رہنے دو، تم لوگ تو اتنے محبت
کرنے والے تھے مت کرو ایسا۔“

تھوڑی ہی دیر میں یوں لگا جیسے پانچوں لڑکے
رونے لگے ہوں۔

”ہم جارہے ہیں، اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر پانچوں
لڑکیاں بے ہوش ہو کر گر گئیں۔

☆.....☆.....☆

”آج اس واقعے کو پانچ سال ہو گئے۔ ندا اور ماہم
کی شادی ہو گئی ہے۔ اب کچھ دنوں بعد عائشہ اور زوہا کی
بھی شادی ہونے والی ہے۔ سب بہت خوش ہیں اور پھر
کبھی اس فلیٹ سے کسی نے جینوں کی آواز نہیں سنی۔

☆.....☆.....☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

صبح روخانی علاج کرنے والے ایک بابا کو بلایا گیا تھا۔ جنہوں نے ان کے شک کی تصدیق کر دی تھی۔ اسی دن سے مہرین کا علاج شروع ہو گیا تھا۔ مگر دو ہفتے گزرنے کے باوجود بھی بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی، تب مہرین کے والدین کو کسی نے ایک عامل کا پتا دیا تھا اور وہ مہرین کو اس کے پاس لے گئے۔

عامل نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود لکڑی کی تسبیح بڑی تیزی سے دانے گراتی جا رہی تھی۔

”کون ہو تم، اور کہاں سے اس بچی کو پریشان کرنے آئے ہو؟“ انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر گھماتے ہوئے گردن کو وائیں جنس دینے کے ساتھ ہی عامل نے سوال کیا تھا مگر جواباً خاموشی تھی، اس عامل نے بے درپے کئی سوال کیے مگر ہنوز خاموشی کا راج تھا کہ اس عامل نے اپنی سرخ نگاہیں ادھر ادھر گھمانے کے بعد بالکل چپ کسی جیسے کی طرح بیٹھی مہرین کا ہاتھ پکڑ لیا چاہا تھا کہ اس عامل کے ہاتھ پر درمیان میں ہی گرفت ہو گئی تھی۔ اس نے نگاہیں اٹھائی تھیں۔ مہرین کے ساتھ ایک بے حد حسین اٹھارہ یا انیس سال کی لڑکی بیٹھی تھی۔ جس کی بے حد حسین چمکی آنکھوں میں غصہ ہلکورے لے رہا تھا اور وہ سرخ آنکھوں سے اُس عامل کو گھور رہی تھی۔

”کون ہو تم؟“ اس عامل نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا ہاتھ چھڑا کر غراتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ اور وہ اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی چلی گئی تھی کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور اس کی خوبصورتی اس کی سب سے بڑی دشمن بن گئی تھی۔ بچپن سے تعریف و توصیف سمیٹی جنب جوانی کی ولہیز پر قدم رکھا تو وہ لوگوں کی اچھی بری نظروں کو خوب محسوس کرنے لگی تھی اور اس کے پاپا کے دوست جو بچپن سے اس کو ایک بیٹی کی طرح ٹریٹ کرتے رہے تھے یکدم ان کی نظریں و نیت کیا بدلی تھی سب کچھ نہیں ہو کر رہ گیا تھا۔

کرنے لگی تھی۔ اس نے آہستہ پردیکھا تھا اور اُسے وہاں زارا، سارہ، نمرہ اور لائبہ کے علاوہ کوئی اور بھی محسوس ہوا تھا۔ وہ باقاعدہ کانپنے لگی تھی اور اُسے دیکھ کر سارہ کو فکر لاحق ہوئی تھی۔

”مہر! کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ اس کی توجہ بٹی تھی۔ اس نے سارہ کی طرف دیکھا اور لپٹی میں گردن ہلاتی کمرے میں نظر دوڑانے لگی تھی مگر اب وہاں ان لڑکیوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ اور اُنھ کر چیخ کرنے چلی گئی تھی۔ دروازے کا لاک لگاتے ہی اُسے پھر شدید احساس ہوا تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہے اور وہ باقاعدہ لرزنے لگی تھی۔ اور بے قراری سے اطراف میں نگاہ دوڑا رہی تھی کہ اس کی آنکھوں کے عین سامنے ایک پری و ش آن کھڑی ہوئی تھی جسے دیکھ کر اُس نے بے ساختہ چیخ ماری تھی۔

”ذرو نہیں مہر! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔“ وہ سکرائی تھی۔ اور وہ اپنے پورے وجود سے نیچے آن گری تھی۔

☆.....☆.....☆

اُسے جب ہوش آیا، بہت ساری خواتین اس کے ارد گرد بیٹھی تھیں۔ آیت الکرسی اور درود شریف کا ورد کر کے اس پر بھونکیں مارتی اس کی ماں کی آنکھوں میں بے حد مٹی تھی۔

”اسی لیے منع کیا تھا کہ رات کے وقت قبرستان کے پاس سے نہ گزرو مگر تم لڑکے، لڑکیوں نے کسی کی ایک نہ سنی، وہاں جو اوپڑا ہے اور یہاں یہ مہرین!“ مہرین کی سب سے بڑی مہمائی بونی تھیں اور وہ انہیں دیکھنے لگی تھیں اور اس کی آنکھوں کی سرخی اُن سب کو ہی سہا گئی تھی۔

”ابا! لگتا ہے اس پر کسی شے کا سایا ہو گیا ہے۔“ مہرین کی بڑی خالہ کا اتنا کہنا تھا کہ اس کی ماں بری طرح رونے لگی تھی۔ انہیں بمشکل کمرے سے باہر بھیجا گیا تھا اور پھر سب صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆

میرا دیس

میرا کاجل، میرا سرمہ، میری مٹی میرا دیس
میرا جھومر، میرا گجرا، میری مٹی میرا دیس
میرا ہار سنگھار ہے اس سے مجھ کو اتنا پیار ہے اس سے
میرا لنگن، میرا جھمکا، میری مٹی میرا دیس
میرے ہونٹوں کی ہے لالی، میرے کانوں کی ہے بالی
میرے ماتھے کی ہے بندی، میری مٹی میرا دیس
اس کے دم سے رنگ ہے مجھ پر اس کے دم سے روپ ہے میرا
میرا حسن اور میرا چہرہ، میری مٹی میرا دیس
میرے دل کے آئینے میں اس کے چار کا پھول خلا ہے
میری خوشبو، میرا پنہا، میری مٹی میرا دیس
میرے ہاتھ کی انگوٹھی بھی میری کلائی کی چوڑی بھی
میری مہندی، میری مالا، میری مٹی میرا دیس
شاعرہ: سعدیہ سیٹھی لندن

اس نے اُسے گرنے سے بچالیا تھا اور ایک ٹک اُسے
دیکھ رہی تھی، جو گھبرا کر اُدھر اُدھر دیکھتی چلی گئی تھی۔
اس کے قدم خود بہ خود اس کا پیچھا کرنے لگے تھے اور
اس کی تقرری سی ہنسی اسے ماضی میں لے گئی تھی اور وہ
فیصلہ کن انداز میں اس کے وجود میں اتر کر اس کے
ساتھ ہولی تھی۔

”اس سب میں تمہیں کیا فائدہ ہے؟ جاؤ اس
بچی کا پیچھا چھوڑ دو۔“ تمام تفصیل سن کر عامل غرایا تھا
اور وہ صاف انکاری ہو گئی تھی۔ اس کا بس یہی کہنا تھا
کہ وہ مہرین کو کبھی کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائے گی
اور اس کے ساتھ رہے گی۔

اُس عامل کے بعد بھی کئی عاملوں اور مولویوں کو
دکھایا گیا مگر وہ مہرین کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ
ہوئی اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

میں اپنی جیسی دیکھنے والی لڑکی کی ہمیشہ محافظ

ان کا بھانے بھانے سے اُسے باتوں لگانا، اُسے
قریب کرنے کی کوشش کرنا سب کچھ اتنا عجیب تھا کہ
وہ ان کے سامنے آنے سے ہی کترانے لگی تھی۔ مگر
وہ ہر دوسرے دن ان کے گھر چلے آتے تھے اور 24
مارچ 2004ء کی شام جب وہ آئے، سوئے
اتفاق وہ پہلی دفعہ گھر پر اکیلے تھی۔ اس کے پاپا کی
کسی کزن کی ڈیوٹی تھیں اور وہ اُسے گھر پر چھوڑ
کر جلد آنے کا کہہ کر چلے گئے تھے اور ان کی تو اس کو
گھر میں اکیلے پا کر دیرینہ مراد برآئی تھی اور وہ نیت
کی گندگی کو چھپا نہیں پائے تھے اور وہ عزت کی
حفاظت کرتے کرتے جان سے چلی گئی تھی۔

اس کی یوں اچانک موت اس کے والدین کے
لیے صدمہ ثابت ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ کیا کچھ ہوا
یہ ایک الگ کہانی تھی۔ جہاں تک اس کی بات تھی
اس کو مرنے کے بعد ایک دن بھی چین نہیں ملا تھا اور
24 مارچ کو اس کی بے کلی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی
اور جس شخص کی بدستی اُسے موت کے گھاٹ اتار گئی
تھی اس کا انجام بھی کچھ خاص نہیں ہوا تھا۔ اور اس
کی فیملی کو کیا کچھ برواشت کرنا پڑا لیکن جس شام اس
نے اپنی بیٹی کو اپنے ڈرائیور کے ساتھ بہت ناز و
انداز میں دیکھا تھا۔ اُس شام اُسے گل بہت یاد آئی
تھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا اس سے معافی
طلب کرتا نیم ویوانہ ہو گیا تھا اور تین سال بعد اس
کی حالت کے سبب گل کو کچھ سکون ملا تھا مگر 24
مارچ کی شام اس پر اب بھی بھاری ہی گزرتی تھی۔
اس کی روح بھٹکتی لگتی تھی لگتا تھا جیسے کہیں امان نہیں
ملے گی اور جب وہ پہلی دفعہ مہرین سے ملی اُس شب
بھی 24 مارچ تھی۔ وہ بھٹکتے بھٹکتے قبرستان کی فٹ
پاتھ پر ذرا دیر کو سستانے بیٹھی تھی کہ کوئی اس کی تنہائی
میں نخل ہو گیا تھا اور ایسا گزرے چار برسوں میں پہلی
دفعہ ہوا تھا۔ اس نے غصے سے نظر اٹھائی تھی اور پلٹ
کر نہیں آ سکی تھی کہ اُس میں اُسے اپنی شبیہ نظر آئی
تھی اور اس نے چار سال بن باس کاٹنے کے
باوجود کسی اور کو تو کیا ابھی اپنے مجرم کو بھی جگ نہیں کیا
تھا۔ اس پر اس کی نگاہ نہیں بہت رہی تھی اور

بن کر رہ جویا گی۔ اس نے اپنے بچے کی ہمیشہ لاج رکھی تھی۔ وہ مہرین کو تنگ نہیں کرتی تھی۔ بس ایک باڈی گارڈ کی طرح اس کے ساتھ رہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

دو سال گزر گئے تھے۔ مہرین نے انٹر کر لیا تھا۔ اب اس کے رشتے آنے لگے تھے مگر خاندان میں سب کو تمام صورت حال معلوم تھی اس لیے کوئی آگے نہیں بڑھتا تھا اور باہر کے بندے کو بھی سن سن مل ہی جاتی تھی، یوں کہیں بھی بات نہیں بنتی تھی اور مہرین کا چلبلا پن تو دو سال قبل ہی غائب ہو گیا تھا وہی سہمی کسر اب پوری ہونے لگی تھی۔ وہ اب اُداس رہنے لگی تھی اور جب جب وہ اُداس ہوتی تھی اس کے ارد گرد رہنے والوں کو تنگ کرنے لگتی تھی۔ اسے ہر حال میں مہرین کی خوشی درکار تھی۔

مزید دو سال اور گزر گئے۔ اس نے گریجویشن کر لیا، وہ اکثر شام کو اکیلی بیٹھی آہیں ہی آپ باتیں کرتی تھی، درحقیقت سحر اس سے باتیں کرتی تھی۔ اُسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی مگر ایک قیدی کی سی زندگی اُسے خوشی سے دور رکھتی تھی کیونکہ مہرین اپنی مرضی سے کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ کہیں جانے گئے لیے کپڑے تک اُسے گل کی مرضی ہے پہننا پڑتے تھے گزرتے وقت کے ساتھ اُسے فورس کرنے لگی تھی اور اس کے انکار پر اُسے بھی نہ چاہتے ہوئے تکلیف دینے لگی تھی کہ وہ دیتی تکلیف خود کو بھی مگر اس کا مسکن چونکہ مہرین کے وجود میں تھا اس لیے اُسے بھی دورے پڑتے۔ کبھی وہ اپنی کلائی پر دانت گاڑھ دیتی اور یہ اذیت و تکلیف دن بہ دن اُسے کمزور کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ان کے دور پرے کے عزیزوں کا بیٹا ارسلان ان کے گھر آیا تھا اور اُسے مہرین بہت اچھی لگی تھی اور اس نے مہرین سے شادی کی ضد پکڑ لی تھی۔ اس کے والدین راضی نہ تھے مگر وہ بھی ڈٹ گیا تھا اور ارسلان نے خود آگے بڑھ کر مہرین کے والدین سے بات کی تھی اور وہ تو چاہتے ہی یہی تھے کہ کن

طہرج پہلے میرین کی شادی ہو جائے اس لیے ارسلان کے والدین کے انکار کے باوجود انہوں نے حای بھری تھی۔ مگر انہیں ڈر تھا کہ وہ اس کی شادی نہیں ہونے دے گی اس لیے پھر ایک پہنچے ہوئے عامل کو بلوایا گیا تھا اور گل نے شادی کی اجازت دے دی تھی مگر جانے کو راضی نہ ہوئی تھی۔

مہرین کی شادی 2013ء میں ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ گل کو رہتے کوئی سات، آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ وہ مہرین کو یا اس کے شوہر کو کچھ نہیں کہتی مگر مہرین کا ساتھ چھوڑنے پر ہرگز راضی نہیں ہوتی۔ غصہ و پیار تو ہر رشتے میں ہی چلتا ہے۔ مگر ارسلان ذرا سی تیز آواز میں بھی مہرین سے بات کرے تو گل کو ناگوار نہ لگتا ہے اور اس کا سارا غصہ مہرین ہی اترتا ہے۔ کبھی کبھی ارسلان کو اپنے فیصلے پر پچھتاوا بھی ہوتا ہے مگر کبھی وہ جب دل سے سوچتا ہے تو خود کو مطمئن پاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

آج اس واقعے کو کئی برس گزر گئے ہیں۔ مہربان کے دو بچے بھی ہیں مگر گل اس کا پیچھا نہیں چھوڑی جبکہ ہر طرح کا علاج بھی کروایا جا چکا ہے۔ اس سب میں کیا اسرار پوشیدہ ہے؟ یہ کوئی آج تک نہیں جان سکا مگر سب اپنی اپنی زندگی میں مگن ہیں اور وہ بھی مگن تو ہے مگر کبھی کبھی سکون کو ترس جاتی ہے کہ قیدی کی سی زندگی تو پرندوں کو بھی متاثر نہیں کرتی وہ تو پھر جستی جاگتی لڑکی ہے۔ جس کی جوانی اور اس کے خوش کن خواب سب ملیا میٹ ہو گئے۔ بہت کچھ یاد کر بھی سب کچھ اُن جا رہا ہے۔ مگر وہ آف تک مرنے کا استحقاق نہیں رکھتی کہ زندگی اس کی ہے مگر اُسے جاکسی اور نے ہے۔

اس کہانی کے کردار آج بھی اپنی بے بسی کے ساتھ زندہ ہیں۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو مہرین کے لیے دعا کریں کہ گل اُسے اپنے سحر سے آزاد کر دے تاکہ وہ بھی اپنی مرضی سے آزاد فضا میں سانس لے سکے۔



✓ وہ کنگن

شیماء عبدالقیوم

اس سہاگن کا قصہ جسے اُس کی ساس ایک کنگن میں باندھ کر ختم کر دینا چاہتی تھی

اصفہان اسے دیکھ کر جتنا خوش تھا وہ اتنی ہی دل گرفتہ اور اداس۔ آج پورے چھ سال بعد وہ آئے سانسے تھے۔ کہنے کو چھ سال مگر ایک طویل دکھ بھرا عرصہ، جس نے حرا کو صرف آنسو ہی دیے تھے۔

Downloaded From
Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسری ہولناک کہانی

✖ بھید بھرا گھر

فوزیہ فرید احمد

✧ اس گھر میں وہ نادیدہ پراسرار عورت میری بیٹی ہی کی کیوں دشمن ہو گئی تھی؟ ✧

میں نے خود کا گھر خریدنے کی بات کی۔ وہ خود بھی اپنا گھر خریدنا چاہتے تھے کہ آگے چل کر کوئی پریشانی نہ ہو اسی لیے انہوں نے اپنے دوستوں سے کہہ کر گلستان جوہر میں اپنا ذاتی گھر خرید لیا تھا۔ ابھی اس گھر میں کچھ کام باقی تھا۔ اسی لیے ہم وہاں ابھی شفٹ نہیں ہوئے تھے۔ گھر خریدنے میں ہی اتنا تاخیر نکلیا تھا کہ میرے میاں کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اس لیے باقی کا کام وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ذمے کر کے خود قطر چلے گئے۔ اس دوران میں ہمیں ابھی کرائے کے گھر میں ہی رہنا تھا۔

یہ کرائے کا گھر اگرچہ گنجان آبادی میں واقع تھا مگر اس میں رہنے کے بعد اندازہ ہوا کہ غیر مرئی مخلوق ہر جگہ موجود ہو سکتی ہے بہر حال بات ہو رہی تھی ردا کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی، اسی طرف آتی ہوں۔

ایک دن مجھے کچھ سامان کی خریداری کے لیے مارکیٹ جانا پڑا۔ جانے سے پہلے میں نے ردا کو بھی ساتھ چلنے کو کہا مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ٹی وی پر اس کی پسند کی مووی آرہی ہے اس لیے وہ نہیں جا رہی۔

میں نے اس سے کہا کہ تم بورجوا نے لگو تو بہن کی طرف

اس گھر میں پراسرار عورت میری بیٹی ہی کیوں ڈراتی تھی۔ اس نے گھر میں آئے ہوئے ابھی ہمیں ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ میری چھوٹی بیٹی کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگے۔

یہ نیا گھر چالیس گز پر مشتمل دو منزلہ بنا ہوا تھا۔ زینے بالکل سیدھے بنے ہوئے تھے۔ گراؤنڈ فلور سے اوپر آنے والے زینے کا دروازہ گراؤنڈ فلور سے بھی تھا اور باہر سے بھی۔ یہ گھر ہر طرح کی سہولیات سے آراستہ تھا۔ میں اور میری چھوٹی بیٹی فرسٹ فلور پر رہتے تھے۔ سیکنڈ فلور پر سامان رکھا ہوا تھا جو ابھی سیٹ کرنا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر میری بڑی بیٹی نذا رہتی تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی کرائے پر آگئی تھی۔ میرے شوہر کمپنی کی جانب سے قطر میں جاب کرتے تھے جہاں سے وہ ایک معقول رقم بھیجتے تھے۔ پہلے ہم لوگ کرائے پر رہتے تھے پھر میاں کی بیٹی جانی والی رقم سے میں نے کچھ بچت کر کے اتنے پیسے اکٹھے کر لیے تھے کہ اپنا گھر خرید سکیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنے زیور بیچ کر بھی میں نے گھر کے لیے پیسے رکھ دیے تھے۔

جب میرے میاں ایک مہینے کی چھٹی پر گھر آئے تو

اس آواز کو سن کر ردا چوکی۔ کیونکہ یہ آواز ہرگز نہ باجی کی نہ تھی، اس پران کی گھومتی ہوئی آنکھیں جنہیں دیکھ کر ردا کو جھرجھری آگئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر دوڑتی ہوئی وہاں سے بھاگی اور نیچے کے پورشن میں آکر دم لیا۔ ابھی سانس بحال بھی نہ کر پائی تھی کہ کچن سے ندا باجی باہر آئیں اور ردا کی طرف بڑھنے لگیں۔ ردا کو لگا یہ وہی عورت ہے اور خوف و دہشت سے اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

ندا نے ردا کو جلدی سے سنبھالا اور اسے صوفے پر لٹایا پھر کچن سے پانی لائی اور اس کے چھینٹے ردا کے چہرے پر

چلی جانا۔ وہ کہنے لگے ٹھیک ہے ناں آپ پریشان مت ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ امی وہاں سے آپ میرے لیے میکرونی ضرور لائیے گا۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم آکر دروازہ بند کرلو۔“

وہ دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی تو میں بھی مارکیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

ردا کمرے میں آکر مووی دیکھنے لگی۔ وہ مووی دیکھنے میں مگن تھی کہ اسے چھت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

Downloaded From
Paksociety.com

مارے جس سے اس کو ہوش آگیا۔ ندا نے جلدی جلدی قرآنی آیات کا ورد کر کے ردا پر دم کیا۔ ردا یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ ندا نے اس سے کہا کہ کیا ہوا ردا! تم اتنی بدحواسی کی حالت میں آئی تھیں کہ میں ڈر گئی۔ پھر تمہارے بے ہوش ہونے سے مجھے لگتا ہے کہ تم کسی چیز سے بری طرح ڈر گئی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔“

کچھ دیر تو ردا خاموش رہی پھر اس نے اوپر والی عورت کے بارے میں بتایا جو ندا کی شکل میں تھی۔ ندا نے

اس نے وہم سمجھ کر سر جھٹکا اور دوبارہ مووی دیکھنے لگی مگر پھر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ چھت پر آگئی۔ یہاں آکر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ سامنے ہی اس کی بہن ندا اس کی طرف پشت کیے باریک کھسی سے جوئیں نکال رہی تھی۔ اس نے اپنی باجی سے پوچھا۔

”باجی کیا بہت زیادہ جوئیں ہو گئی ہیں۔“ اس کی آواز سن کر ندا باجی نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”ہاں بہت جوئیں ہو گئی ہیں۔ تو آکر کڑکال دے۔“

اس کی بات سن کر کہا کہ ”اب کبھی اکیلی اور پرست جانا۔“
ردانے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

میں جب گھر پہنچی تو ندانے دروازہ کھولا۔ میں نے پوچھا۔ ”ردا کہاں ہے۔“ تو ندانے کہا۔

”آپ فریش ہو کر آجائیں پھر میں آپ کو ردا کے بارے میں بتاؤں گی۔“

میں فریش ہو کر نیچے آئی تو ندا چائے تیار کر چکی تھی اور ردا، ندا کے ساتھ کھڑی تھی۔ ندا چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں آنے لگی تو ہمیں بھی ساتھ آنے کو کہا ہم لوگ کمرے میں آئے تو ندا کہنے لگی۔

”ای امی آپ کو پتا ہے آج ردا اتنی خاموش کیوں ہے۔“ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ردا سے مخاطب ہوئی۔

”ردا تم ای کو بتاؤ تم کیوں ڈری تھیں۔“

ردانے جب مجھے وہ سب بتایا جو اس نے دیکھا تھا تو میں حیران رہ گئی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ ردا کو اکیلا نہیں چھوڑنا ہے اس کے علاوہ میں نے ردا کو آئیہ انکری اور دوسری قرآنی آیات پڑھ کر خود پر دم کرنے کی ہدایت بھی کی۔ میں خود بھی اس پر دم کروا کر کرتی تھی اس طرح پندرہ دن آرام سے گزر گئے۔

☆☆☆.....☆☆☆

ایک دن میری بڑی بہن نے فون کر کے مجھے اپنے گھر بلوایا، وہ اپنے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہی تھی اور مجھے بھی ان کے ساتھ جانا تھا۔ میں نے ردا سے تیاری کرنے کو کہا تو وہ کہنے لگی کہ ”ای امی آپ چلی جائیں، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”کوئی پین کمر لے لو۔“

”ای امی آپ پریشان نہ ہوں میں ندا بابی کی طرف چلی جاؤں گی۔“ ردانے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے لیکن بالکل یہاں مت رکنا ابھی چلی جانا۔“

”بہتر امی۔“ میں نے اسے کچھ اور ضروری ہدایات دیں اور بہن کے گھر چلی گئی۔

ردانے سوچا اپنے لیے ٹرے پر لیں کر لائیں پھر ندانے

بابی کی طرف چلی جاؤں گی۔ اس نے کپڑے پر لیں کیے اور باہر کا جائزہ لینے کے لیے کھڑکی پر آگئی۔ وہ کھڑکی کھول کر باہر کی گہما گہمی دیکھنے میں مگن تھی کہ اس کی نظر ساتھ والی کھڑکی پر پڑی۔ اس بھیا تک منظر کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ انتہائی کراہیت زدہ غلاظت سے بھرپور دو ہاتھ اس کی برابر والی کھڑکی سے باہر نکلے ہوئے تھے جیسے کوئی اندر کھڑے ہو کر باہر کی طرف دیکھ رہا ہو۔ یہ ہاتھ کس کے ہو سکتے ہیں؟ یہ دیکھنے کے لیے جب ردانے منہ اندر کر کے برابر والی کھڑکی کی طرف دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے دوبارہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر برابر والی کھڑکی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ہاتھ بدستور وہاں موجود تھے۔ اس نے جلدی سے سر اندر کیا اور دیکھا تو اس بار بھی وہاں کوئی نہ تھا۔ غیر معمولی بات کو محسوس کر کے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لر دوڑ گئی۔ اس نے چیخا چاہا تو آواز جیسے گلے میں گھٹ گئی لیکن اگلے ہی لمحے ایک بھیا تک چیخ اس کے گلے سے برآمد ہوئی اور پھر وہ رکے بغیر چلتی ہی چلی گئی۔

ندانے جو چیخ کی آواز سنی تو فوراً بھاگ کر اوپر آئی اور چیختی ہوئی ردا کو گھونٹا۔ اس سے اس کی چیخیں رک گئیں اور وہ بہن سے لپٹ گئی۔ ندانے بہن کو لا کر صوفے پر بٹھایا۔ ندا کے پوچھنے پر ردا نے ان ہاتھوں کے بارے میں بتایا۔

”ردا تمہیں اکیلے نہیں رہنا چاہیے تھا یا راجب امی جا رہی تھیں تو تم کو بھی ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا یا پھر تمہیں فوراً میرے پاس آ جانا چاہیے تھا۔“

ردا کچھ نہ بولی بس اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ میں جب گھر پہنچی تو ندا کو دیکھ کر میں سمجھ گئی ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔ میں نے ندا سے پوچھا۔ ”ردا کہاں ہے؟“

”آپ آرام سے بیٹھیں، میں آپ کو بتاتی ہوں۔“

پھر ردا کے ساتھ ہونے والے اس واقعے کو ندانے سنانے کے بعد کہا۔ ”ای امی اب آپ کسی بھی قیمت پر ردا کو اکیلی نہ چھوڑیے گا اگر یہی حالات رہے تو خدا نہ کرے کوئی بھی انہونی بات ہو سکتی ہے۔“

”کہہ تو تم فحک رہی ہو۔ مجھے اس کی حفاظت کے لیے بچھ کرنا ہوگا۔“ میں نے ردا کو بھی سختی سے تاکید کر دی تھی

دے۔ جیسے اسی ان کے ہاتھوں کا دوا میری گردن پر
بڑھا خوف سے میری چیخ نکل گئی۔ امی خدا کے لیے
یہاں سے چلیں ورنہ وہ عورت مجھے مار دے گی۔
اب تو مجھے اور بھی فکر ہو رہی تھی۔ میں نے تنویر سے
کہا کہ بیٹا تم نے ردا کی حالت دیکھ لی ہے اب تم کو ہر
حال میں ہمارے لیے ایک گھر کا انتظام کرنا ہے۔ بیٹا تم
ہمارا یہ کام کرو تو میں تمہاری احسان مند رہوں گی۔

”ارے امی احسان کیسا؟ بیٹا بھی کہتی ہیں اور شرمندہ
بھی کرتی ہیں۔ آپ فکر نہ کریں بس میں کل ہی سے کوشش کر
کے اسی ہفتے کے اندر اندر کوئی دوسرا گھر تلاش کرتا ہوں۔“
کچھ دیر بعد لائٹ آگئی تو ہم نے سکھ کا سالن لیا۔

☆.....☆.....☆

اس واقعے کے دوسرے دن کی بات ہے میں اور ردا
سور سے تھے کہ ردا کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو
ردا اپنی گردن پکڑے رو رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا
کیا ہوا تو اس نے بتایا کہ وہ سو رہی تھی کہ کسی نے اس کا گلا
دبانے کی کوشش کی ہے۔ جب میں نے اس کی گردن
دیکھی تو حیران رہ گئی وہاں واقعی کسی کی انگلیوں کے گہرے
نشان موجود تھے۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ
کوئی میری بچی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔

دو رات ہم نے جیسے تیسے گزار دی۔ اگلی صبح ہم نے اپنا
ضروری سامان پیک کیا اور میں اپنی امی کے گھر آگئی۔

جب میری امی یعنی ردا کی نالی کو ان ساری باتوں کا علم
ہوا تو وہ بہت ناراض ہوئیں۔ انہوں نے بھائی سے کہہ کر
ہمارے لیے کسی گھر کا کہا اور جب تک ہمیں اپنے ساتھ
رہنے کی تاکید کی۔ بھائی کی کوششوں سے جلد ہمیں ایک گھر
مل گیا اور ہم وہاں شفٹ ہو گئے۔ یہ گھر بھائی کے دوست کا
تھا اور ہر طرح کے شیطانی چکروں سے پاک تھا۔

یہاں آ کر پھر ردا کے ساتھ کچھ نہ ہوا۔ شاید اس کی
وجہ وہ تعویذ ہو جو پیش امام نے دم کرنے کے بعد اسے
گلے میں پہننے کے لیے دیا تھا۔

آپ لوگ جب بھی گھر میں پہلے اس کے پارے
میں اچھی طرح معلومات کروائیں تاکہ بعد میں کسی قسم کی
کوئی پریشانی نہ ہو۔

کہ وہ آئیہ الکبریٰ کا حصار ہر وقت خود پر قائم رکھے۔ میں خود
بھی اس پر قرآنی آیات کا دم کر دیا کرتی تھی۔ اس سے یہ ہوا
کہ ردا کا ڈر بھی کافی حد تک کم ہو گیا اور کوئی واقعہ بھی پیش نہ
آیا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ ردا اکیلے نہ رہے اس کے علاوہ
میں نے اس گھر کو چھوڑنے کا تہیہ کر لیا تھا اس کے لیے میں
نے ایک دو لوگوں سے بات بھی کر رکھی تھی۔

☆.....☆.....☆

گرمی کا موسم تھا اور لائٹ بھی گئی ہوئی تھی۔ یہ کوئی
رات آٹھ بجے کا وقت تھا۔ کھانا میں نے جلدی بنالیا تھا اس
لیے اب فارغ تھی۔ میں اور ردا کمرے میں بیٹھے باتیں
کر رہے تھے۔ ردا کو پیاس محسوس ہونے لگی تو وہ بولی۔

”امی میں پانی پی کر آتی ہوں۔“ میں بھی اس کے
ساتھ اٹھنے لگی تو وہ کہنے لگی۔ ”آپ بیٹھیں میں بھی ابھی
پی کر آتی ہوں بلکہ پانی کی بوتل یہیں لے آتی ہوں۔“
میں نے اس سے کہا کہ ”جلدی آ جانا بیٹا۔“

”ہاں ہاں امی بس فریج سے بوتل نکالنی ہے۔ آپ
پریشان نہ ہوں۔“ وہ بوتل لینے چلی گئی تو میں وہیں لیٹ
گئی اور سوچنے لگی ردا کی شادی ہو جائے گی تو میں کتنی
اکیلی رہ جاؤں گی۔ کاش میرا کوئی بیٹا بھی ہوتا۔

ابھی میں سوچوں میں تھی کہ ردا کی دلخراش چیخ سن کر
میں گرتی پڑی بھاگی۔ میں جب ردا کے پاس پہنچی تو ردا تھر
تھر کانپ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر چیخی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا بیٹا تم ٹھیک تو ہو

ناں؟“ اتنے میں عدا کے ساتھ تنویر بھی آ گیا۔ ہم ردا کو
سہارا دے کر کمرے میں لائے کچھ دیر بعد جب پانی پی
کر اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بتایا کہ جب وہ
فریج سے پانی نکال رہی تھی تو اچانک واش روم کا دروازہ
کھلا اور اس میں سے امی نکلیں میں امی کو دیکھ کر سوچنے لگی
کہ ابھی تو میں امی کو کمرے میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ یہ اتنی
جلدی یہاں کیسے آ گئیں۔ میں انہیں دیکھ کر یہ سوچ رہی
تھی کہ انہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ٹھٹھکی گئی وہ ذرا
قریب آئیں تو ان کے چہرے کو دیکھ کر میں دمک رہ گئی۔
ان کے چہرے سے برستی وحشت اور حلقوں سے باہر آتی
آنکھیں مجھے کسی انہونی کا پتا دے رہی تھیں۔ قریب آ کر

انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور میری گردن پر رکھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

تیسری ہولناک کہانی

میرا بیچھا بھوڑا دو ✓

سعدیہ عابد

اُس دوشیزہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ جواب تک اُس مخلوق سے پہچانہ چھڑا سکی

منٹ کی واک پر تھا، اس لئے ساری لڑکیاں لڑکوں کی دیکھا دیکھی بیدل جانے کو چل اٹھی تھیں۔ مگر گاڑی میں موجود بڑی بوڑھی خواتین نے انہیں ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا کہ سامنے ہی قبرستان تھا۔ جہاں سے گزرنا ناگزیر تھا۔ مگر اس وقت ان لڑکیوں نے اُن کی ایک نہ سنی اور چل پڑیں۔ پیچھے سے ماؤں کی ہدایتیں شروع ہو گئی تھیں کہ سر ڈھانپ کر رکھو، راستے میں بات نہ کرنا نہ ہی ہنسنا۔ وہ سب لاابالی سی لڑکیاں ان کی باتیں اُن سنی کرتیں مزے سے چل پڑی تھیں اور باتوں کا ایک جہان آباد ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے وہ کسی منڈیر سے ٹکرائی گئی، اس سے پہلے کہ وہ گر جاتی کہ ایک لمحے میں وہ واپس سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ چلتی نمرہ (خالہ زاد) نے آگے بڑھ کر اُسے کچھ کہا تھا اور وہ مدھر ہنسی ہنستی چلی گئی تھی۔ وہ تاویر ہنستی کہ کچھ دیر قبل اُسے اپنے بازو پر نرم سا لطیف لمس محسوس ہوا تھا۔ اور اسی ناویدہ سے وجود نے اُسے گرنے سے بچایا تھا۔

اچھا ایک سے اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے

یہ کہانی شروع ہوتی ہے ایک چمکیلے سنہرے ون، جس کا اختتام ایک اندھیری رات پر ہوا تھا۔ وہ جس وقت اپنی سہیلیوں اور کزنز کے جھرمٹ میں گھر سے نکلی تھی اُسے اندازہ تک نہ تھا کہ واپسی میں وہ اکیلی نہ ہوگی۔ ایک سایا ایک روح اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اس کے وجود کو مسکن بنا کر اس کے سنگ چلی آئے گی۔

24 مارچ 2008ء کی شب مہرین کے ماموں کی بارات تھی۔ جس میں اُس نے سنہری رنگ کی ویدہ زیب فراک زیب تن کی تھی۔ سنہری رنگ اس کی اُجلی رنگت پر بے حد کھل رہا تھا۔ لڑکپن کو خیر باد اور جوانی کو خوش آمدید کہتی مہرین کی خوبصورتی اپنی مثال آپ تھی۔ سفید دو دھیارنگت خوبصورت متناسب سراپا، مدھر آواز جس نے ایک بار اُسے دیکھا اور سنا، مانو اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اور ہنسی ایسی کے جھرنے بننے لگیں۔ مہرین اپنی کزنز کے ساتھ جس گاڑی میں بیٹھی تھی، وہ خراب ہو گئی، جس جگہ گاڑی خراب ہوئی وہاں سے مہرین کے ماموں کا گھر دس

غیر حرجی ملاقات نے اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ کمرے میں مختلف آوازیں اور خوف سرسرا نے لگا تھا۔ جبکہ جواد بے ہوش ہو گیا تھا، اور وہ سب کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ خوشی کے ماحول پر اچانک سے خوف کی فضا طاری ہو چکی تھی۔ جواد کو ہوش میں لانے کی تدبیر کی گئی تھی۔ اس کے ہوش میں آتے ہی اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی تھی۔ مگر اس کے کان کچھ نہیں سن رہے تھے کہ اس کی سماعت میں تو ایک دلکش مدھرنسواری آواز ٹھہر گئی تھی۔

”اُس کو نظر بھر کے تو کیا آئندہ نظر اٹھا کر بھی دیکھا تو آنکھیں نکال کر ان سے گوٹیاں کھیلوں گی۔“

”وہ باقاعدہ کاپننے لگا تھا اور اس کی حالت دیکھ کر نانا ابونے بیٹے کے ساتھ اُسے اکیلے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ باقی کی رسومات بڑی بے دلی اور خوف کے حصار میں بندھ کر ادا کی گئی تھیں اور وہ نمرہ وغیرہ کے ساتھ جس کمرے میں ٹھہری تھی۔ وہاں چلی آئی تھی۔

اُسے اپنا سر بھاری بھاری لگ رہا تھا۔ جسے تھام کر وہ نمرہ کے داش روم میں آ جانے کا انتظار

چہرے پر کسی کی نگاہیں گردش کرنے لگی ہوں۔ اس نے گھبرا کر آگے پیچھے دیکھا مگر وہ کسی کو بھی تلاش نہیں کر پائی تھی اور ایک بار پھر اپنی ہی دھن میں چلنے لگی تھی مگر اب کے اُس کی چال میں بے فکری و سرمستی سی نہ تھی اور گھر پہنچنے تک اُسے یہی لگا تھا کہ وہ وہاں سے اکیلی نہیں آئی۔ یہ شدید احساس اُس پر کپکپی طاری کرنے لگا تھا۔

گھر میں نئی دلہن کے استقبال کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ مردانہ آوازیں، بچوں کی کھلکھلاہٹیں اور خواتین کے بے فکرے قہقہے ماحول کو بے حد خوشگوار بنا رہے تھے اور وہ یکدم چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی چہرے پر اضطرابی حالت میں ہاتھ پھیرتی تو کبھی دایاں بازو سہلانے لگتی۔ اس کی یہ بے چین سی کیفیت اپنی اپنی مصروفیات میں ابھی لوگوں کی نظر سے پوشیدہ تھی۔

اور پھر رسوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ وہ ایک شوخ چلبلی لڑکی فوراً ہی سب کے گرد آن کھڑی ہوئی تھی اور جواد (ماموں زاد) اُسے یک ٹک دیکھنے لگا تھا۔ سنہری فیراک میں اس کے حسن کی تابانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ وہ تادیر اُسے تکتا کہ اُسے یکدم کسی



Downloaded From
Paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آن لائن بیسٹ سیلرز:-



وہ لاکھ کوششوں کے باوجود اصفہان کو بھول نہ پائی تھی۔ اس وقت دونوں شاپنک مال کے فوڈ کورٹ میں آئے سامنے بیٹھے تھے۔ اصفہان پہلے جیسا ہی تھا بلکہ تھوڑا کمزور ہو گیا تھا جب کہ حرا پہلے جیسی ہی تھی خوب صورت اور دلکش بس جو آنکھیں مسکراتی رہا کرتی تھیں اب وہاں خاموشی اور اداسی کی گہری چھاپ تھی۔ اصفہان خاموشی سے اسے تنکے گیا۔

”حرا کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں اور تمہارے بغیر کیسی ہو سکتی تھی میں۔“

”جانتا ہوں۔“ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”میں نے جو کیا تم جانتی ہو۔ تمہاری رضا مندی سے کیا۔“

”ہاں تو میں نے کب گلہ کیا۔“ وہ برجستہ بولی۔ ”جانتی ہو حرا، ان دو سالوں میں کیا کیا بدل گیا۔ تم نے تو پلٹ کر کبھی بھی میری خبر نہ لی۔“ وہ گلہ کر رہی گیا۔

”کیا کرتی تم سے رابطہ کر کے اصفہان تمہاری زندگی میں کوئی اور جو آ گیا تھا۔ میں کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی، نہ کسی کا صبر آزمانا چاہتی تھی۔“

”وہ بھی کب میرا ساتھ نہا سکی حرا۔“ اصفہان یکدم ہی اداس ہو گیا۔

”کیا مطلب؟“ حرا کا دل دھڑک اٹھا۔

”ہاں حرا! نوین اور میرا ساتھ نصف چار سال رہا، وہ بھی مجھے چھوڑ گئی ایک بیٹے کا تحفہ دے کر۔“

”کہاں چلی گئی نوین؟“

”حرا وہ دوسری بار ماں بننے جا رہی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر آٹھویں مہینے میں اس کا بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا کہ لاکھ ڈاکٹرز کی کوششوں کے نہ وہ بچ پائی اور نہ ہی میرا بچہ۔“ اصفہان کی آنکھوں کی ویرانی نے حرا کا دل ہی جیسے بھینچ دیا۔

”اوہ ایم سو سوری اصفہان مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ تمہارے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔“ اس نے اپنا ہاتھ اصفہان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”اس اوکے حرا یہ سب ایسے ہی ہوتا لگتا تھا۔“

☆.....☆

اور پھر چند ہی ملاقاتوں میں حرا اور اصفہان نے پھر سے ایک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اصفہان کی والدہ اب خاموش تھیں۔ شاید یہی تقدیر کا فیصلہ تھا کہ حرا نے ہی اصفہان کی زندگی کی ساتھی بننا تھا۔

پانچ سالہ حنا بہت سمجھدار اور پیارا بچہ تھا۔ وہ جلد ہی حرا سے کھل مل گیا۔ نوین، اصفہان کی خالہ زاد بھئی جس کو بہت ضد اور مٹ دھری سے اصفہان کی امی نے اصفہان کی زندگی میں شامل کیا تھا مگر یہ دونوں کی قسمت میں ہی نہ تھا کہ ساتھ زندگی گزار پاتے۔ وہ حرا اور اصفہان کو ساتھ دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ حرا نے نہایت عمدگی اور سلیقے سے ان تمام کی زندگیوں کو سنبھال لیا تھا۔ البتہ کوئی تھا جواب بھی حرا کو اس جگہ مٹ سمجھ رہا تھا۔ وہ تھیں نوین کی ماں زمین خاتون۔ ظاہر تو بھانجے کی زندگی سنور جانے پر انہوں نے اسے خوب دعا میں دی تھیں مگر اندر ہی اندر وہ جیسے انگاروں پر لوٹ رہی تھیں۔

☆.....☆

کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ باریش آدمی سر جھکائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”کیا بتاؤں شاہ جی! وہ ڈائن ہے۔ میری نوین کو اسی کی نظر اور ہائے کھا گئی۔“ زمین خاتون رو رہی تھیں۔

”تم اب کیا چاہتی ہو، پہلے بھی تمہارے کہنے پر میں نے تمہاری بہن کا دل اس لڑکی کے خلاف کیا تھا۔ اب کیا چاہتی ہو؟“

”بس شاہ جی اس بار کچھ ایسا کر دیں کہ آپا اس لڑکی کو دھکے دے کر باہر نکل دیں۔ میں اپنے نواسے سے بہت پیار کرتی ہوں۔ بھلا بتائیں جو محبت اس کو لگی خالہ دے سکتی ہے وہ کوئی غیر لڑکی

دے دے گئے گی۔“
”اچھا تو یہ بات ہے۔ اب تم اپنی دوسری لڑکی کو اس گھر کی بہو بنانا چاہتی ہو۔“ وہ ذرا سا مسکرایا۔
عجیب مکروہ مسکراہٹ تھی۔
”جی شاہ بابا۔“ وہ دھیمے سے منمنائیں۔
”نذرانہ لائی ہو؟“

”جی جی بالکل۔“ زلیفین خاتون نے پانچ ہزار کے کئی نوٹ پرس سے نکال کر تخت پر رکھ دیئے۔
”ہنہ.....“ ایک اچھتی نظر نوٹوں پر ڈال کر شاہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ ”اس بار بہت ٹیڑھا مسئلہ لے کر آئی ہو۔“

”میرا آسیرا تو آپ ہی ہیں شاہ بابا۔“ وہ کفر کی حد تک پہنچ چکی تھی۔
”ٹھیک پر اس بار بڑا مشکل کام لے آئی ہو مگر میری مرید ہو خالی ہاتھ واپس کر دینا میری تو ہین ہے۔“
”آپ بتائیں، کرنا کیا ہے شاہ بابا۔“ وہ بے صبری سے بولیں۔

”مجھے ایسی عورت کا خون چاہیے جو امید سے ہو اور کوئی ایسا زیور لا کر دو جو وہ لڑکی ہر وقت بنے رکھے۔“ زلیفین خاتون کے چہرے پر پریشانی جھلنے لگی۔ زیور تو میں نے آؤں گی وہ اسے تحفے کے طور پر دے دوں گی۔ البتہ ایسی کوئی عورت..... وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

”سوچو اور سوچو کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔“ شاہ نے اس کی سوچ کو تحریک دی۔ ”اب تم جاؤ اور انتظام ہو جائے تو آ جانا۔ مجھے اور لوگوں کو بھی دیکھنا ہے۔“
”جی شاہ بابا۔“ وہ عقیدت سے اس کے ہاتھ چومتی اٹے پاؤں واپس نکل گئیں۔

☆.....☆

”اوہ میرے خدا یقین نہیں آرہا کہ میرے گھر میں پھر سے خوشیاں لوٹ آئی ہیں۔ میں بہت خوش ہوں بیٹا۔“ اصفہان کی ای نے شرماتی ہوئی حرا کو گلے سے لگا لیا۔ اصفہان اسے محبت بھری

نگاہوں سے چک رہا تھا۔
”کچھ دن سے حرا کی طبیعت کچھ خراب سی تھی اور آج ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد انہیں والدین بننے کی خوش خبری دے ڈالی تھی۔ اصفہان واپسی میں بہت سارے فروٹس اور چاکلیٹس سے لدا پھندا واپس آیا تھا۔ حسب توقع اس کی امی بہت خوش تھیں۔“

”بس حرا اپنا بہت خیال رکھو بیٹا۔ احتیاط کرو میری جان اور گھر کے کاموں کی فکر نہ کرنا میں اور رشید و مل کر دیکھ لیا کریں گے، کیوں رشیدہ؟“ انہوں نے کونے میں کھڑی دانت نکوستی رشیدہ کو مخاطب کیا۔

”جی جی بالکل بابا جی۔“ وہ کھل کر مسکرائی۔
”ارے ماما بابا آپ لوگ آگئے، میں سب سے پورے ہو رہا تھا۔“ حنا کمرے سے نکل کر بھاگتا ہوا ان کی طرف آگیا۔

”جی میری جان!“ حرا نے اسے محبت سے گود میں اٹھالیا اور چناٹ اس کے پھولے گالوں کو چومنا شروع کر دیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔
”بس میرے پاس آ جاؤ دادی کی جان۔“
نورہ خاتون نے حنا کو اس سے لے لیا۔

”بیٹا حرا تم ذرا احتیاط کرنا، اب یوں اسے گود میں اٹھائے مت رکھو۔“
”ارے ای کچھ نہیں ہوتا، یہ تو میرا بڑا چچا رہا بیٹا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”نہیں بیٹا فی الحال تمہیں احتیاط کی ضرورت ہے۔“ لمحہ بھر کو نورہ خاتون کی نگاہوں کے سامنے کچھ عرصہ پہلے کا منظر لہرا سا گیا۔ اصفہان نے پل بھر میں ان کی بدلتی کیفیت کو محسوس کر لیا۔

”ہاں حرا! پلیز کچھ عرصہ ہی کی تو بات ہے پھر شوق سے اٹھائے پھرنا اپنے تخت جگر کو۔“
”او کے!“ حرا نے لا پرواہی سے چاکلیٹ کھاتے ہوئے جواب دیا۔

☆.....☆

”میں کیا تاؤں کتنی خوش ہوں میں یہ خبر سن کر۔“

کر رہے تھے۔ انہوں نے نہایت ہوشیار رہی تھی۔
اس کا خون اپنے ہاتھ میں اپنے سونے کے کڑے
پر لگا لیا یہ خبر انہیں کچھ دن قبل ہی ملی تھی کہ شبانہ
بھی امید سے ہے۔

☆.....☆

زلفین خوشی خوشی بہن کے گھر چلی آئیں۔ کڑے
پر کام ہو چکا تھا۔ بس یہ کسی طرح حرا کے ہاتھوں میں
جانا تھا۔ مٹھائی سے لدی بہن کو آتے دیکھ کر نویرہ
خاتون کے سینے پر دھرا اندامت کا بوجھ آپ ہی سرک
گیا۔ بہن ان کی خوشی میں خوش تھیں۔ اس سوچ نے
انہیں نہال کر دیا۔

”حرا! بیٹا ادھر آؤ۔“ انہوں نے کھلتی حرا کو
اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ ”یہ میری طرف سے تمہاری
شادی اور آنے والے ختنے کا تحفہ ہے۔ انعامت
کرنا۔“ حرا نے حیرت اور مسرت سے اس بنگلے
کڑے کو دیکھا۔

”مگر خالہ یہ تو بہت قیمتی ہے۔“

”ہاں، مگر تم سے زیادہ نہیں۔“ بظاہر وہ بہت
محبت سے بولیں جب کہ دل اندر ہی اندر نفرت سے
کھول رہا تھا۔

”لے لو بیٹا محبت سے دے دیے گئے ختنے کو انکار
نہیں کرتے۔“ نویرہ خاتون ہر بات سے بے خبر
محبت سے چور لہجے میں بولیں۔ حرا نے جھپکتے ہوئے
کڑاہا تھ میں پہن لیا۔

”ماشاء اللہ بہت سچ رہا ہے جیسے تمہارے لیے
ہی بنا ہو۔“ زلفین خاتون نے فرط مسرت سے حرا کو
چوم لیا۔

”بس اب میں یہ کبھی تمہارے ہاتھ سے اترانہ
دیکھوں۔“ انہوں نے محبت سے اسے دیکھا حرا نے
مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

☆.....☆

اس واقعے سے تیسرے دن کی رات حرا کی
آنکھ اجاگ کھل گئی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی لیمپ کی
روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے سی کی ٹھنڈک نے ماحول کو
کافی خوشگوار بنا رکھا تھا مگر کچھ غیر معمولی احساس

کر۔ اللہ خیر سے میری حرا کو فارغ کر دے۔ چاہیں
کتنی منتیں مان رہی ہیں میں نے۔“ نویرہ خاتون ان
سے فون پر مچو گفتگو تھیں ادھر زلفین خاتون کے سینے پر
گو یا سانپ لوٹ رہے تھے۔

”ہاں ہاں باجی سب خیر ہوگی۔ چکر لگاؤں
گی جلد آپ کی طرف اور حرا کے لیے تحفہ بھی
لاؤں گی۔“

”ارے نہیں ان سب کی ضرورت نہیں۔“ وہ
بہن کی دلی کیفیت سے قطعاً لاعلم اس کی بظاہر نظر آتی
خوشی پر ہی مطمئن ہو گئیں۔

”ارے نہیں باجی یہ تو اس کا حق ہے اور
بتائیں حنا تو ٹھیک ہے ناں، حرا اس کا خیال تو
رکھتی ہے ناں۔“

”ارے ایسا ویسا لاؤ لا ہے اس کا۔ دن رات
اس کا سایا بنا گھومتا ہے۔“

”بس باجی مجھے حنا کا بڑا خیال رہتا ہے۔
آج اپنی اولاد نہیں تو ساری مامتا اس پر نچھاور کرتی
ہے۔ کل کو اگر بدل ہی تو بچہ رل جائے گا۔“

”ارے نہیں بالکل نہیں! میں نے اس کی
آنکھوں میں ممتا ہی ممتا دیکھی ہے حنا کے
لیے۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ ہیرا ہے میری
بہو۔“ وہ تفاخر سے بولیں تو زلفین خاتون لمحہ بھر
کو خاموش رہ گئیں۔

☆.....☆

”ارے یہ شور کیسا ہے نمرہ۔“ زلفین خاتون کی
آنکھ پکں میں سے آتی آوازوں پر کھلی۔

”امی جلدی سے آئیں شیانہ بچن دھوتے
ہوئے گر گئی ہے۔ کافی جھوٹ لگی ہے اسے۔“

نمرہ کے گھبرائی آواز پر وہ لپک کر بچن میں
پہنچیں۔ شبانہ نے پاؤں شلیف پر رکھا۔ ناکف
اسٹینڈ گر گیا تھا۔ پاؤں پر لمبا کٹ لگا تھا جس

سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ ایک دم ان کے
دماغ میں کچھ آیا تم اسے سنبھال کر لاؤ نج میں
لے آؤ۔ نمرہ میں بینڈ تاج لانی ہوں۔“ وہ لپک

جھپک کر بے ہوش جا گئیں۔ بظاہر شبانہ کی بیٹی

تھا۔ اصفہان کی طرف اس کی پست تھی۔ محبت سا
تھاؤ اور خوف اسے گھیرے ہوئے تھا حمرانے
دھیرے سے کروٹ بدلی اور لمحے بھر میں اس کی
چینیں ہر طرف گونجنے لگیں۔ ایک مردہ اس کے پہلو
میں بڑا تھا سیدھا۔ کافور کی بو سے اس کی سانسیں
رکنے لگیں تھیں۔

”حمران! حمران کیا ہوا؟“ اصفہان اسے جھنجھوڑ
رہا تھا۔

”وہ..... وہ اس سے زیادہ حمرانہ بول پائی اور
بے ہوش ہو گئی۔ پل ہی میں سب لوگ اس کے آس
پاس تھے۔“

”ایا اللہ! کس کی نظر لگ گئی میری خوشیوں کو۔“
نوریہ خاتون روتے ہوئے اسے دم کر رہی تھیں۔

☆.....☆

اور پھر یہ سلسلہ چل ہی پڑا۔ حمران کو ہر دم گھر میں
مردے نظر آتے رہتے۔ وہ کچھ ہی دنوں میں جیسے
جھٹک کر رہ گئی تھی۔ نوریہ خاتون، اصفہان سب
بہت پریشان تھے۔ حمران کو لمحہ بھر بھرتہا نہ چھوڑا جاتا مگر
اب یہ سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ حمران کو دورے پڑنے
لگے، ہاتھ پاؤں مڑ جاتے منہ سے جھاگ آنے لگتا
اور ایک دن اسی حالت میں اس کا بچہ ضائع ہو گیا۔
ایک قیامت تھی جو ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اصفہان
بچوں کی طرح رو پڑا۔

”امی یہ میرے کسی گناہ کی سزا ہے۔ میرے
نصیب میں اب کوئی خوشی نہیں بچی۔“ نوریہ خاتون
خود ای کیفیت کا شکار تھیں۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا۔ تم حمران پر دھیان
دو۔“ یہ تو اس کی پہلی خوشی تھی۔ حمران اپنے ہوش و
حواس میں کب تھی جو اسے یہ احساس ہوتا کہ وہ اپنی
زندگی کی پہلی خوشی سے محروم ہو گئی ہے۔

وہ دن تو دن رات میں بھی کمرے کی تمام
لائٹس آن کیے رکھتی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آہستہ
آہستہ موت کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اس تھوڑے
سے عرصے میں اس کی تمام تر خوب صورتی ختم ہو چکی
تھی۔ ہڈیوں کا بچھرن ہو گیا تھا۔ اس تمام مصورت

اصفہاں، حمران کو شہر کے تمام بڑے اور اچھے
ڈاکٹرز کو دکھا چکا تھا مگر اس کا علاج لا علاج بن چکا
تھا۔

”مجھے چھوڑ دو اصفہان۔“ وہ ایک ڈاکٹر کے
پاس سے واپس گھر آرہے تھے۔ تب حمرانے اسے
مخاطب کیا۔

”کیا مطلب!“ اصفہان نے حیرانی سے اس کا
چہرہ دیکھا۔ جواباً وہ ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے
لگی۔

”میں نے تمہاری زندگی مزید عذاب بنادی
ہے اصفہان۔ مجھے مار دو یا کسی لاوارث سینٹر میں
چھوڑ آؤ۔“ اصفہان نے گاڑی روک دی۔

”اور میرا کیا؟ میں کیسے جیوں گا تمہارے بچا
حمران!“ جواباً وہ سسکیاں بھرتی رہی۔ ”تم میری
زندگی ہو حمران۔ تم میرے ساتھ ہو، میرے پاس
ہو۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ یہ وقت
گزر جائے گا، کٹ جائے گا۔“ وہ اسے پیار سے
سمجھا رہا تھا۔ تبھی ایک فقیر چلا آیا۔

”دے اس کے نام پر جو سب سے محبت کرنے
والا ہے۔“

”یہ لو بابا بس میری زندگی کے لیے دعا کرو۔“
لحہ بھر کے لیے فقیر نے حمران پر نظر ڈالی۔

”تیری زندگی کی زندگی داد پر لگا دی ہے تیرے
کسی اپنے نے۔ یہ نہیں بچے گی۔ وہ اسے ختم کر دے
گی۔ وہ تیری زندگی بدل دے گی۔“ اصفہان نے
چونک کر اسے دیکھا۔ تبھی لحہ بھر میں حمران کے چہرے پر
جیسے پورے جسم کا خون جمع ہو گیا۔

”دفع ہو جا یہاں سے۔“ وہ غرائی۔ ”ورنہ
میرے ہاتھوں تو بھی ختم ہو جائے گا۔“

”بابا ہا۔“ وہ فقیر تہتہ لگا کر ہنس پڑا۔
”یہاں سے چلو اصفہان۔“ اس کی ہلکی سی

سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اصفہان نے کچھ سوچتے
سوچتے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

مناظر سامنے آئے۔ زلفین خالہ اورادہ مکروہ
شکل بڑھا ہلکی ہلکی سرکوشیوں میں ہوتی گفتگو زلفین
خالہ کا وہ کنگن اس بڑھے کو پکڑنا کچھ سیکنڈز میں
تمام پچویشن اس پر عیاں ہو گئی۔ ایک جھٹکے سے وہ
واپس لوٹا۔ وہ فقیر نماز کی نیت کیے ہوئے تھا۔
اصفہان کی طرف اس کی پشت تھی۔

”یا اللہ! اصفہان ابھی تک بے یقین تھا۔“
زلفین خالہ ایسا بھی کر سکتی ہیں۔“ اس کا دل اسے
اولاد کے خون ناحق اور حرا کی حالت پر بلک اٹھا، غم
وغصہ کی لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنی گرفت
میں لے لیا تھا۔

☆.....☆

نورہ خاتون حیران پریشان اس کی بات سن
رہی تھیں۔

”ای کیکن ہی اس سارے فساد کی جڑ ہے۔
اسے اتارنا ہوگا۔“ وہ سوتی حرا کے قریب آیا۔
”نہیں بیٹا یہ اتنا آسان نہیں۔ جیسا ان بابا نے
کہا ہے ہمیں وہی کرنا ہوگا۔“

”مگر زلفین خالہ کیسے تیار ہوں گی۔“
”وہ مجھ پر چھوڑ دو۔“ نورہ خاتون سنجیدگی

سے بولیں اور فون اٹھا لیا۔

”ہیلو زلفین کیسی ہو؟“ وہ بہت عقل اور سنجیدگی سے
ان سے بات کر رہی تھیں۔ ”نرہ کیسی ہے، زلفین ہم بہت
پریشان ہیں ہم نے پھر غلطی کر دی۔ حرا سدا کی منحوس
نرہ کی تھی۔ وہ صرف اصفہان کی خوشیاں کھانا چاہتی
ہے۔“ دوسری طرف زلفین کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ
خوشی سے ناچ اٹھیں مگر بظاہر افسردہ لہجے میں بولیں۔

”کیا بتاؤں آپ مجھے تو یہ پہلے دن ہی ڈائن لگی
تھی مگر آپ بھی کتنی معصوم ہیں، اس چالباز کی باتوں
میں آگئیں۔“

”ہاں ہمیں افسوس ہے بہت۔“ نورہ خاتون کا
لہجہ کانپا۔ ”یہ کیسی بہن تھی جو بہن کی خوشیوں کی دشمن
بن گئی تھی۔“

”اچھا ہم جو کہہ رہے ہیں ذرا غور سے سنو۔“

حرا بید پر دوایوں کے زیر اثر بے خبر سو رہی
تھی۔ اصفہان نے آج ہونے والا واقعہ نورہ خاتون
کو سنایا وہ دونوں اس وقت اصفہان اور حرا کے
کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حنان، حرا کے ساتھ
لگا سو رہا تھا۔ ایک ٹانگ حرا کے اوپر رکھے وہ بے خبر
تھا۔ ان سارے حالات میں حرا اور حنان کی آپسی
محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا بلکہ حرا اسے اور محبت
کرنے لگی تھی۔ نورہ خاتون پر سوچ لگا ہوں سے حرا
کو دیکھ رہی تھیں۔

”اصفہان مجھے بھی یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا
ہے۔ ایک دم سے یہ سب کیسے ہو گیا۔ یقیناً اس فقیر
نے جو کہا اس میں کچھ تو حقیقت ہے ضرور۔“

”اب ہمیں کیا کرنا ہو گا ای۔“ اصفہان
پریشان ہو گیا۔

”پریشان مت ہو بیٹا، یہ مشکلات تو عارضی
ہیں۔ یقیناً ہمارا رب کوئی نہ کوئی رستہ ضرور نکال
دے گا۔ تم ایک کام کرو، دوبارہ اسی جگہ جاؤ کیا
پتا وہ ہی فقیر ہماری کچھ مدد کر سکے۔“ اصفہان
نے سر ہلایا۔

☆.....☆

بہت مشکلوں سے اصفہان اس فقیر تک پہنچا جو
اپنی جھگی میں بیٹھا سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر کھا رہا
تھا۔ اصفہان کو کھڑا دیکھ کر وہ سگرایا۔

”آگے بیٹا۔ آؤ کھانا کھاؤ۔“ اصفہان خاموشی
سے اس کے سامنے جا بیٹھا۔

”کھاؤ نا بیٹا۔“ اس نے شفقت سے روٹی کا
ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔ اصفہان منع کرنا چاہتا
تھا مگر کچھ سوچ کر روٹی تمام لی۔ فقیر نے پانی کا
پالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چپ چاپ روٹی
کا ٹکڑا پانی میں بھگو کر کھانے لگا۔ روٹی حیرت انگیز
طور پر نہایت نرم اور میٹھی تھی جب کہ پانی کا ذائقہ
بہت خوش ذائقہ محسوس ہوا۔ گرم شور بے جیسا.....
تیسرے نوالے کے بعد اصفہان کی آنکھوں کے
آگے دھندلی آگئی۔ یہ طرف خاموشی تھی، بھی کچھ

☆.....☆

نمرہ، زلفین، خاتون، نویرہ خاتون، حرا اور اصفہان اس فقیر کی جھگی میں موجود تھے۔ حرا اور نمرہ نہایت حیرت سے اپنے اطراف دیکھ رہی تھیں جب کہ زلفین خاتون کے چہرے پر وہی وہی خوشی تھی۔ نویرہ خاتون بے تاثر چہرے کے ساتھ وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اصفہان کا چہرہ اندرونی حالت کا گواہ تھا۔ فقیر بابا سر جھکائے کچھ پڑھنے میں مشغول تھے۔ انہوں نے سر جھکائے حرا کو مخاطب کیا۔

”بیٹی حرا اپنے ہاتھ سے یہ سنگن اتار کر اپنی خالہ کو دے دو۔“ حرا نے یہی کیا اور یہ کرنے کے بعد ہی اسے لگا کہ وہ نامعلوم سنگے سے آزاد ہو گئی ہو۔ اس کا چہرہ اور لب مسکرا رہے تھے۔ زلفین خاتون سنگن تھامے بیٹھی تھیں۔

”خاتون یہ سنگن اپنی بیٹی کو پہنا دو۔“ ”جی!“ وہ گڑ بڑائیں۔ اپنے بابا کی تمام ہدایات ان کے کانوں میں گونجیں، فقیر بابا نے چند آرنگا ہیں ان پر گاڑ دیں۔

”کیوں بہت مشکل لگ رہا ہے۔ یہ کرنا۔ بیٹی کی خوشیاں چاہتی ہوں؟ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار نہیں ناں اب کیا ہوا؟“ کیسا رعب و دبدبہ تھا ان کے لہجے میں کہ زلفین خاتون نے بناء کچھ چوں چہ اکیس سنگن نمرہ کو پہنا ڈالا۔ نمرہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ نویرہ خاتون کپکپا میں کچھ بھی ہو، وہ ان کی بھالی بھی جیسے گودوں میں کھلایا تھا۔

”بابا! اس بچی کا کچھ قصور نہیں۔“ ”قصورتو اس بچے کا بھی نہیں تھا۔ بی بی جو دنیا میں آئے بغیر چلا گیا۔“ وہ جلالی ہوئے۔ ”زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جو انسان خود کو اس کی برابری پر لانے کی کوشش کرے وہ صرف سزا کا حقدار ہوتا ہے۔“

اب سارا معاملہ زلفین خاتون پر عیاں ہوا۔ نمرہ جھٹکے لے رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں تمام مناظر

گھومنے لگے جو کچھ زلفین خاتون نے کیا۔ ”ای۔“ وہ تکلیف اور کرب سے چلائی۔ ”ای مجھے بچائیں۔ یہ آپ نے کیا کیا؟ کیوں کیا! وہ سارے مردے مجھے کھینچ رہے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔“ اب نمرہ اپنا گلا پکڑے پکڑے زمین پر گر گئی۔ چہرہ نیلا ہو رہا تھا اب وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے نادیہ مردوں کو گویا اپنے پاس سے ہٹا رہی تھی۔

”بابا بچائیں میری بیٹی کو۔“ زلفین خاتون یکا یک زارو قطار رونے لگیں۔ ”نویرہ آپا مجھے معاف کر دو۔ حرا، اصفہان مجھے معاف کر دو۔ میں خطا وار ہوں۔ مجھے سزا دیں میری بیٹی کا کوئی قصور نہیں۔ وہ معصوم ہے، بے گناہ ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں حراسیت سب پھرائی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

”بابا معاف کر دیں انہیں۔“ حرا نے لاجت سے بیانا کو دیکھا۔

”میں نے انہیں معاف کیا۔ سب معاف کیا۔“ پھول سی نمرہ اب کچھ بھی بول نہیں پا رہی تھی۔ بابا نے کچھ بڑھ کر نمرہ پر دم کیا۔ وہ ساکت ہو گئی خاتون اتار و سنگن اور وبا و پھین۔ انہوں نے زلفین خاتون کو گھورتے ہوئے کہا۔ وہ جلدی جلدی سب کرنے لگیں۔

”شکر یہ بابا۔“ وہ آنسو بھری نگاہوں سے سب کو دیکھ رہی تھیں۔

”تم اور تمہارا وہ شیطان مرشد پھر کوئی حرکت کرو گے۔“

”نہیں سمجھی نہیں۔“ وہ لرز رہی تھیں۔

”اچھا وہ۔“ مسخر سے مسکرائے۔ ”دل میں کیا ہے بی بی وہ بولو! خیر تمہارا مرشد ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیا ہے۔ ہاتھوں سے پیروں سے اور زبان سے اور یہی تمہاری سزا ہے۔“ زلفین خاتون نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر ان کی زبان ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو چکی تھی۔



پانچویں ہولناک کرائی

✓ پیری کا درخت اور وہ



مجید احمد جانی

دیکھتے ہی دیکھتے پیری کا آسیب اس دو شیزہ پر حملہ آور ہوا تھا اور پھر.....

تھے۔ میرا گھر گاؤں میں ہے۔ گھر کے چاروں طرف سرسبز کھیت ہی کھیت ہیں۔ پٹے کے لحاظ سے میں زمین دار ہوں اور دن بھر کھیتوں میں مزدوروں کی نگرانی کرتا رہتا ہوں۔ ان کے ساتھ ٹھوگفتا رہتا ہوں، کام کا کام اور نگرانی کی نگرانی۔

میرا نام خوشی محمد ہے اور گاؤں والے جاگیردار، مزدور، مزارعے ”خوشی۔ خوشی، پکارتے ہیں۔ گاؤں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہوں۔ میرا غریب میری عزت کرتے ہیں۔ غریبوں، مزدوروں کا ہمدرد ہوں۔ یہ بات حیران کن ضرور ہے مگر میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں غریبوں کا دوست ہوں۔

آج سے بیس برس پہلے میری شادی نور النساء سے ہوئی۔ ماں باپ نے ہیرا ہی تو تلاش کیا تھا۔ بہت سندر، خوبصورت نہیں نقش اور سب سے بڑھ کر خوب صورت سیرت تھی۔ میں نور النساء کا ساتھ پا کر بہت خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ قسمت والوں کو اپنی بیویاں عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے

جو کچھ میری نظریں دیکھ رہی تھیں۔ میں حیران تھا۔ میرے پسینے چھوٹ گئے اور جسم کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ دسمبر کی سب سے رات تھی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب طاقت لحافوں میں ٹھو خواب تھی۔ اور۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ آج تک ایسے مناظر میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میری بیٹی ننگے پاؤں، نانٹی میں ننگے سرچن میں لگے پیری کے درخت کی طرف منہ کر کے کسی نادیدہ ہستی سے محو گفتگو تھی۔ سامنے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا میری نظریں دھوکہ کھا رہی تھیں۔ میں چپکے چپکے اُس کی طرف چلتا گیا۔ گھپ اندھیرا اور رات کا پچھلا پہر تھا۔ آخری دنوں کے چاند نے ابھی آنکھ کھولی تھی۔

میں آج اسے ختم کر دوں گا۔ میری عزت کا جنازہ، میرے ہی گھر میں نکال رہی ہے۔ ایسی اولاد سے، بے اولاد ہونا اچھا تھا، میرے ذہن میں جنگ جاری تھی۔

میری بیوی نے گئی ہوئی تھی اور بچے گھر پہ

Downloaded From Paksociety.com



آنکھ میں بچوں کی قفقاریاں بخش دیں۔ رحمتوں کی برسات۔ اللہ تعالیٰ نے تین بیٹیوں سے نوازا۔ ایک بیٹا عطا کیا جو ایک سال بعد واپس اللہ جی کے پاس لوٹ گیا۔ ہم صبر و شکر کر گئے۔ اس کے علاوہ انسان کر ہی کیا سکتا ہے۔ اوپر والے کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر لیا اور میرے ماں باپ بھی تھوڑے عرصے بعد اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ اس مشکل وقت میں نور النساء نے میرا بہت ساتھ دیا۔ لمحہ بھر تنہائی کا احساس نہ ہونے دیا۔

وقت کی تیز آمدھی میں اب بالوں میں چاندی اتر رہی ہے اور میرے بچے جوان ہو رہے ہیں۔ میری تینوں بچیاں نمرہ، اسرار، اور صبا پڑھ رہی ہیں۔ تینوں مجھے جان سے زیادہ پیاری ہیں۔ اسرار سب سے بڑی ہے اور بلا کی خوبصورت بھی۔ اپنی ماں پر گئی ہے۔ اور نمرہ، صبا، بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ میں انہیں بد صورت نہیں کہہ سکتا۔ لیکن

اسرار ان دونوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اسرار یونیورسٹی کی طالبہ تھی اور نمرہ نے ابھی ابھی میٹرک پاس کیا ہے اور اب گھر پہ ہوتی ہے۔ صبا شرارتی، چیچل سی ہے اور آنکھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کی بے بہا بارش کی تھی اور میں خوش قسمت انسان رحمتوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا ہوں۔ میں جہاں کہیں بھی جاتا ہوں۔ میرا دل اپنی بیٹیوں کی طرف ہی رہتا ہے۔ آخر باپ جو ہوں اور بے پناہ محبت بھی کرتا ہوں۔ اپنی بیٹیوں کی ہر فرمائش پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ گھر میں ٹی، وی، کمپیوٹر، اور موبائل تو اسرار اور نمرہ کے پاس ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ میں نے بے جا پابندیاں ان پہ نہیں تھوپی تھیں۔ بے جا پابندیاں ہی جرائم پیدا کرتی ہیں اور برائیوں کی جڑیں یہاں سے پھوٹی ہیں۔ میری بچیوں نے بھی کبھی میرے اعتماد، اعتبار کو ٹھیس

اسکی اسرار کس سے باتیں کر رہی ہے۔
میں آگے بڑھتے ہوئے اسرار سے دو قدم کے
فاصلے پہ تھا کہ میری سماعتوں سے مردانہ آواز
نکرائی۔ اسرار کی آواز تو میں لاکھوں میں پہچان سکتا
تھا یہ آواز اسرار کی نہیں تھی۔ لیکن آواز اسرار ہی کے
منہ سے آرہی تھی۔ میں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے
اُس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ رکھتے ہی
میرے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ سردی کی اس رات
میں پسینے چھوٹ گئے۔ گھپ اندھیرے میں سامنے
کوئی دکھتا ہی نہیں تھا۔

ہاتھ کا لمس پاتے ہی اسرار نے گردن گھمائی
اور میرے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔ میری جنس نکل
گئیں۔ یہ اسرار نہیں۔ خبیث مخلوق کا بھیا نک چہرہ
تھا۔ اس کے پیچھے جس نہ آتا۔ "سامعین پھانسی
آواز آئی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے بھڑک رہے تھے
یہ انسانی آنکھیں۔ گردن نہیں تھیں۔ رات کے گھپ
اندھیرے میں روشن آنکھیں۔ جیسے کسی کالی بلی کی
آنکھیں رات میں چمکتی نظر آتی ہیں۔ دوسرے ہی
لمحے غصے کے بے انداز میں مجھے دھکا سادیا۔

ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اُس کا داہنا ہاتھ
میرے سینے کی طرف آیا تھا۔ لمبے لمبے ناخن اور
برصورت رنگت رات کے اندھیرے میں اور
بھیا نک لگ رہی تھی۔ انگلیوں تک کالے لمبے لمبے
بال تھے۔ میں خوف کے مارے کانپ رہا تھا اور
موت کو قریب دیکھ رہا تھا۔ اُس خبیث مخلوق نے سینے
پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پیچھے دھکیلا اور میں معمولی سی چیز
کی طرح ہوا میں اڑاتا ہوا کسی قبال کی طرح دور جا
گرا۔ گرتے ہی میرے آنکھوں کے سامنے گہری
تار کی چھاتی گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

جب آنکھ کھلی تو خود کو ہسپتال کے بیڈ پہ پایا۔ سر
پہ پٹیاں بندھی تھیں۔ میرے سر مانے نمرہ بیٹھی تھی
اور اسرار پاؤں کی طرف بیٹھی مجھے گھورے جا رہی
تھی۔ نور النیاء میری بیوی زیر لب کچھ پڑھ کر
پھر کت رہی تھی۔ صبا میرے دل پہ ہاتھ کھاتھوں

میرا پیٹیاں میری دوست بھی ہیں۔ ہر بات
دوستوں کی طرح شیئر کرتی ہیں۔ مزے کی بات
بتاؤں۔ اسرار کے ساتھ کانچ میں ایک واقعہ ہوا تو اُس
نے بلا جھجک سنا دیا۔ کسی لڑکے نے اُس کو پھول
پیش کر کے محبت کا اظہار کرنا چاہا تھا اور اُس کا راستہ
بھی روکا۔ لیکن۔ اسرار۔ ہو اور اسراریت نہ
ہو۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ اُس دن کے بعد یہ اسرار طور پر
لڑکا نظر آیا نہ ہی معمول۔

آج جب میری بیوی میٹے میں فوتگی پہ گئی ہوئی
تھی میں بھی ساتھ گیا تھا لیکن واپس لوٹ آیا کیونکہ گھر
میں بچیاں اکیلے تھیں۔ بیوی کو وہیں چھوڑ کر آیا
مجبوری تھی، کسی ایک کا وہاں رکنا ضروری تھا۔

شام کا کھانا اسرار نے پکایا تھا اور سبھی نے پیٹ
بھر کر کھایا بھی۔ کھانا کھانے کے بعد ڈرامہ دیکھنے
لگے۔ ڈرامہ دیکھتے ہی وہ تینوں سو گئیں اور میں اپنے
کمرے میں آ گیا۔ سگریٹ کے کش لیتے لیتے مجھے
بند آئی۔

کسی چیز کے گرنے کی آواز سے میری آنکھ کھل
گئی۔ دوسرے ہی لمحے دروازے کی چڑچراہٹ محسوس
ہوئی۔ جیسے کسی نے دروازہ کھولا ہو۔ میں جاگ
چکا تھا۔ انجانے خیال سے اٹھا اور کمرے سے باہر
نکلا۔ کمرے سے نکلا تو سامنے کا منظر حیران کر دینے
کے لئے کافی تھا۔

میری کے درخت کے سامنے اسرار کسی کے ساتھ
محو گفتگو تھی۔ فخراتی رات میں عامیانا لباس میں اور
سر بھی ننگا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ شاید میری
بے جا محبت کا نتیجہ تھا کہ یہ گل کھل گئے۔ ذہن پہ
ہتھوڑے برسنے لگے اور میں خود کوں رہا تھا۔ بچیوں کو
آزاد چھوڑ دیا تھا تو اب گل تو کھلیں گے۔ میرے
ذہن میں شیطانی خیالات نے زور پکڑ
لیا۔ لیکن۔ لیکن میرے پیٹیاں ایسی نہیں ہیں۔ وہ تو ہر
بات دوست کی طرح شیئر کرتی ہیں۔ ضرور کچھ اور
ہے۔ دل نے کہا۔

میں نے تمام ہمت یکجا کی، دل کو مضبوط کرتے
چپے چپے اُس کے پیچھے جا پہنچا۔ دیکھیں تو

میں آگے بڑھنے تھی۔ کبھی کبھی چہرے مر جھائے ہوئے تھے۔ میرے ہوش میں آتے ہی ان کے چہروں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں ہسپتال کیسے پہنچا۔ معلوم نہیں تھا۔ نور النساء نے بتایا کہ آپ واش روم کے دروازے پہ بے ہوش پڑے تھے اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ جب نمرہ نے دیکھا۔

☆☆☆

وقت گزرتا چلا گیا اور دوبارہ بل بھر میں گزر گئے۔ اس واقعے کے بعد ایسا کوئی واقعہ رونما نہ ہوا اور میں بھی تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ لیکن ایک روز اچانک مغرب کو وال کلاک چلتے چلتے رک گئے۔ اس وقت میں مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے ناٹم دیکھنے گیا تھا اور چند ساعتوں بعد گھڑیاں چل بھی پڑیں۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ناٹم بھی ٹھیک بتا رہی تھیں۔ اسی لمحے چکن میں برتن ٹوٹنے کی آواز آئی۔ جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ میں چکن کی طرف بھاگا۔ کالج کے برتن فرش پر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے اور نور النساء کمرے سے نکل رہی تھی۔ شام کے گھانے کے لئے چکن لایا تھا، نور النساء وہ دھو کر پلیٹ میں رکھ کر کمرے میں اپنا موبائل لینے گئی تھی۔ اب چکن کی طرف آئی تھی اور وہاں کا منظر دیکھ کر وہ بھی سب سے شہرہ گئی۔

”ارے چکن صاف کر کے رکھا تھا۔ کہاں گیا۔“ مجھ سے پوچھنے لگی۔ ”اور یہ کیا۔ برتن کیسے ٹوٹے۔“ وہ اور پھر ہم جان گئے کہ ماجرا کیا ہے۔ چکن کا یوں غائب ہونا کسی خبیث مخلوق کی آمد کا پیغام ہے رہا تھا۔ ہم دونوں چونک گئے۔ ضرور خبیث مخلوق کے کارنامے ہیں۔ مجھے فوراً اسرار کا خیال آیا۔ میں نے اُس کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسرار کے کمرے میں گیا تو میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ نمرہ اور صبا بیٹھی لی، وہ دیکھ رہی تھیں اور اسرار کی آنکھیں بھی خبر نہیں تھی۔ مجھے خدشات نے گھیر لیا۔ میں اسرار کو آہاڑیں دیتے ہوئے حویلی کے پچھواڑے گیا تو میرے قدم ٹھک سے گئے۔ اسرار وہاں کھڑی سامنے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے بال کھلے تھے اور شانوں سے نیچے تک لہرا رہے تھے۔ اسرار سامنے دیوار کی طرف

میں آگے بڑھنے تھی۔ کبھی کبھی چہرے مر جھائے ہوئے تھے۔ میرے ہوش میں آتے ہی ان کے چہروں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں ہسپتال کیسے پہنچا۔ معلوم نہیں تھا۔ نور النساء نے بتایا کہ آپ واش روم کے دروازے پہ بے ہوش پڑے تھے اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ جب نمرہ نے دیکھا۔

”واش روم؟“

میں زیر لب بڑبڑایا۔ میں نے ذہن پہ زور دیا۔ ”نہیں تو۔ واش روم تو میں گیا ہی نہیں تھا۔“ اندر کے انسان نے واویلا کیا۔ نور النساء بتا رہی تھی کہ نمرہ واش روم کے لئے گئی تو آپ کو بے ہوش پا کر زور سے چیخی۔ چیخ سن کر صبا بھی آگئی تھی لیکن اسرار بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ رونے کی آواز سن کر کالو کبھار پاڑے سے دوڑا چلا آیا اور آپ کو اٹھا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اور کالو نے سمجھ واری سے کام لیتے ہوئے کپڑا باندھ دیا تاکہ خون رک جائے۔ اس دوران نمرہ مجھے فون کر چکی تھی۔ خبر ملتے ہی میں دوڑی چلی آئی۔ اذان فجر ہو چکی تھی جب میں گھر آئی۔ پھر آپ کو ہسپتال لے آئے۔“

کالو کبھار حویلی سے تھوڑی دور جانوروں کی دیکھ بھال کے لئے بارڈر میں رہتا تھا۔ بڑا وفادار آدمی ہے۔ کالو کبھار ہی کی وجہ سے میں شاید آج زندہ تھا۔ وہ بروقت نہ پہنچتا تو شانند میں مر کھپ گیا ہوتا۔ نور النساء بتا رہی تھی کہ تین دنوں کے بعد آپ کو ہوش آیا ہے۔ آخر آپ واش روم کے دروازے پہ کیسے گرے تھے اور سر پہ چوٹ کیسے لگی۔ پورے سات ٹاکے لگے ہیں۔ جیسے کسی نے کلباڑی سے وار کیا ہو۔“

سانس بھی لوگی یا ساری باتیں ایک ہی سانس میں پوچھنے کا ارادہ ہے۔ میں نے نور النساء سے کہا تو وہ مسکرا دی اور شرمندہ سی ہو کر خاموش ہو گئی۔

دوسرے دن ہم ہسپتال سے گھر آ گئے اور گزرنے والا واقعہ نور النساء کو سنا دیا۔ اُس کی سسکیاں بڑھ گئیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

احمر اور یہ قاتل جس کو قابو کر دیا تھا تو اس کی سلیبت
سائے آگنی۔ خبیث مخلوق پر قابو پانے کے بہانے
خود خبیث بن گیا اور میری بیٹی کے جسم سے کھیلنا چاہتا
تھا۔ اُس نے اسرار کی طرف پیش رفت کی ہی تھی کہ
اسرار نے کسی قوی ہیکل مرد کی طرح اُس پہ حملہ کر
دیا اور پھر کمرے میں چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ بچاؤ
- بچ۔ بچاؤ۔

پیر جی چیخ رہے تھے۔ بچاؤ۔ بچاؤ کی آواز سن کر
ہم کمرے کی طرف دوڑے۔ دروازہ اندر سے بند کر
دیا گیا تھا۔ چیخوں کی آواز سن کر کالو کمبار بھی آگیا تھا
اور پھر ہم دونوں دروازہ توڑنے میں کامیاب ہو
گئے۔ اندر کا منظر وحشت ناک تھا۔ پیر جی، چیختے چیختے
بے ہوش ہو چکے تھے اور اُس کے جسم پر خراشیں بھی
خراشیں تھیں۔ جیسے کسی خونی راندے نے حملہ کیا
ہو اور اس کا گوشت نوچنا چاہا ہو۔ اسرار کو نے میں
ڈوری، سبھی بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں کسی مردے کی
آنکھوں کی طرح ادھ کھلی تھیں اور دیوار کے سہارے
بیٹھی تھی۔ میں نے اسرار کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ بیٹھی
پہنی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ بے ہوش پڑے پیر
جی کو ہسپتال پہنچایا۔

جب پیر جی کو ہوش آیا تو پھوٹ پھوٹ کر
بچوں کی طرح رونے لگا اور میرے سامنے ہاتھ
جوڑ دیئے۔ "مجھے معاف کر دو۔ مجھے معافی
دے دو۔"

"کس بات کی معافی مانگ رہے ہو؟"
"مجھے سنے بہت بڑی خطا ہو گئی۔ میں کوئی عامل
نہیں۔ میں تو پیٹ کی ہوس میں پیر بن بیٹھا تھا اور
عزتوں سے کھیلتا تھا۔ یہاں بھی میں نے اسرار کی
عزت سے کھیلتا چاہا۔ ابھی تو میں نے اُسے اکیلے
کمرے میں رہنے کا کہا تھا اور آپ کو باہر جانے کا
کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی خبیث حرکت کرتا
، کسی انجانی سی طاقت نے مجھ پہ حملہ کر دیا اور اسرار
کے روپ میں دہشت ناک شکل میں میرے سامنے
تھی۔ اُس نے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی

میری نظریں اُس کی نظر دوسرا کا اتنا قریب کر دی
تھیں۔ حویلی کے باہر کتوں کے جھگڑنے کی آوازیں
آ رہی تھیں۔ کہیں غیر مرئی مخلوق تو نہیں ہے۔ ذہن
میں سوال ابھرا۔ کیونکہ کتے تب بھونکتے ہیں جب
اُن کو جنات نظر آتے ہیں۔ میرے اندر خوف کی لہر
دوڑ گئی۔

ابھی میں اسرار کے قریب نہیں گیا تھا کہ وہ
اچانک لڑکھڑا کر گر پڑی۔ میرے جسم سے جیسے
روح ہی نکل گئی۔ دوڑ کر اسرار کے پاس گیا تو میری
بیٹی ارگرد سے بے خبر بے ہوش پڑی تھی۔ اپنی بیٹی کو
ہمت یکجا کر کے ہانپوں میں اٹھاتے ہوئے کمرے
تک لے آیا۔ شور سن کر نور النساء، نمرہ اور صبا
میرے کمرے میں جمع ہو گئیں اور رونے لگیں۔

ایک تو غور میں ذرا سی تکلیف کیا، کچھ لی روئے
لگ جاتی ہیں۔

رات نے ماحول کو اور خوف ناک کر دیا
تھا۔ ساری رات اسرار کے پاس جاگتے گزر گئی۔

"نور النساء اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح
ہوتے ہی کسی اللہ والے کے پاس جائیں گے۔"

لیکن رات تو ہم یہ بھاری تھی۔ لمحہ لمحہ اذیت
ناک گزر رہا تھا۔ سردیوں کی رات ہم نے جاگتی
آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح اذان فجر ہوئی تو اللہ تعالیٰ
کا نام لے کر عامل کو لینے چلا گیا۔

☆☆☆

شہر میں خانقاہ شریف تھی اور اُس کے پاس عامل
بیٹھے ہوتے ہیں میں وہاں پہنچ گیا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی
کہ یہ جعلی پیر ہیں میرا واسطہ بھی جعلی پیر سے ہی
ہوا۔ جس نے گھر میں آکر طرح طرح کے ڈرامے
کئے اور ہمارے ایمان خراب کرتا رہا اور جمع پونجی سے
بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہم مجبور تھے اور اُسے نوٹوں کی
بیوک تھی۔ جعلی پیر کے جعلی عملوں سے اسرار کی
طبیعت ٹھیک ہونے کی بجائے دن بدن بگڑتی
گئی۔ کھانا کھانے ٹیٹھتی تو دس دس بندوں کا کھانا
اکیلی کھا جاتی۔ لیکن جسم فریہ ہونے کی بجائے سوکھ
سوکھ کر چھڑی نما ہوتی رہا۔ مجبور ہاتھ۔ جعلی عامل بابا

WWW.PAKSOCIETY.COM

چپکے چپکے

ابھی ابھی اک ساتھ ہے ٹوٹا
جانم کیا تم بھولوگی
کلاس کی وہ سب پیاری باتیں
اور شرارت کے سب دن
ان ہی دنوں میں جانم تم نے
چپکے چپکے سب سے چپکے
دل میرا بھی پڑ لیا تھا
ابھی ابھی اک ساتھ ہے ٹوٹا
لیکن مجھ کو بتا دو!
تم بس صرف میری ہی ہونا
ایک یقین مجھے تم دینا
جانم تم بس میری ہو
ساتھ نہیں یہ ٹوٹنے پانے
جہنم جہنم تک ساتھ رہیں گے
چپکے چپکے سب سے چپکے

شاعر: غیاث الدین - پشاور

کے بعد باباجی کو گھر لے آئے۔ باباجی نے حویلی کے
اندر قدم رکھے تو مجھے ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر
آنے لگا۔ جیسے میری حویلی کو کسی نے آگ لگا دی
ہو۔ پھر دھوئیں کے مرغولے چند لمحوں میں ختم بھی ہو
گئے۔ باباجی حویلی کے اندر قدم رکھتے ہی اوپچی ادپچی
آواز میں پڑھنے لگے۔ قرآن پاک کی تلاوت
کرتے ہی پیری کی طرف پل پڑے۔ باباجی پیری
کے درخت کے پاس پہنچے ہی تھے کہ کمرے کا دروازہ
کھڑا سے کھلا اور اسرار ننگے پاؤں دوڑی چلی
آئی۔ اس کی چال میں بے چینی تھی اور آنکھیں شعلے
اگل رہی تھیں۔

کیوں بچی کو قید کئے ہوئے ہو؟ کیا چاہتے

دین اسلام معاف کر دینے کا دروس دیتا ہے
۔ پیر بھی تو یہ کر چکے تھے اور میں نے اللہ اور اس
کے رسول ﷺ کی رضا حاصل کرنے کے لئے
اسے معاف کر دیا۔

کالو کھار کو پہلے گھریلو حالات معلوم نہیں تھے۔
اس واقعے کے بعد وہ سب جان گیا۔ آخر اسے سب
بتانا ہی پڑا۔ اس کے بعد کالو کھار بولا۔
”صاحب۔ میں ایک اللہ والے کو جانتا ہوں۔
بہت پیچھے ہوئے ہیں۔ ان کے دستِ شفقت سے
روتے آنے والے مسکراتے لوٹے ہیں۔ میری بیوی
نیند میں چلنے لگتی تھی۔ اپنے بال نوچتی اور اوپچی ادپچی
خالی دینے لگتی۔ مجھے کسی نے باباجی کے بارے
بتایا تو ہم وہاں گئے۔ انہوں نے دم کیا اور سب خیر
ہوئی۔“

کالو کی باتوں میں سچائی تھی۔ آخر میں اسے
ساتھ لیے ہم باباجی کے پاس پہنچ گئے۔
☆☆☆

ہاں عقدت مندوں کا ہجوم لگا تھا۔ باباجی سفید
لباس میں فرش پہ بچھی چٹائی پہ بیٹھے آنے ہوئے
لوگوں کے مسائل سن رہے تھے۔ ہم بھی جا کر ایک
طرف بیٹھ گئے اور پھر کالو جگہ بنا تے بناتے باباجی
کے پاس پہنچ گیا۔ سورج عین سر پہ آگیا تھا اور ریش
قدرے کم ہو گیا تھا۔

کالو قریب پہنچا تو مجھے بھی قریب آنے کا اشارہ
دیا۔ قریب پہنچے تو عقدت بھر اسلام کیا اور لب کھولے
ہی تھے کہ باباجی مخاطب ہوئے۔

”میں آپ کے آنے کا سبب جان گیا
ہوں۔ واقعی آپ مصیبت میں ہیں اور مسئلہ کھمبیر سا
ہے۔ ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ ایسا کرو۔ ادھر رکو۔ ٹنکر
کھاؤ۔ مغرب کی نماز کے بعد چلیں گے۔ جنات
مغرب کو جاتے ہیں۔ ان سے پوچھ لیں گے کہ کیوں
انسانی مخلوق کو جک کرنے آئے ہیں۔“

میں باباجی کی باتوں سے حیران ہو رہا تھا۔ بغیر
کچھ بتائے باباجی جان چکے تھے۔

مغرب آگے ہم جہیز میں بیٹھے اور کورس بنے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”مجھے اس لیے پیار ہے۔“ عشق کرتا ہوں اس سے۔“ اسرار مردانہ آواز میں بات کر رہی تھی اور ہم قریب کھڑے حیرت زدہ تھے۔

”تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ انسانوں میں آکر ان کو تنگ کرو۔ حد سے بڑھنا عذاب کی طرف اشارہ ہے اور تم خدا تعالیٰ کی حکم عدولی کر رہے ہو۔ آخر تمہارے بھی بچے ہیں۔ کسی کی اولاد کو کیوں تنگ کر کے اپنی اولاد کے لئے عذاب خرید رہے ہو۔“ باباجی۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟“

”جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“

”چلو آزمالو۔ جو جیتا وہی سلطان۔“ باباجی نے قرآنی آیات بڑھتی شروع کر دی۔ اسرار تڑپنے لگی۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں مال کر دوں گا۔“ ”رشوت تم بھی سیکھ گئے ہو۔“ باباجی نے جن کے جواب میں کہا۔

”ایک شرط ہے، میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“ ”کیسی شرط؟“

”تم اس لڑکی سے پیار کرتے ہو تو اس کے سامنے آکر اظہار محبت کرو۔ اگر اس لڑکی سے تیری محبت کو مان لیا تو میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔“

”نہیں! تم جانتے ہو کہ میں اصلی روپ میں نہیں آسکتا۔ اس شرط کے علاوہ دنیا کی جو شرط کہو منظور ہے۔ مگر اسرار میری ہے۔ میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔“

”تم نے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔ تم سزا کے حقدار ہو۔ میں پھر بھی رعایت دے رہا ہوں۔ اگر اسرار تمہاری ہے تو اس کا اقرار اسرار خود کرے گی اگر شرط منظور ہے تو اصلی روپ میں آنا ہوگا ورنہ۔ اسے آزاد کر دو۔“ باباجی نے جن سے کہا۔

”نہیں! میں اصلی روپ میں نہیں آسکتا۔“

اسرار کے سامنے آکر اظہار محبت کرنا ہے تو کسی اور کے روپ میں آسکتا ہوں۔“ ”ہونہ۔“ باباجی۔ نے سوچنے کے انداز میں کہا۔

”نہیں مانو گے۔ اچھا۔ ٹھیک ہے۔ اگر تم بچے ہوئے تو کامیاب ہو گے۔ تم جس کے روپ میں بھی آؤ۔ اسرار کے وجود سے نکل کے اُس کے روپ پر آنا ہوگا۔“

”مجھے شرط منظور ہے۔ لیکن تھوڑی مہلت دو۔“ ”ہاں مہلت ہے۔ رات بارہ بجے تک تمہارے پاس وقت ہے۔“

اسرار میں تبدیلی ہونے لگی اور پھر نیم بے ہوشی کی کیفیت میں میرے سینے سے آگئی۔ اپنی بیٹی کو اذیت میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”میری بیٹی۔“ میں نے اسرار کو سینے سے لگا لیا۔ تپتے ہوئے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

باباجی عشاء کی نماز کے لئے وضو کرنے لگے اور کالو دودھ لینے پاڑے چلا گیا۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ لمحہ لمحہ جن سے کیا وعدہ قریب آ رہا تھا اور میری توجہ جان ہی نکل رہی تھی۔ پھر مقررہ گھڑی آن پہنچی۔ بارہ بجے اسرار کے ساتھ ہم بھی کمرے میں جمع ہو گئے۔ لیکن باباجی نے اسرار کو الگ کمرے میں بھیج دیا اور ہم باباجی کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھے انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ باباجی نے ہمیں کہا کہ وہ آچکا ہے۔

خبیث جن ایک لڑکے کے روپ میں اسرار کے سامنے آن کھڑا ہوا اور گلاب کے پھولوں کا گلدستہ پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”اسرار! اب تو ہاں کر دو۔ کب سے تمہارے پیار میں تڑپ رہا ہوں۔ مجھے اور نہ تڑپاؤ۔ تمہارے لئے گلاب لے کر آیا ہوں۔ محبت کے اظہار کے لئے گلاب ہی سب سے قیمتی تحفہ ہے۔ تم نے گلابوں کا گلدستہ لے لیا تو میں سمجھوں گا کہ تم بھی مجھ سے پیار کرتی ہو۔“

زوردار دھماکہ مچا ہوا، جیسے طوفان آیا ہوا اور اس تیز طوفان میں درخت جڑوں سے اکٹھا کر رہیں یہ آگرے ہوں۔ ہم باہر نکلے تو صحن میں لگا پیری کا درخت گر پڑا تھا اور اس کی جڑیں زمین کی تہہ کو چھوڑ چکی تھیں۔

”لو خوشی محمد۔ سب خیر ہو گئی۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ صبح غریبوں میں خیرات بانٹ دینا۔ اسرار بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اور ہاں شام کے وقت بچوں کو درختوں کے نیچے نہ جانے دیا کرو۔ خاص طور پر پیری کے درخت کے نیچے۔ جنات پیری پر خوشی سے بسرا کھینچتے ہیں۔ یہ جن بچپن سے اسرار کا عاشق تھا۔ شاید تنہیں یاد ہو جب مغرب کے وقت اسرار کھلے بالوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی، پیری کے ساتھ بندھے جھولے پہ جھولے لینے آتی تھی اور تم صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اُسی وقت جن کی نظر اس پہ پڑی اور وہ عاشق ہو گیا۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے بچے بھی تھے۔ میں نے اس کے بچوں کو دیکھتے ہوئے اسے زندہ چھوڑ دیا ہے۔ اس نے بھی وعدہ کیا ہے کہ اب کبھی بھی اسرار کو تنگ نہیں کرے گا۔ اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے یہ دنیا چھوڑ گیا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی بابا جی نے اجازت چاہی اور جانے لگے۔ میں نے بابا جی کا شکریہ ادا کیا اور نذرانے کے طور پر کچھ رقم ان کو تھمائی چاہی۔ لیکن بابا جی نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔

”خوشی محمد۔ میں نے رب کی رضا کے لئے کام کیا ہے۔ یہ رقم غریبوں میں بانٹ دو۔ جو اپنے آقا کی رضا کے لئے کام کرتا ہے اسے کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی۔“

بابا جی چلے گئے اور اب اس واقعے کو کئی سال بیت گئے ہیں۔ اسرار کی شادی ہو چکی ہے اور اپنے گھر میں خوش ہے۔ آج بھی میں اکثر حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ اس سائنٹفک دور میں بھی ہم ارہ راج خیمہ اور جنات وغیرہ سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔

اسرار نے ہاتھ آگے بڑھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اُسی لمحے اس کے دماغ میں بات آئی کہ میں کسی سے پیار نہیں کر سکتی۔ میں اپنے باپ کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ جس نے ہمیں ہر قسم کی آزادی دی اور میں اُن کے اعتماد کو نہیں نہیں پہنچا سکتی۔

زوردار چیخ بلند ہوئی اور اسرار فرش پہ گر تے ہی بے ہوش ہو گئی۔ جن شرط ہار چکا تھا اور پھولوں کا گلہ ستر فرش پہ پڑا خوشبو پھیلا رہا تھا۔ اسرار کے بے ہوش ہوتے ہی کمرے سے دھواں ہی دھواں اُٹھا اور اس کے مرغولے کمرے سے باہر نکل کر آسمان کی طرف جا رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے گھر میں آگ لگ گئی ہو اور ایسا دھواں میری آنکھیں پہلی بار دیکھ رہی تھیں۔ ایسا چند منٹ ہی ہوا اور پھر دھواں ختم ہو گیا اور مرغولے بھی کہیں گم ہو گئے۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ جیسے روحانی طاقت نے دروازہ کھولا ہو۔ کیونکہ جب ہم کمرے میں گئے تو اسرار بے ہوش پڑی تھی اور دوسرا کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا جو دروازہ کھولتا۔ دروازے کا کھل جانا راز ہی تھا۔

بابا جی نے اسرار پہ پانی چھڑکا جو وہ دوسرے کمرے میں بیٹھے قرآن پاک کی سورتیں پڑھ پڑھ کر دم کرتے رہے تھے۔ پانی چھڑکنا تھا کہ اسرار قبیلان کی طرح زمین سے اوپر کی طرف اُچھلی۔

”بڑے ڈھیٹ ہو۔ ہار نہیں مانی۔ تیرا علاج کرنا ہی پڑے گا۔“ بابا جی نے اسرار کی آنکھوں کے پونے کھولتے ہوئے کہا۔

”ابھی تیرا علاج کرتا ہوں۔“ پھر بابا جی، کچھ پڑھتے پڑھتے رُک گئے۔

”یہ ہوئی نابات۔“ اسرار نے آنکھوں کو جنبش دی تو بابا جی بول اُٹھے۔ ”آخر تم نے ہار مان لی۔ مجھے پتا تھا تم ہار جاؤ گے کیونکہ تم سرکش تھے۔ رب کا کلام سچا ہے۔ اب جا ہی رہے ہو تو اپنی کوئی نشانی ہی دیتے جاؤ۔“ بابا جی بظاہر اسرار سے مخاطب تھے لیکن وہ تو جن سے محو گفتگو تھے۔

ہم اسرار کے پاس کمرے میں تھے کہ باہر

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	رخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	ام مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،
جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

چھٹی ہولناک کہانی

سرسوں کا ساگ

ماریہ یاسر

لہلہلا تاسرسوں کا ساگ ہی اس معصوم کے لئے عفریت بن گیا تھا

ابھی تھوڑی ہی دور آئے تھے جب رخسانہ کو گھنے درخت کے نیچے سرسوں نظر آئی جو تیز ہوا کے باعث لہرا رہی تھی۔ اس نے بیٹی کو اشارہ کیا کہ سرین واپسی پر یہاں رک کے تھوڑی سرسوں چن لیں گے۔ دیکھو تو کیسی تازی لگی ہوئی ہے۔

”ٹھیک ہے امی۔“ اس نے سوئے ہوئے عمر کو پیار کرتے کہا۔ ننھی فاطمہ نانی کا ہاتھ پکڑے تیز تیز چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گاؤں کے فسوں خیز ماحول نے عجیب سا سحر طاری کر رکھا تھا۔ ہر طرف سبزہ، شادابی اور ٹھنڈی ہوا۔ سارا گاؤں ہی خوب صورت تھا لیکن اس گھنے درخت کے ارد گرد پھیلے سبزے کی دلکشی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سرین اور رخسانہ اپنے رشہ داروں سے مل کے واپسی کے لیے نکل آئیں۔ اسی درخت تک پہنچ کر اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے ننھے عمر کو گھاس پر لٹا دیا اور فاطمہ کو اس کا خیال رکھنے کی تلقین کر کے خود دونوں سرسوں چننے لگیں۔ وہ دونوں اپنے کام میں مصروف

محمد فیض اپنے بیوی بچوں کے ساتھ 50 کوارٹرز پر مشتمل چھوٹی سی کالونی میں رہتا تھا۔ جب اڑھائی سالہ بیٹی فاطمہ کے بعد اللہ نے اسے چاند سا بیٹا عطا کیا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بیوی سرین اور وہ رب کا شکر بجالائے اور خوب نازوں سے دونوں بچوں کی پرورش کرنے لگے۔ وہ دونوں بچوں میں کوئی تفریق نہ کرتے۔ ہنسی خوشی تھوڑا وقت آگے سر کا جب فاطمہ تین سال کی اور عمر (بیٹا) پانچ ماہ کا ہوا۔

ایک دن سرین کی ماں بیٹی سے ملنے آئی اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد تھوڑے فاصلے پر موجود گاؤں میں اپنے رشتے داروں سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ سرین نے بھی آمادگی کا اظہار کر دیا اور یوں وہ اپنے دونوں بچوں اور ماں کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئی۔ مین سڑک تک گاڑی میں ستر کرنے کے بعد اب وہ چچی سڑک پر پیدل چلنے لگیں۔ لمبی گیڈنڈی نما سڑک تھی جس کے اطراف میں گندم کی فصل لہلہلا رہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

216 سچی کہانیاں

Downloaded From Paksociety.com



☆.....☆
وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزر رہا تھا۔ فاطمہ اور عمر بھی آہستہ آہستہ بڑے ہو رہے تھے۔ سب ٹھیک ہی چل رہا تھا سوائے اس بات کے کہ عمر دن بدن شرارتی ہوتا جا رہا تھا اور جوں جوں وہ بڑھ رہا تھا اس کا رونا اور ضد کرنا بھی بڑھ رہا تھا۔ ابھی نویں سال کو ہی لگا کہ شرارتیں حد سے سوا ہو گئیں جس پر باپ سے کبھی کبھار ڈانٹ بھی پڑ جاتی اور جب فیض غصے میں ہوتے تو ہلکا سا تھپڑ بھی رسید کر دیتے لیکن اس کے بعد تو جیسے آفت ہی آ جاتی۔ عمر پیٹ پکڑے ایسے زور و شور سے رونا شروع کرتا کہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا۔ ماں الگ پریشان، فیض بھی بیٹے کی حالت دیکھ کے چپ کراتے بہلاتے کبھی غصہ کر کے خاموش کراتے لیکن بے سود رہتا۔ اس کا چپ ہونا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ زمین پر

نہیں جب عمر پہلے تھوڑا کسمپاس یا پھر رونے لگا۔ سرین کے ہاتھوں میں تیزی آگئی وہ جلد سے جلد اپنا ساگ اکٹھا کر کے بیٹے کو چپ کرانا چاہتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد عمر کے رونے میں مزید تیزی آگئی۔ رخسانہ بھی نواسے کے رونے پر فکر مند تھیں۔

”چلو بیٹا اب بس کرو عمر بھی رو رہا ہے اور مغرب بھی ہونے والی ہے۔ اب چلتے ہیں۔“ انہوں نے جمع کیا ہوا ساگ شاپر میں ڈالا اور واپسی کو قدم بڑھا دیئے۔

سرین نے بیٹے کو ہر طرح سے بہلا لیا لیکن وہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ کہاں تو وہ انتہائی صابر بچہ جو ماں کو ذرا بھی تنگ نہ کرتا اور اب وہ ایک تواتر سے رو رہا تھا۔ سرین اور رخسانہ دونوں ہی پریشان ہو رہی تھیں۔

ہوا ہی تھا کہ ایک زوردار تپش نے اس کا گال لال کر دیا۔ اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا.....

”آئندہ ایسا کرو گے بولو۔ آئندہ بہن کو اس طرح مارو گے۔“ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ جب کہ نسرین بیٹی کو پیار کرتے بڑی منت بھری نظروں سے شوہر کو دیکھتی گویا بیٹے کو معاف کرنے کی درخواست کر رہی ہو۔ کچھ ہی لمحے گزرے ہوں گے جب عمر زمین پر بیٹھ کے بلکنے لگا اور پیٹ پر رکھا ہاتھ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ درد پھر سے شروع ہو چکا ہے۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں کوئی درد درد نہیں ہوتا بلکہ تم ٹانگ کرتے ہو یہ سب۔“ فیض نے طیش میں کہتے ہوئے غصے سے اسے دیکھا جواب درد سے بے حال ہو کے زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ نسرین کے دل کو کچھ ہوا وہ اٹھ کر بیٹے کی خبر لینے پہنچی تو فیض نے سختی سے اسے روکا۔

”خبردار جو تم اس کے پاس گئیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ اسے احساس ہونے دو کہ کتنا غلط کام کیا ہے آج اس نے۔“ پھر کتنی ہی دیر گزری جب وہ درد سے نڈھال رہتا رہا۔ شام کے سائے بڑھنے لگے تھے جب فیض گھبرا کے اسے اٹھائے ڈاکٹر کے لیے نکلا۔ ڈاکٹر رجن کی کلینک بند تھی سو گاڑی میں سوار ہو کر وہ دوسرے اسپتال جانے لگا۔ گاڑی میں بھی عمر کے رونے میں کمی نہ آئی۔ پاس ہی ایک سیٹ پر بزرگ بیٹھے تھے۔ جب کافی دیر وہ اس کا رونا دیکھتے رہے تو اس کے بارے میں پوچھ بیٹھے۔ فیض نے اس کے درد کے بارے میں بتایا کچھ لمحے تو وہ بغور روتے بلکتے عمر کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

”بہنا میری مانو تو اسے ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت نہیں مجھے تو کچھ اثر لگ رہا ہے اس پر۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کو رکے۔ فیض نے نا جھجی سے بزرگ کی طرف دیکھا۔

”ہاں بیٹا! تم نے خود بھی کہا کہ طرح طرح کے ڈاکٹروں کو دکھا دیا لیکن اثر نہیں ہو رہا تو ایک بار مولانا صاحب کو دکھا کر دیکھ لو۔ مولانا طارق یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہوتے ہیں۔ میری مانو نا ابھی اسے

لینے پاؤں زور زور سے رگڑتا اور روتا جاتا کہ پیٹ میں درد ہے۔ ماں باپ گھبرا کر ڈاکٹر کے پاس دوڑتے، ہر طرح کے میسٹ اور چیک اپ کے بعد ڈاکٹروں کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ سب رپورٹس ٹھیک ہونے کے بعد بھی اس کے درد میں افاقہ کیوں نہیں ہو رہا۔ ڈاکٹروں سے درد کی دوائے کر گھر لوٹ آتے۔ کچھ دیر دوائی کے زیر اثر عمر سوتا تو ان کی جان میں جان آتی۔

یونہی پریشانی میں دن گزر رہے تھے۔ فاطمہ اب 12 سال جب کہ عمر ساڑھے نو سال کا ہو چکا تھا لیکن اب بھی اسے پیٹ کی تکلیف ہوتی تھی لیکن نسرین اور فیض اکثر یہ بات سوچ کر پریشان ہو جاتے کہ عمر درد کی شکایت اسی وقت کرتا تھا جب اپنی کسی شرارت پر ماں یا باپ میں سے کسی سے ڈانٹ یا مار کھاتا۔

☆.....☆

وہ بھی ایک ایسا ہی عام سادہ تھا، جب عمر اور فاطمہ بیٹھے کھیل رہے تھے۔ کھیلتے ہوئے اس کے ذہن میں نہ جانے کیا سامایا کہ اس نے ہاتھ میں پکڑا بلا فاطمہ کے منہ پر کھینچ مارا۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھی اس لیے خود کو بچانہ لگی۔ بلا پوری شدت کے ساتھ اس کے ہونٹ پر لگا اور خون کا ایک فوارہ سا ابل پڑا۔ درد کی شدت سے وہ زور زور سے رونے لگی۔ نسرین جو شوہر کو کھانا دے رہی تھی۔ بیٹی کے رونے پر سب کام چھوڑ چھاڑ کے بھاگی آئی۔ کمرے میں پہنچی تو سامنے کا منظر اس کا دل دہلانے کو کافی تھا۔ فاطمہ کا ہاتھ اور کپڑے خون سے آلودہ ہو رہے تھے جب کہ عمر اس کے پاس بلا پکڑے کھڑا فاح نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نسرین دوڑ کے بیٹی کے پاس پہنچی تب تک فیض بھی اندر آ چکا تھا ایک ہی نظر میں وہ ساری صورت حال بھانپ چکا تھا۔ مارے غصے کے وہ عمر کی طرف بڑھا لیکن معاملے کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی وہ بیٹی کو اٹھا کے پاس ہی ڈاکٹر رحمان کی کلینک پہنچا۔ مرہم پٹی کروا کے گھر پہنچا اور عمر کو آواز دینے لگا۔

”عمر ادھر آؤ۔“

فوراً وہی بلا ہاتھ میں لیے عمر باپ کے سامنے کھڑا

لے جاؤ۔ کیونکہ یہ ڈاکٹر دوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے ڈاکٹر کو دکھانا فضول ہے۔ فیض ان کی باتوں سے متاثر ہو کے پتا پوچھنے لگا اور شکر یہ ادا کر کے مولانا سے ملنے اتر گیا۔

☆.....☆

سید حاساراستہ تھا اس لیے اسے ڈھونڈنے میں مشکل پیش نہ آئی۔ وہ مولانا طارق کے سامنے بیٹھا اب اپنا مسئلہ بیان کر رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کوئی بزرگ ہوگا لیکن سامنے بیٹھے بائیس بیس سالہ نوجوان کو دیکھ کے وہ حیران ہوا تھا۔ مولانا طارق کچھ دیر تو منہ میں کچھ پڑھتے رہے پھر اس پر پھونک مار کے فیض کی طرف متوجہ ہوئے۔

”آپ وہاں کرسی پر بیٹھ جائیں۔“ وہ اسے تھوڑے فاصلے پر بھیج کے پھر سے کچھ پڑھنے لگے۔ پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ عمر کی آواز یکدم سے بدن گئی۔ کہاں تو عمر کی نرمی آواز اور اب کہاں ایک بھاری مردانہ آواز۔ فیض گھبرا اٹھے۔

”کون ہو تم اور کیوں اس بچے کے پیچھے پڑے ہو۔“ اب کے مولانا صاحب بھی غصے سے بولے۔ ”میں تو بہت پہلے اس کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ اس کے ساتھ ہی رہوں گا۔“ بھاری مردانہ آواز میں بہت سختی در آئی تھی۔ مولانا صاحب کچھ پڑھ کر اس پر پھونک رہے تھے جب کہ فیض بیٹے کی اس حالت سے سخت پریشان تھا۔

”میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس ننھے بچے کو چھوڑ کر کہیں دور چلے جاؤ۔“ مولانا صاحب نے حکیمہ کہا۔ ”نہیں میں اس سے دور ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو بہت پہلے سے اس کے ساتھ ہی رہ رہا ہوں، جب یہ چند ماہ کا تھا۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔“ مولانا صاحب کے مسلسل پڑھ پڑھ کے پھونکنے کی وجہ سے اب مردانہ آواز کی سختی عاجزی میں تبدیل ہو گئی۔ فیض کبھی مولانا اور کبھی بیٹے کی طرف دیکھتا اور دل ہی دل میں بیٹے کے لیے دعائیں کر رہا تھا۔

”تمہیں اسے چھوڑ کے جانا ہی ہوگا کیونکہ تم اسے تکلیف دیتے ہو، پریشان کرتے ہو اس لیے تمہارے

بچے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔“ ”نہیں میں اسے بھی تکلیف نہیں دیتا بس مجھ سے یہ نہیں برداشت ہوتا کہ کوئی دوسرا بھی اسے تکلیف دے۔ جب بھی کوئی اسے ڈانٹتا یا مارتا ہے تب میں ان سب کو خبردار کرنے کے لیے اس کے پیٹ میں تکلیف دیتا ہوں تاکہ یہ سب آئندہ اسے کچھ نہ کہیں۔“ عمر کے اندر سے آتی مردانہ آواز نے کہا۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اگر اس کے ماں باپ اسے کچھ کہتے ہیں تو اس کی بھلائی کے لیے تو تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم یوں اسے پریشان کر دو۔ بہر حال میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں اگر آئندہ تم نے اسے دوبارہ پریشان کیا تو میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا تمہیں اس سے دور کرنے میں۔“ مولانا صاحب نے حتمی لہجے میں کہا تو عمر کا سر بھی اثبات میں ہل گیا۔

پھر انہوں نے دس سے پندرہ منٹ کچھ پڑھ کے عمر پر پھونکا اس کے بعد ایک تعویذ لکھ کر فیض کے حوالے کیا اور ساتھ ہی پانی پر دم کر کے دیا۔

فیض اب بھی کچھ غیر مطمئن سا تھا۔ اس نے اپنی پریشانی کا طارق صاحب سے اظہار کیا تو انہوں نے تسلی دیتے کہا۔

”میں نے اسے پابند کر دیا ہے یہ آئندہ عمر کو تنگ نہیں کرے گا۔ آپ بس یہ چالیس روز تک عمر کو پانی پلائیں اور گھر پہنچ کے یہ تعویذ بھی اس کے گلے میں ڈال دیں۔ انشاء اللہ آئندہ بچے کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

انہوں نے عمر کو دیکھا جواب کافی بہتر لگت رہا تھا۔ اس کے بعد سے وہ تعویذ اور پانی کے استعمال سے عمر کے پیٹ میں کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔

آج اس واقعے کو گزرے دس سال ہو چکے ہیں عمر اب چوبیس سال کا ہو چکا ہے۔ دوبارہ اس نے کبھی پیٹ کی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی زندگی نارمل طریقے سے اپنے والدین اور بہن کے ساتھ گزار رہا ہے لیکن مولانا طارق کا دیا ہوا تعویذ اب بھی اس کے گلے میں لٹکا رہتا ہے۔

ساتویں ہولناک کہانی

آخری شرارت

احتشام شامی

شینو پورہ سے اُس نوجوان کی داستانِ عبرت جو کسی اور کی قبر میں اتر کر ایک تجربہ کرنے گیا اور

دوسرا نوجوان مدثر کا دستِ عتیق تھا۔ دونوں کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ عتیق کا تعلق تھا تو گاؤں سے مگر وہ شہر میں رہتا تھا۔ وہ ایک باتونی اور شریر لڑکا تھا جبکہ مدثر کم گو تھا مگر دونوں میں گہری دوستی تھی۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ ایک گھنٹہ تک مغرب کے بعد میت کو دفنانا تھا۔

”کتنا خوفناک ہوتا ہے قبرستان، زندہ انسان تو ایک پل بھی رات کو نارہ سکے یہاں۔ مردوں کی ہمت ہے۔“ عتیق نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمت والی کیا بات ہے ڈیرہ زندہ نہیں ہیں ان کو کیا ڈر، تم بھی عجیب ہانکتے ہو۔“ مدثر نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ عتیق ذرا متاثر ہوا اور برا سامنہ بناتے اپنے موبائل کے میسج چیک کرنے لگا۔ اتنی دیر میں گورکن فارغ ہو کر ان کی جانب آیا۔

”لو بچو! قبر تو تیار ہے۔ جب میت آجائے تو آواز دے لیتا میں ذرا تھوپیڑا ہے میں جا رہا ہوں۔“

وسیع و عریض قبرستان میں موت کا سناٹا تھا۔ اِکا دِکا قبروں پر چند لوگ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ قبرستان کا گورکن ایک جگہ قبر کھودنے میں مگن تھا۔ اُس کے پاس دو نوجوان کھڑے اپنی گپ شپ میں مصروف تھے۔ دونوں کی عمریں بیس سے بائیس سال کے درمیان تھیں۔ ایک لڑکا جس کا نام مدثر تھا تھوڑا سوگوار نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ اس کا کزن قتل ہو گیا تھا۔ وہ اس کے چچا کا اکلوتا جوان بیٹا تھا اور اس کی شادی چند دن بعد طے تھی۔ اس کو کسی نے قتل کر ڈالا تھا۔ قاتل کون تھا یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اُس کے والدین پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ موت برحق ہے مگر ایسی موت کا تصور بھی انسان کو کاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خوشیاں چند قدم کے فاصلے پر ہوں، نئی زندگی کے خواب آنکھوں میں ہو۔ اور زندگی کے ہم سفر کی یادوں رات ساتھ ہو.....

جہاں والدین زندہ و رگور ہوئے وہیں آس پاس کے لوگ سوگوار ہوئے، ہنستا مسکراتا، خوب رو لڑکا چند لمحوں میں خاک میں مل جائے گا۔

www.paksociety.com

وہ کپڑے جھاڑتا مڑ گیا۔ مدثر قبر کے پاس آیا اور اس میں جھانکنے لگا۔

سے بغیر چھلانگ مار کر اندر چلا گیا۔ موبائل مٹی سے اٹ چکا تھا۔ اس نے صاف کیا اور مدثر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مدثر کی مدد سے وہ اوپر آ گیا۔

”میں ایک بات سوچ رہا ہوں مدثر۔“
تھوڑی دیر بعد عتیق یوں بولا جیسے کسی اہم معاملے پر غور و خوص کر رہا ہو۔ مدثر نے ناک پر سے مکھی اڑانے والے انداز میں اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اگر میت کے ساتھ موبائل رکھ دیا جائے۔“
مدثر کے گھورنے پر اس نے یکدم بات کو سنبھالا۔

”اچھا میں بات کو دوسرے رخ سے سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر موبائل کو اندر لے کر میں لیٹ جاؤں اور تم اوپر سے بند کر دو تو جانے پھر سنگل آئیں گے یا نہیں۔“ داد طلب نظروں سے وہ مدثر کو دیکھ رہا تھا۔

”پتا نہیں فرشتے حساب کیسے لیتے ہوں گے۔ میں سوچ رہا ہوں اور کب لیتے ہوں گے۔“ عتیق نے فضول ہانکی پیچھے سے آ کر اور مدثر کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”عتیق فضول سوال کرنا بند کرو خدا را! یہ سب مرنے کے بعد دیکھ لینا۔“ مدثر ناگواری سے بولا۔
عتیق چند سیکنڈ کے لیے چپ ہو گیا وہ قبر کے پاس کھڑا تھا۔ ایس ایم ایس آیا موبائل واٹیریٹ پر تھا اپنے خیالوں میں کھویا تھا۔ واٹیریٹ ہونے پر وہ ڈر سا گیا اور موبائل پچسل کر قبر میں گر گیا وہ بوکھلا گیا۔

”تم سے کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہو سکتا عتیق۔“
مدثر نے افسوس سے سر ہلایا۔

”اب اس میں میرا کیا قصور ہے غلطی سے گر گیا ہے چلو نکالنے میں میری مدد کرو، میں اندر کودتا ہوں



Downloaded From
Paksociety.com

SOCIETY.COM

”ایسا تجربہ تم خود کر کے دیکھ لینا۔ ابھی میرا دباؤ مت کھاؤ۔“ مدثر نے موبائل نکالا اور گھر کا کال کر کے پوچھنے لگا کہ جنازہ کب تک آئے گا۔ بات کرتا وہ ٹھوڑا روپڑا پتھر کے اوپر بیٹھ گیا۔ عتیق وہیں کھڑا سوچوں میں گم کھڑا رہا۔

”کیا تم یہ بھاری سلیں اٹھا لو گے مدثر؟“ اس نے قبر کے پاس پڑی تین چار سلوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہاں اٹھا لوں گا اس میں کیا بات ہے زیادہ وزنی تو نہیں ہوں گی۔“ مدثر کافی صحت مند سا تھا بلکہ جسم بھی جاتا تھا۔

”پھر یوں کرو میں اندر لیٹا ہوں تم یہ اوپر رکھ دینا میں تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔“ مدثر اپنی جگہ سے اٹھ کر پڑاؤس نے عتیق کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”عتیق! بس کرو یہ کوئی مذاق نہیں ہے تم حد سے بڑھ جاتے ہو کبھی کبھی۔“ عتیق کوئی اثر لیے بغیر قبر میں جھانکتا رہا۔

”کبھی تو میری بات کو سمجھا کرو مدثر میری جان! ایڈ ونچر بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جب تک جنازہ نہیں آتا یہ ایڈ ونچر کرتے ہیں۔“ عتیق نے اس کے سامنے آ کر اس کے گلے میں دونوں بازو ڈالے اور منانے کی کوشش کی۔

”خوب جانتا ہوں میں تمہارے ایڈ ونچرز کو بس کرو یار۔“ اس نے بازو ہٹاتے ہوئے اکتا کر کہا۔

”تو تمہیں کیا مسئلہ ہے یار، دیکھو پانچ منٹ کی بات ہوگی، میری خاطر مان جاؤ خدا را میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی شرارت نہیں کروں گا۔ یاد کرو گے میری شرارتوں کو پھر۔ عتیق جانتا تھا مدثر زیادہ دیر تک انکار نہ کر سکے گا۔ مدثر زچ ہو گیا چند منٹ بعد مان گیا۔

”دیکھو مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، کچھ بھی غلط ہو سکتا ہے اور کوئی اور بھی آ سکتا ہے کتنی ڈانٹ پڑے گی۔“ عتیق کھل اٹھا تو مدثر تشویش میں بولا۔

”کچھ نہیں ہوگا بس چند منٹ کی بات ہے۔“

پھر دونوں سلیں اٹھا کر قبر پر رکھنا شروع کر دیں چار

سلیں نہیں۔ عتیق پر جوش تھا تین سلیں رکھ کر چوتھی وہ قریب لے آئے۔

”اب میں اندر جاتا ہوں تم یہ اٹھا کر اوپر رکھ دینا۔“ وہ جلدی سے قبر میں اتر گیا۔

”مٹی بھی نا ڈال دوں اوپر۔“ مدثر دانت کچکچا کر بولا اور عتیق ہنس پڑا۔

”ٹھیک ہے تم مٹی ہی ڈال دینا تمہیں اجازت ہے۔“ مدثر نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر اس نے چوتھی سل اٹھائی۔ اس کا خیال تھا زیادہ وزنی نہیں ہوگی مگر اکیلے اٹھاتے ہوئے اسے پسینہ آ گیا۔ کچھ خوف سے اور کچھ وزن سے۔ قبر کو ڈھانپ کر چند سیکنڈ اس نے سانس لی اور موبائل نکال کر عتیق کو بیچ کیا۔

”سناؤ فردے صاحب آخری آرام گاہ کیسی لگ رہی ہے۔“ چند سیکنڈ جواب کا انتظار کیا۔

”کیا فرشتوں سے مذاکرات کرنے لگے ہو۔“ اگلا بیچ۔

”کبھی کیڑے تو نہیں آ گئے۔ سنا ہے قبر میں وہ بھی ہوتے ہیں۔“ اس سے اگلا۔

”عتیق! جواب دو ورنہ میں اٹھا لوں گا۔“ تین منٹ گزر گئے جواب نہ دار اس نے کال ملائی۔

”آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب نہیں آ رہا۔“ اور اسے غصہ آ گیا۔

”حد ہوتی ہے اسے باہر نکلنے دو میں اسے آج زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ نمبر ہی بند کر دیا۔“ اس نے قبر کے اوپر ہی سے گھورا۔ جیسے وہ دیکھ رہا ہو۔ موبائل جیب میں ڈال کر آگے بڑھا اور سل پر ہاتھ ڈالا مگر۔

اس نے اپنا سارا زور لگا دیا مگر سل نہیں اٹھا پایا۔

”اُف یہ کیا ہو رہا ہے، شاید گھبراہٹ میں یا مٹی میں پھنس گئی ہے۔“ اس نے جھنجھلا کر ایک بار پھر کوشش کی مگر ناکام خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔

”اب کیا کروں، گورکن چچا کو بلا کر لاتا ہوں۔“ وہ گورکن کی جھونپڑی کی طرف بھاگا جو قبرستان کے قریب ایک اختتام پر تھی، احمادیاں پھلا لگتا تھا بھاگ کر وہ

جھونپڑی کے پاس پہنچا اور زور سے جھلایا۔
 "جا چا! کہاں ہو تم۔" جھونپڑی کپڑے کی بنی
 تھی، گورکن کا گھر پاس ہی تھا مگر زیادہ تر وہ یہاں
 چارپائی ڈالے لیٹا رہتا۔ وہ کپڑا ہٹا کر اندر داخل
 ہوا۔ گورکن چارپائی پر متوحش سا بیٹھا تھا۔
 "جا چا! میرے ساتھ چلو، خدا کے لیے میرے
 دوست کو بچاؤ وہ مر جائے گا۔" مدثر تقریباً رو پڑا۔
 "کیا ہو گیا ہے پتر! سانپ نے تو نہیں ڈس لیا
 میں نے اتنا بُرا خواب دیکھا کبھی۔" وہ جھرجھری
 لے کر بولا۔

"آپ میرے ساتھ چلیں بس پلیز۔" مدثر نے
 ان کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ وہ معاملہ سیریس دیکھ کر جلدی
 سے اس کے ساتھ ہو لیے اور جب قبر پر پہنچے تو دمک
 رہ گئے۔

"کہاں ہے تمہارا دوست۔" گورکن نے
 حلقائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سوالیہ نظروں
 سے مدثر کو دیکھا۔ اس نے انگلی سے قبر کی طرف
 اشارہ کیا اور گورکن حیران رہ گیا۔

"میری مدد کر بس یہ سلیس اٹھا کر میرے دوست
 کو باہر نکالیں۔" گورکن کی آنکھوں میں کئی سوال
 تھے مگر اس وقت اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ دونوں
 مل کر سلیس اٹھانے لگے۔ مگر ناکام۔ دونوں نے
 اپنا پورا زور لگالیا مگر چاروں میں سے کوئی بھی سہل
 اپنی جگہ سے نہ ہٹی۔ مدثر اب صحیح معنوں میں کانپ
 گیا۔ خوف کی لہر دونوں کے جسم میں دوڑ گئی۔

"یہ کیا کیا تم لوگوں نے۔ اب کیا ہوگا۔ میرے
 ساتھ مذاق تو نہیں کر رہے۔" مدثر نے سر ہلایا انکار
 میں اور زمین پر بیٹھتا چلا گیا اس کی ٹانگوں سے جان
 نکل رہی تھی۔ وہ جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔
 موبائل پر بیل بجی تو اس نے جلدی سے جیب سے
 نکالا۔ ایک امید۔ ایک آس۔ دل خدشات سے
 دھڑک رہا تھا۔ مگر کال اس کے بڑے بھائی کی تھی۔
 "شاہد بھائی! پلیز جلدی سے یہاں آ جا میں وہ
 عشیق کو..... بات ادھوری چھوڑ کر بھوٹ پھاٹ کر
 رو دیا۔"

کیا بتاتا؟ اس نے عشیق کو زندہ دفن دیا۔ محض
 ایک ایڈونچر کی خاطر۔ محض عشیق کی باتوں میں آ کر۔
 بتانے کو کچھ تھا نہیں۔ عشیق کا ہنسا مسکراتا چہرہ اس کی
 نگاہوں میں گھوم گیا اور وہ ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔
 ☆☆☆

اس واقعہ کو ایک ماہ گزر گیا۔ مدثر کی حالت اب
 قدرے بہتر تھی مگر وہ چپ چپ رہتا تھا۔ اس کے
 بے ہوش ہونے کے بعد گورکن نے شاہد بھائی کو
 ساری صورت حال سنائی۔ شاہد بھائی دو چار بندوں
 کو لے کر وہاں پہنچ گئے۔ قبر سے سلیس اٹھانے کی ہر
 طرح کوشش کر لی مگر..... فوری طور پر دوسری قبر
 تیار کی گئی۔ شاہد نے گھر ابو کو بتا دیا۔ عشیق کے گھر
 والوں کو یہ سب بتانا سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ ایسے
 میں جب مدثر بے ہوش ہو چکا تھا۔ بات واضح نہیں
 تھی کیا مدثر نے عشیق کو قتل کر کے اندر ڈال دیا؟ مدثر
 کے ابو نے فوری طور پر عشیق کے والد کو کال کر کے شہر
 پہنچنے کو کہا۔ جب وہ آئے تو مدثر بھی ہوش میں آ چکا
 تھا۔ اس نے انکے ہوئے ساری بات شروع سے
 بتا دی۔ عشیق بے والدین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ
 مدثر کی بات کا یقین نہ کرتے مگر ایک سوال ہر کسی کی
 زبان پر تھا ہر کسی کے ذہن میں تھا۔ قبر سے سلیس کیوں
 نہیں ہٹ رہی تھیں؟ کیا پراسراریت تھی ان میں؟
 کیا اللہ کی حکمت؟ ایسی باتوں پر مذاق کرنے والوں
 کا انجام؟ اور بہت سے سوال ذہن میں جنم لیتے مگر
 مدثر کے ذہن میں عشیق کی آخری باتیں گونجتی رہیں۔

"میں آئندہ کوئی شرارت نہیں کروں گا یاد
 کرو گے میری شرارتوں کو۔"
 "ٹھیک ہے تم مٹی ہی ڈال دینا تمہیں
 اجازت ہے۔"

"مدثر میری جان ایڈونچر بھی کوئی چیز ہوتی
 ہے۔" اور اپنی کہی بات میں اسے آج زندہ نہیں
 چھوڑوں گا۔ اور اس نے واقعی زندہ نہیں چھوڑا تھا۔
 وہ رونے لگتا چیخنے لگتا پھر خود ہی سنبھل جاتا۔ وہ مٹی
 نہیں ڈال سکا مگر دفن وہ کر چکا تھا۔
 ☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

آٹھویں ہولناک کہانی

آسیہ کون تھی؟

مہر پرویز احمد دولو



پوری بستی میں کوئی نہ جان سکا کہ ان کے ساتھ رہنے والا وہ خاندان کون تھا

باز نہ آتا، عزتوں سے کھیلنا اس کا مشغلہ تھا۔ کتنی ہی معصوم
کلیوں کو روند چکا تھا۔

آج جب آسیہ ماں اور بہنوں کے ساتھ کیاں کی
چنائی کے لیے اسلم کے کھیتوں میں پہنچی تو اسے دیکھتے ہی
اسلم کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ اس بات پر سخت حیران
اور کسی حد تک غصے میں بھی تھا کہ اتنی حسین لڑکی اس کی
آنکھوں سے اوجھل کیوں رہی۔ اب تو وہ روز آسیہ کے
آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اس حد تک اس کا شیدائی ہو
چکا تھا کہ شام کو بہانے سے ان کے گھر جاتا اور اگلے دن
روٹی کی چنائی کی اطلاع دے آتا، اس دوران آسیہ کی
دید کر کے آنکھوں کی پیاس بھی بجھا آتا۔

آسیہ جو نہی کھیت میں پہنچتی اسلم پروانے کی طرح
اڑائیں بھرنے لگتا اسی کے ارد گرد پھرتا رہتا اور پھر ایک
دن پھر اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ دل کے ہاتھوں
مجبور ہو کر کیاں کے لمبے پودوں کے درمیان اکیلا پاتے
ہی اس نے آسیہ کو پہنچ کر خود سے لگانا چاہا تھا۔

چھوٹنے کی دیر تھی کہ اسلم کو یوں لگا جیسے اسے بجلی کا بہت
بڑا جھوٹا بجھکا ہوا گھبراہٹ پور جسم ہول میں بل کوانے لگا۔ آنکھوں

لڑکی نہیں وہ آفت کی پرکالہ تھی۔ حسن کا منہ بولتا
ثبوت، رنگ گورا چٹا، سیال بال ناگن کی طرح لہراتے۔
بہنوں میں اس کا تیسرا نمبر تھا لیکن خوب صورتی میں پہلے
نمبر پر تھی چونکہ غریب خاندان سے اعلیٰ رکھتی تھی اس لیے
مقدر کی لکیروں سے مات کھاتی آرہی تھی۔

پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے مزدوری کی چکی میں
پس کر ریزوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ سردیوں میں منہ
اندھیرے اٹھ کر والدہ اور بہنوں کے ساتھ رات کا بچا
کھچا کھانا کھا کر کیاں کی چنائی کو نکل پڑتی۔ سخت سردی
میں ہاتھ پاؤں ٹھٹھرتے، دانت پر دانت بکتے، پرانے
کپڑے کی جھولی بنا کر پیٹھ لڑکا کر کیاں کے سفید سفید
گوٹے اتار کر جھولی میں ڈالتی جاتی۔ شام تک سبھی بہنوں
کی بہت زیادہ روٹی اکٹھی ہو جاتی۔

اجرت کے طور پر ساری روٹی کا سولہواں حصہ ان کو مل
جاتا، یوں ہزار سے دو ہزار روپے تک کی دیہاڑی لگ جاتی۔

☆.....☆

اسلم، وڈیرے کا لاڈلا بیٹا تھا جس چیز پر دل آ جاتا
آسانی سے حاصل نہ ہوتی تو چھین لیتا۔ بارود سناڑے کی

جو نہی شام کو مزدوری دینے کا وقت آیا اس نے نہ آئیہ اور اس کی بہنوں کو بہت تھوڑی مزدوری دی، اتنی پر بس نہ کیا بلکہ ان پر چوری کا الزام لگایا اور آئندہ کھیتوں میں آنے سے روک دیا۔

اسلم کی دھمکیوں کو سن کر آئیہ بہنوں کے ہمراہ گھر کو روانہ ہو گئی۔ ابھی یہ لوگ راستے میں ہی تھے کہ روٹی کے ڈھیر سے دھواں اٹھنے لگا، لمحوں میں دھواں آگ میں تبدیل ہو گیا اور ساری کپاس جل بھن گئی۔

کے آگے تار پڑا پڑنے لگے، جسم میں جیونیاں رو گئیں۔ جوتے یوں تپنے لگے جیسے آگ کی بھٹی میں گرم کیے جا رہے ہوں، آگ کی تپش پورے جسم کو پگھلانے لگی، اس نے بھاگنے میں عافیت جانی اور وہ جونہی بھاگ کر کھیتوں سے دور نکلتا تب اس کو سکون محسوس ہوا۔

اس ناگفتہ بہ صورت حال نے اسے سخت غصے اور ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ تو آئیہ کو پیس کر سرمہ بنا دیتا۔ یہ غصہ اس نے یوں نکالا کہ



یہ صورت حال دیکھ کر اسلم اور اس کے گھر والے سخت پریشان ہو گئے۔ انھوں میں ہزاروں کا نقصان ہو گیا۔ اسلم کی آنکھوں کے سامنے دن کا واقعہ گھومنے لگا، روٹی کو آگ لگنے کی وجہ بھی اس نے آسیہ کی کارستانی سمجھی، اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ آسیہ اس کی ماں اور بہنوں کو پکڑ کر لاؤ، روٹی کو آگ انہوں نے لگائی ہے۔“

نوکر بھاگ کر گئے اور راستے میں ہی انہیں جالیا اور انہیں پکڑ کر اسلم کے ڈیرے پر لے آئے، وہ غصے سے بیچ و تاب کھا رہا تھا، انہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔ اس نے فوراً ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے کا حکم دیا۔ ہاتھ پاؤں باندھنے کے بعد انہیں زمین پر لٹا کر ڈنڈوں سے مارنے کا حکم دیا۔ نوکروں نے ڈنڈے پکڑ کر جو نبی مارنے کے لیے ہوا میں لہرائے وہ سیاہ ناگوں کی صورت اختیار کر کے باتھوں سے پھٹک گئے جب کہ ہاتھ پاؤں کی رسیاں خود بخود کھل کر ننھے ننھے سنیوں کی شکل اختیار کر کے زمین پر پڑنے لگیں۔ جب کہ ناگ اسلم اور نوکروں کے گرد گھیرا تنگ کر کے پھنکارنے لگے۔ ان کی پھنکار سے آگ کی بارش ہونے لگی جو ان لوگوں کو جھلانے لگی۔ گرمی کی چش ان کی ہڈیوں کو پگھلانے لگی اب تو سب ڈیرے سے بھاگنے لگے۔ جدھر منہ اٹھا ادھر سے ہی جانے میں سب نے عافیت جانی۔



گاؤں سے باہر کھلے میدان میں لب و لبا بابا نقوشاہ نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ پیر تو اسے ایک حادثے نے بچے پر مجبور کر دیا ورنہ وہ تو علاقے کا انتہائی بدلتاش آدمی تھا، گھریلو ذمہ داریاں نہ ہونے کی وجہ سے آوارہ بدچلن نوجوانوں کا سرغنہ بن گیا تھا۔ آئے روز کی چوری چکاری کرنا اس کا وطیرہ تھا۔ صنف نازک اس کی کمزوری تھی۔ اس نے جھوٹ، مکاری اور چوری سے کمائی گئی رقم لڑکیوں پر نچاؤ کر کے انہیں اپنے جال میں پھنسا رکھا تھا۔ کئی لڑکیوں کے گھر والوں نے اس کی کئی دفعہ ٹھکانی بھی کی مگر وہ اپنی کمینگی سے باز نہ آیا۔ گھر والوں نے اس کی قریبی عزیزوں میں ایک بہت ہی خوب صورت دوشیزہ سے شادی کی مگر اسے تو تنگی کی مانند رس چوسنے کا شوق تھا، سو بیوی سے نباہ نہ ہو سکا اور اسے طلاق دے دی۔

گھر والوں نے اتنا بڑا انتہائی قدم اٹھانے پر اسے عاق کر کے گھر سے نکال دیا اور تمام لوگوں کو بتا دیا کہ اسے

اچھے برے کا یہ خود فیہ دار ہے۔ ہم اس کے کسی بھی قول و فعل کے ذمہ دار نہیں۔ گھر کا اسرا چھن جائے پر اس نے دور کے گاؤں میں ڈیرا ڈال لیا۔ سبز چوغہ، موٹے دانوں والی تسبیح، مٹکے اور ہاتھوں میں گول گول کڑے، سر پر مختلف رنگوں کے کپڑوں کی بنی ٹوپی پہن کر وہ بابا نقوشاہ بن کر لوگوں کے دکھ درد دور کرنے لگا۔ بدلے میں اسے بہت کچھ مل جاتا۔ دنوں میں ہی علاقے میں اس کی شہرت ہو گئی۔ کتنی ہی بائگی ناریاں اس کے حجرے کی زینت بننے لگیں۔ پرانی دوست خواتین تک وہ اپنی حالت زار پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ کرامات کا خوب ڈھنڈورا پیٹا اور یوں اس کے ارد گرد حاجت مندوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ مقامی زمیندار کی اسے خاص آشریاد حاصل تھی۔ وہ اس کے خاص مریدین میں شامل تھا، اس کا ایک ایسا کام نقوشاہ نے کیا تھا جو کوئی بھی عامل اور پیر بابا نہ کر سکتا تھا۔

نقوشاہ کی مشہوری سن کر مقامی زمیندار بھی ایک دن زیارت کو نکلا۔ وہ یہاں جنگل میں متنگل دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کتنی ہی حسن کا شاہکار حسینا من نقوشاہ کے پاؤں میں پڑی حاجات کی تسکین کے لیے گریہ زاری کر رہی تھیں۔

وہ حسینا من جو گاؤں میں کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھیں یہاں شاہ جی کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ ان میں ایک ایسی دوشیزہ بھی تھی جس نے زمیندار کی سر راہ خوب بے عزتی کی تھی۔ زمیندار کو اپنی سناٹھ بچانے کے لیے باقاعدہ پنچایت کے سامنے اس سے معافی مانگنی پڑی تھی۔ اس حسینہ کو دیکھ کر زمیندار کا خون کھولنے لگا، انتقام کے شعلے آنکھوں سے آگ کی صورت میں نکلنے لگے۔ زمیندار نے نقوشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید خاص ہونے کا شرف حاصل کیا۔ بدلے میں کافی نذرانہ دیا اور متعلقہ حسینہ کو پانے کے لیے کالا بکرا، دس ہزار روپے اور سونے کی انگوٹھی نقوشاہ کے حضور پیش کر دی اور مزید نوازشات کا بھی اقرار کیا۔

اتنا کچھ پاتے ہی نقوشاہ کی باچھیں کھل گئیں اور پھر ایک رات سیاہ گھپ اندھیری رات کو اس حسینہ کو بلا کر زمیندار کی بیچ کی زینت بنا دیا۔

اس مہربانی کے بدلے زمیندار نے ایک کنال رقبہ

نہو شاد کو حجرہ بنانے کے لیے دیے دیا تھا اور اس کی مشہوری کی رہی تھی کسری پوری کر دی تھی۔

اس دن کے بعد سے نہو شاہ کا طوطی ارد گرد کے گاؤں میں بولنے لگا۔ جوق در جوق لوگ آکر اپنی منتیں پوری کرنے لگے۔ ہر طرف نہو شاہ کی شہرت کے چرچے تھے۔

☆.....☆

اسلم آسیہ کی کارستانیوں سے سخت پریشان تھا۔ اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب کہ آسیہ کا انتقام روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ کتنا ہی مالی نقصان اسلم اٹھا چکا تھا۔ ہر اسام اور خوف زدہ الگ تھا۔ ہر پل خوف کے سائے اس کے سر پر لہراتے رہتے۔ اس صورت حال سے نجات پانے کے لیے بہت سے دوستوں سے مشورہ کیا لیکن بات نہ بن سکی۔

نہو شاہ کی شہرت کا بچتا ہوا ایک دن اسلم نے بھی سن لیا۔ فوراً ہی نہو شاہ کے حجرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ مرید خاص کی مشقی گرم کرنے کے بعد شرف ملاقات کی سعادت حاصل کی آسیہ کی بے اعتنائی انتقامی کارروائی اور اپنے نقصان کا رونا روایا۔ آسیہ کو عبرت ناک سبق سکھانے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کا وعدہ کیا۔ نہو شاہ کی ہدایت پر اگلے دن سیاہ بکرا، کستوری اور زرد رائے کی صورت میں پیسے لے کر حاضر ہو گیا۔ یہ سامان پاتے ہی شادی خوشی سے نہال ہو گئے۔ حق ہو کا نعرہ لگایا۔ سمجھ نہ آنے والی زبان میں اول بول بکنے لگا۔ ان لغویات سے فارغ ہونے کے بعد سفید کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں مار کر تعویذ لکھ کر اسے دیا اور اپنے پاؤں کے پاس بیٹھ کر ایک خاص قسم کا ورد کرنے کا حکم دیا۔ اسلم نے آنکھیں بند کیں، نہو شاہ کے پاؤں کی دھول کو پیشانی پر مل کر چہرہ خاک آلود کیا اور ورد کی صورت میں آسیہ کے نام کی مالا جپنے لگا۔

ورد کرتے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ نہو شاہ کے بالوں کی لٹیں کسی جانے لگیں۔ بال کھینچنے کی وجہ سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اسلم کے چہرے پر پاؤں کی لٹی ہوئی خاک مرچوں کی طرح جلد کو جلانے لگی۔ ابھی دونوں تکلیف کی اذیت میں مبتلا تھے کہ یکدم حجرے کی چھت دھڑام سے نیچے آ رہی، یہ دونوں چھت کے سامان کے نیچے دب گئے۔ چیخنے پر آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ باہر بیٹھے مریدوں نے اس المناک صورت حال کو دیکھتے ہوئے چیخ و پکار کی۔

سکھ کو فوج کیا گیا۔ ان جوانوں نے آکر ان دونوں کو لمبے کے پینے سے نکالا اور قرہی اسپتال میں پہنچایا جہاں ان کے زخموں کو صاف کیا گیا، دوائی وغیرہ دلائی گئی۔ خون کی بوتلیں اور دیگر دوائیاں دی گئیں۔ تیمارداری سے کافی حد تک ان کی طبیعت سنبھل گئی۔ سکون آور دوائی کھلانے سے نہ صرف ان کا درد ختم ہو گیا۔ وہ سکون محسوس کر کے خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔ ان کو سوئے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ان کے جسم کا نظام اچانک جامد ہونے لگا، سانس بند ہونے لگی۔ آنکھیں اندر کو دھنسنے لگیں۔ پاؤں میں کھجلی ہونے لگیں۔ جسم میں چیوٹیاں رینگنے لگیں۔ نرم بستر آگ کی طرح تنے لگا۔ کرب میں مبتلا ہوتے ہی ان کی چیخیں جھپٹ کو پھاڑ کر باہر جانے لگیں۔ رورو کر ان کا برا حال تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آگ میں جل رہے ہوں اور زندگی کے بچاؤ کے لیے آخری بار ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں۔ وہ جسم کو نوح نوح کر خون نکالنے لگے تھے۔

ابھی دیر میں انہیں لگا جیسے آسیہ سامنے آئی ہے۔ ”کون ہو تم؟“ وہ دونوں حالت جگرک میں مبتلا چلائے۔ ”میں..... میں وہی ہوں جس کو پانے کے لیے تم نے ہر تھکنڈا اپنایا تھا۔ کاش تم جان سکتے کہ ہر چیز کو حاصل کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ دولت سے سب کچھ نہیں خریدا جاسکتا۔ تم خدا پر ایمان رکھتے ہو مگر صرف اپنے مطلب کے لیے۔ خدا نے ہر مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ کاش تم لوگ اپنے نفسی جذبات پر قابو پا کر اس مالک دو جہان کو یاد کر لیتے تو اس انجام کو نہ پہنچتے۔“ ”آسیہ تم.....! ہمیں ایک بار معاف کر دو۔“ کسی پچھو نے جیسے دونوں کو ڈسا تھا۔

”ہا ہا ہا..... میرا پروردگار سب سے بڑا منصف ہے۔ وہ رحمن ہے، رحیم ہے۔ میں اس مالک کے انصاف پر عیش عیش کر انھی ہوں۔“

یہ کہہ کر آسیہ یکدم ہوا میں تحلیل ہو گئی اور ان دونوں کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا اور ظالم اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے مگر آج تک کسی کو یہ راز نہ معلوم ہوسکا کہ آخر آسیہ اور اس کا خاندان راتوں رات کہاں چلے گئے تھے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

227

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”نئی کہانیاں“ کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”نئی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپرد ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دعا اور مسکین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اشاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپرد ڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/- روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”نئی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی خواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات ٹو کین منی 300/- روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

=====

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جوئے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”نئی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

=====

88-C II۔ خیابان جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ایک اور رمضان شریف اختتام پذیر ہوا۔ میں ان تمام بچوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے عید کی خوشیوں میں اپنے دیگر مسلمان بہن بھائیوں کو یاد رکھا۔ بے شک ہر نیک عمل کا اجر کئی گنا زیادہ اللہ رب العزت عطا فرماتے ہیں۔

دوران اعتکاف میں نے سب کے لیے خوب دعائیں کیں۔ کچھ کے نام لے کر اور باقی جن کے نام یاد نہیں تھے ان کے لیے اجتماعی طور پر، اللہ قبول فرمائے اور تمام پاکستانیوں اور مسلمانوں پر اپنا خاص کرم فرمائے۔ آخر میں بس صرف اتنا کہوں گا کہ کاش ہم سب نے اعمال ایسے ہوں کہ ہم پر اللہ کا خاص کرم ہو۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے اور کوشش کرو کہ روزانہ تھوڑا سا قرآن پڑھو مگر سمجھ کر پڑھو اور اس وعدے کے ساتھ پڑھو کہ اس پر عمل بھی کرو گے۔ دنیا میں موجود ہر شے فانی ہے حتیٰ اگر دنیا بھی، اگر کچھ باقی رہ جائے گا تو وہ نیک عمل ہے جس کے بدلے روزِ حشر جنت عطا ہوگی۔ لہذا آج سے بلکہ ابھی سے توشہ تیار کر لینا چاہیے۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

مریم۔ جمالی گنجی
بچی مریم! تمہارا سبکی خط موصول ہوا جہاں تک چہرے کے مسائل کا تعلق ہے تو اس کے لیے مجھ سے دو مسئلوں، انشاء اللہ فرقہ خوس کرو گی۔ تمہارا دوسرا مسئلہ کافی گھمبیر ہے میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ معاملات میں خاموشی رکھو اور جس قدر ممکن ہو چلتے پھرتے یا اترم الراحمین کا درہ کیا کرنا اپنے ہاتھوں سے

□ نورین۔ فیصل آباد
○ بابا جی! اللہ آپ کو ہم جیسے لوگوں کے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے۔ اللہ اس نیک شخص پر بھی اپنا خاص کرم کرے جس نے غید سے قبل میری مدد کی۔ بابا جی آپ کے توسط سے ملنے والی رقم اتنی عزت اور سہولت سے ملی کہ میں اور میرے بچے ہاتھ اٹھا اٹھا کر آپ کو اور اس نیک انسان کو دعائیں دیتے ہیں۔ اللہ اس انسان کی اولاد کو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔ میں بدلے میں سوائے دعاؤں کے اور کچھ نہیں دے سکتی۔ بابا جی مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ مشکلات ضرور کم ہوں گی۔ آپ دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیے گا۔
بچی نورین! خوش رہو۔ میں تو اعتکاف میں تھا۔ تمہارے نام سے اللہ کے بندے نے مدد بخشی۔ کنبائیاں والوں نے تم تک پہنچائی۔ اللہ اس کا رنجہ میں حصہ ڈالنے والوں کو تاقیامت آباد رکھے اور کبھی کوئی دکھ نہ دے۔ کوشاں ہوں کہ مسلسل کوئی سلسلہ بن سکے تاکہ تم پردے میں رہ کر بچوں کی ضروریات پوری کر سکو۔

□ مہوش۔ سحرات
بچی مہوش! تم نہیں جانتی تھیں کہ تمہارا خط پیچھے آئیں لیے جواب دے رہا ہوں۔ بچی تمہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنی ہوگی۔ میں نہیں جانتا کہ تمہاری تعلیمی قابلیت کیا ہے۔ مگر ایسے بہت سے کام ہیں جو گھر پر بیٹھ کر کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً سلائی کرنا جی۔

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتہ نوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتہ: 88-C II - فرسٹ فلور - خیابان جامی کرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیر-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے - 35893122 - 021-35893121

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

نیوٹن وغیرہ! تمہارا شو ہر مذہب نے دانی چیز نہیں ہے اگر تم نے اب بھی حالات کو نہیں سمجھا تو شاید وہ مار مار کر تمہیں مار ہی دے۔ پھر بچوں کا کیا ہوگا لہذا سب سے پہلے اللہ پر بھروسہ کرو۔ پھر اپنے آپ پر، ہمت کرو اور اُنٹھ کھڑی ہو۔ رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت 'یا قہار' کا ورد کرو۔ جب جب یاد آئے پڑھو 'سبحان اللہ و بحمد سبحان اللہ' عظیم مدت ایک ماہ ہے۔

□ فاطمہ۔ پشاور

○ السلام علیکم محترم بزرگ! سلام کے بعد عرض ہے کہ مجھے مرگی ہے اور چکر آتے ہیں اور بے ہوش ہو جاتی ہوں اور ناف کے گرنے سے یہ چکر آتا ہے۔ جب معدہ خراب ہو تب آتا ہے اور دن رات معدے میں درد ہوتا ہے اور 24 سال ہو گئے کہ میرے پشت کے دائیں اور بائیں جانب سخت سوزش اور درد ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کسی نے پشت پر چھری یا سوئیوں دبائی ہوں اور مولوی کہتا ہے کہ آپ کی پشت پر کسی نے سوئیوں دبائی ہیں یعنی جادو ہے اور آپ کو کسی نے کچھ کھلایا ہے اور گھروالے جادو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ آپ کا معدہ خراب ہے اس لیے پشت میں درد ہوتا ہے لیکن میں نے کئی بار خواب دیکھا کہ یہ جادو ہے اور اتنا سخت سوزش ہوتا ہے کہ چیختی چلاتی ہوں اور سوزش کی وجہ سے میری زبان میں لکنت پیدا ہوتی کہ میں اچھی طرح بول نہیں سکتی اور میں عبادت تلاوت کام وغیرہ اچھے طریقے سے نہیں کر سکتی اور سب کچھ ایسا ویسا کرتی ہوں اور میں نماز بیٹھ کر پڑھتی ہوں اور مجھ سے برواشت نہیں ہوتا اور جو انی عبادت و ذکر وغیرہ کے لیے ہوتی ہے لیکن ہماری جوانی دکھوں تکلیفوں اور وروں کے نام ہے اور شادی شدہ ہوں میری ساری دواؤں کا خرچہ ماں باپ اٹھاتے ہیں اور شوہر کوئی غم نہیں کرتا۔ بچپن سے جوانی تک اتنی دوائی جس کی حد نہیں کھائی لیکن کوئی فائدہ نہیں اور قسم سے دل ٹوٹا نہیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور کسی بات کو برداشت نہیں کر سکتی جلدی غصہ آ جاتا ہے۔ پیارے باباجی مجھے مایوس نہ کریں کیونکہ میں اللہ کے سوا ہر طرف سے مایوس ہو چکی ہوں اور آخر میں مسئلہ لے کر آپ کے پاس حاضر ہوں ہوں اور خدا آپ کو ہر دراز

عطا فرماتا ہے اور خدا آپ بہت لوگوں کا بچا کرے جو بھی اس خدمت میں کام کرتے ہیں۔

☆ بنی فاطمہ! اللہ تم کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ورد شریف بہت پڑھو۔ بٹی بعد نماز فجر ایک گلاس اسپغول کا پیو اور پھر آدھے گھنٹے چہل قدمی کرو۔ اگر گھاس پر ننگے پاؤں چل سکو تو بہت اچھا ہے۔ بکثرت استغفر اللہ ربی کا ورد کرو۔ اپنے ہاتھوں سے چڑیوں کو وانہ اور پانی ضرور ڈالو۔ مجھے 41 دن بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ عابدہ۔ پشاور

○ پیارے باباجی! عرض یہ ہے کہ میری شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں اور شادی کی پہلی رات سے میرے شوہر کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ جھگڑا کرتا ہے اور ہر بات پر طعنے دیتا ہے۔ میری اولاد بھی نہیں میرے ساتھ باقی گھروالے ساری سسر ٹھیک ہیں۔ صرف شوہر بات بات پر شک، بات بات پر جھگڑا، بات بات پر طعنے دیتا ہے۔ میں نوکروں کی طرح ساری ذمہ داری اٹھاتی ہوں۔ شوہر نہ مجھے خرچہ دیتا ہے نہ کچھ لاکر دیتا ہے۔ ہر بات پر کہتا ہے جادو جادو! ماں باپ کے گھر۔ ہر بات پر طلاق طلاق کہتا ہے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں اور تم مجھے پسند نہیں ہو اس لیے تم کسی اور کو پسند کرتی ہو اور تم بائجھ ہو اور اولاد پیدا نہیں کر سکتیں اور میں دوسری شادی کروں گا اور ایسی باتیں کرتا ہے کہ بتانے کے لائق نہیں اور بری بری گالیاں دیتا ہے اور شوہر کی طرف سے مجھے میرا حق نہیں ملتا اور شوہر کی زبان میں اچھی بات نہیں۔ فریاد بہت ہیں لیکن خط مختصر ہے اور میرے سسر ساس بھی شوہر کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ خدا آپ کو عمر دراز عطا کرے بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔

☆ بنی عابدہ! تمہارے حالات جان کر بہت دکھ ہوا میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ صبح و شام 7-7 بار الحمد شریف پڑھو اور دعا کرو۔ رات کو سونے سے قبل سورۃ بقرہ کی آخری دو آیات پڑھو اور اپنے اوپر حصار کر لیا کرو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔
 ☆ بنی سنبل۔ حاصل پور

میرے کام کو اپنے شوہر سے انہیں منسلک کر دو۔
 کرو۔ بنی سنبل۔ حاصل پور
 میں کی گئی ہر بات اثر رکھتی ہے۔ اپنے گھر والوں کو
 پریشان مت کرو اور خود بھی مت ہو۔ حالات کا
 مقابلہ کرو اور انہیں اپنے حق میں کرو۔ نماز فجر اور
 عشاء کے بعد 11-11 بار پڑھو سورۃ البقرۃ آخری
 رکوع پھر دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

☆ حوریہ۔ سیالکوٹ

باباجی! میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جس نے پسند
 کی شادی کے لیے آپ سے تعویذ مانگا تھا، لیکن آپ
 کے انکار پر 3 ماہ پہلے ہم دونوں نے کورٹ میرج
 کر لی۔ کچھ عرصہ تو بات چیتی رہی مگر اب کھل گئی
 ہے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے
 ہیں۔ یا سر کو تو انہوں نے غائب ہی کر دیا ہے اور وہ مجھ
 سے بھی رابطے میں نہیں مگر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اپنے
 والدین سے رابطے میں ہے۔ باباجی! خدا کے لیے رخصت
 کریں۔ میں امید سے بھی ہوں۔ دنیا کو کیا منہ دکھاؤں
 گی؟ میرے لیے کچھ کریں۔

☆ بیٹی حوریہ۔ جب تم نے خود اپنے آپ کو تباہ
 و برباد کر لیا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ جلد بازی نقصان دہ
 ہوتی ہے۔ بس اپنے لیے دعا کرو اپنے والدین سے
 معافی مانگو اور ہر نماز کے بعد کثرت توبہ استغفار پڑھو
 بس اب یہی حل ہے۔

☆ نمرہ۔ ملتان

باباجی! میں بہت پریشان ہوں، میری شادی کو
 16 سال ہو چکے ہیں۔ یہ کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا مگر میں
 نے ایک دن بھی شکھ کا نہیں دیکھا۔ شوہر ذلیل کرتے
 ہیں، کوئی بات نہیں سنتے، ساس بات بے بات منہ پر تھپڑ
 مارتی ہیں۔ باباجی! بچے بڑے ہو گئے ہیں، ان کے
 سامنے اتنی ذلت ہوتی ہے تو دل چاہتا ہے کہ خود کشی
 کر لوں مگر بچوں کا سوچ کر چپ ہو جاتی ہوں۔ آپ
 لوگوں کو وظائف بتاتے ہیں۔ مجھے بھی بتائیں تاکہ
 میری زندگی میں بھی سکون آ سکے۔

☆ بیٹی نمرہ! سورۃ البقرۃ کی ابتدائی 3 آیات

پڑھاؤں گے اور دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

باباجی! میرا مسئلہ بڑا شدید ہے۔ میں جس
 لڑکے کو پسند کرتی ہوں، وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے مگر
 میرے گھر والے اس رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں۔
 باباجی! وہ لوگ پنجابی ہیں اور ہم پنجاب۔ ہم ایک
 دوسرے سے سچی محبت کرتے ہیں اور کچھ بھی کر سکتے
 ہیں۔ آپ ہمیں تعویذ تیار کر دیں۔ جتنا بدیہ کہیں گے
 میں دوں گی۔ بس میرا کام کر دیں۔

☆ بیٹی سنبل۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تمہارا
 کام میں کروں گا مگر دو دن اچھی طرح سوچو کہ تم اس
 شخص سے سچا پیار کرتی ہو جو تمہیں ابھی کچھ عرصہ پہلے ملا
 ہے یا اس باپ سے جس نے تمہیں اپنی گودوں میں
 کھلایا اس ماں سے جو تمہاری پریشانی پر رات رات
 بھر جانتی ہے یا ان بہن بھائیوں سے جو تمہیں تنگ
 کر کے خوش ہوتے ہیں اور پھر تمہارے ناراض ہونے
 پر تم سے لپٹ کر تمہیں پیار کرتے ہیں؟ بس دو دن بعد
 فیصلہ کر کے مجھے بتاؤ میں ایسا تعویذ دوں گا کہ تم جس کا
 ساتھ چاہو گی، وہ تمہارے ساتھ ہوگا اور باقی سب
 خواب۔ میری بچی۔ میں تمہارے جواب کا منتظر
 ہوں۔ فیصلہ کرتے وقت اس دیوار پر بھی ضرور ہاتھ
 پھیرنا جس پر بچپن میں چڑھ کر پاس لگے درخت سے
 پھل بھی توڑے ہوں گے۔

☆ ام فروا۔ U.K.

باباجی! میں شادی کے بعد پہلی بار یہاں آئی
 ہوں۔ گھر والوں سے دور ہونے کی وجہ سے ویسے ہی
 آپ سیٹ رہتی ہوں مگر میرے سسرال والوں کا
 رویہ بھی بہت عجیب ہے۔ میرے شوہر جاب سے
 واپسی کے بعد کمپیوٹر پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے
 تعلقات بھی واجبی سے ہیں۔ باباجی! میرا یہاں دم
 گھٹتا ہے۔ میں واپس اپنے گھر آنا چاہتی ہوں۔
 پلیز! میری مدد کریں۔

☆ بیٹی فروا! تم نے یہ نہیں لکھا کہ تمہاری
 شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟ ابتداء میں مشکلات آتی
 ہیں، لوگ ایک دوسرے کو سمجھ ہی رہے ہوتے ہیں۔

تہوار کے لیے تمام بچے مقام پر پیش ہو اور تہوار شروع ہو
قد سوں میں۔ اعلیٰ نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ
کرو۔ اس دوران میں نماز کی پابندی بہت ضروری
ہے۔ کامیابی نصیب ہوگی۔

□ شہزاد۔ بدین

بچے شہزاد! تم اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم پر رکھو
کیونکہ تمہاری ذہنی واریاں بہت ہیں پھر ابھی تمہاری
عمر ایسی نہیں کہ شادی کرو۔ بہنوں کا فرض پورا
کرو۔ والدین کو آرام پہنچاؤ۔ یہ اہم ہے۔ وظیفہ دینا
میرے لیے مشکل نہیں مگر میں نہیں چاہتا کہ تم بلاوجہ اس
لگاؤ اور حاجت قبول نہ ہونے پر اللہ تعالیٰ سے شکوہ
کرو۔ بیٹے! اپنے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے
پوری کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بہت نوازے گا۔ صرف نماز
کی پابندی کرو۔

□ شاہین۔ ساہیوال

بچے شاہین! ہاں سفید ہونے کی کئی وجوہات
ہیں جن میں سے ذرا زکا موجب سے بڑی وجہ ہے۔ اگر
تمہیں زکا مر رہتا ہے تو اس کا علاج کرو۔ بال چائے
کے پانی سے دھویا کرو اور پندرہ دن میں ایک بار مہندی
ضرور لگاؤ۔ سرسوں کے تیل پر 71 بار سورۃ اخلاص پڑھ
کر دم کرو اور یہ تیل کھجور کے پتوں سے دھو لگاؤ۔ افادہ
ہوگا۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ امینہ۔ ٹنڈو آدم

بچے امینہ! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول
فرمائے۔ نماز فجر اور نماز عصر کے بعد بلا تاخیر 7 روز یہ
عمل کرو۔

استغفر اللہ 70 بار۔

سبحان اللہ 70 بار۔

استغفر اللہ 10 بار۔

سبحان اللہ 9 بار۔

استغفر اللہ ایک بار۔

اول و آخر روزہ شریف 10-10 بار پھر اولاد کے
لیے دعا کرو۔ 7 دن مکمل ہونے کے بعد کھیر بنا کر اس پر
حضور اکرم ﷺ کے نام کی فاتحہ دو اور یہ کھیر تم میاں
جوئی کھال کے انشا اللہ کرم ہوگا نتیجہ نہ ملنے کی صورت

□ ارم۔ لاہور
باباجی! میری بڑی بہن کے ساتھ ایک مسئلہ
درپیش ہے وہ یہ کہ جب سے اس کی شادی ہوئی ہے
تب سے وہ بہت پریشان ہے۔ مزید یہ کہ اس کی شادی
ہوئے گیارہ سال ہو گئے ہیں اور وہ ابھی تک اولاد کی
نعمت سے محروم ہے۔ اس کے سسرال والے پہلے ہی
اس کے خلاف تھے اب تو اور بھی زیادہ ناراض اور
خلاف رہتے ہیں۔ میری بہن کا شوہر شراب پیتا ہے اور
جو بھی کھیلتا ہے اور شراب پی کر جندی حرکتیں کرتا ہے
اور بہن پر دوسرے ظلم بھی کرتا ہے۔ اس نے غیاشی کے
لیے رجوع نہیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ وہ میری بہن کو جسمی
دینا ہے کہ میں تجھے چھوڑ دوں گا لیکن چھوڑنا بھی نہیں
ہے اور اس نے زبردستی اپنی بہن سے میرے بھائی کی
شادی بھی کر دینی ہے۔ پہلے تو میرا بھائی اس شادی پر
خوش تھا لیکن اب جبکہ اس کے گھر اولاد بھی ہونے والی
ہے وہ کہتا ہے کہ میں اسے چھوڑ دوں گا۔ نبھانے
ہمارے ساتھ کیا ہوئے والا ہے؟ برائے کرم ہماری کچھ
مدد کریں اس کا حل بتائیں اور میں ہمیشہ آپ کے لیے
فدا رہوں گی۔

بچے ارم! اللہ تمہاری بہن کو اپنی امان میں
رکھے۔ ایسے شیطان نعمت الہی کے ساتھ رہنے کا کوئی
فائدہ نہیں۔ اللہ نے عورت کو اختیار دیا ہے تبذا اجتنب
اختیار استعمال کرے اور علیحدگی اختیار کرے۔ ایسی
مناسب ہے۔

□ عمارہ بہاول پور۔

بچے عمارہ! اللہ ایک خاص عمر تک بڑھتا ہے۔
تمہارا قد بڑھنا ناممکن نہیں۔ جہاں تک دوسرے مسئلے
کا تعلق ہے تو جینی انما عصر کے بعد 7 نسخہ کافور
کی ضرور پڑھا کرو۔ اللہ کرم کرے گا۔ ورنہ نتیجہ آنے
تک جاری رکھو۔

□ نسرین۔ حیدرآباد۔

بچے نسرین! صبر اور ہمت سے کام لینے والے
ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ اللہ سے مدد مانگو اور کسی سے
کچھ مت ہو۔ نماز عصر کے بعد اول و آخر 11-11 بار
التحیات پڑھو اور 11 بار بڑھو اور 11 بار

قارئین کے نام کھلا خط ✍

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔ ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدا نے بزرگ و برتر سے ہر بل بھی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزق حلال کمائیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے..... ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

میں عمل کو باہر اور کچھ رقم زکوٰۃ میں خیرات کرو۔
 ہو جاتا ہے اللہ عزوجل صاف ہوئی چاہیے اور اللہ تعالیٰ پر
 مکمل اعتماد۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ سمیرا۔ کراچی

☆ بنی سمیرا! جاو برحق ہے مگر اس کا تو قرآن پاک میں موجود ہے۔ تم اپنی نانی سے کہو کہ وہ صبح اور شام آیت الکرسی اور سورۃ الناس کا ورد کیا کریں۔ گھر کے تمام افراد کے اوپر سے حسب استطاعت صدقہ خیرات نکالیں۔ کرم ہوگا۔ مجھے کیفیت سے 14 دن بعد مطلع کرو۔

□ منور علی۔ پشاور

☆ بیٹے منور! اللہ تعالیٰ تمہارے والد کو نبی عطا فرمائے۔ وہ لوگ بہت بد قسمت ہوتے ہیں جو زنی اور لک سے محروم ہیں۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ اس میں جتنی حاجتیں دی جا سکیں اور سمیٹی جا سکیں۔ سیت لینی چاہئیں۔ اپنی والدہ سے کہو کہ نماز کی پابندی رکھیں اور نماز عصر اور مغرب کے بعد 112-112 مرتبہ پڑھیں۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ كُلَّمَا ذَكَرَهُ
 الذَّاكِرُونَ وَكُلَّمَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُونَ
 بیٹے! تم نماز عشاء کے بعد سورۃ کوثر آیت 2
 12 تسبیح پڑھ کر دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر دُعا کرو۔ ہاتھ تختی سے رکھو اور اپنی آواز میں دُعا کرو کہ تمہیں سنائی دے۔ مدت 41 دن ہے۔

□ نوشین۔ گوالیار

☆ بنی نوشین! تم نے جب اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا تو بیٹی! مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ لوگ تمہارے قابل نہیں پھر میں نے تمہارے لیے خصوصی دُعا کروادی اور تمہاری حاجت قبول ہوگئی۔ اب تم یہ کہہ رہی ہو کہ مجھے غلط فہمی ہوگئی تھی تو بیٹی! ارشے توڑ کر جوڑنا آسان نہیں۔ تم نے اپنے پہلے خطوط میں غلط بیانی کی تھی اب تم کہہ رہی ہو کہ وہ شخص حافظ قرآن ہے۔ بہر حال بیٹی! میں اب تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ دروغ گوئی مجھے بالکل پسند نہیں۔ آئندہ مجھے خط مت لکھنا۔

□ عمارہ۔ لاہور

☆ بیٹی عمارہ! جب تم فیصلہ کر چکی ہو کہ تم کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں تو مجھے خط لکھنے کا کیا مقصد؟ اللہ تعالیٰ

□ شاہد خان۔ منڈی بہاؤ الدین

☆ بیٹے شاہد! نماز فجر اور عشاء کے بعد ایک ایک تسبیح باننا صبر یا نصبر کی پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے حاجت بیان کرو۔ بروز جمعہ نماز ظہر کے بعد 7 تسبیح یا تحفہ القسانم کی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دُعا کرو کہ وہ تمہیں عزت عطا فرمائے۔ وظیفہ کی مدت 3 ماہ ہے۔

□ محمد اظہار۔ مظفر گڑھ

☆ بیٹے اظہار! نماز کی پابندی رکھو۔ تم اتنے کمزور نہیں ہو کہ معمولی باتیں تمہاری زندگی پر اثر انداز ہو سکیں۔ مضبوط انسان وہ ہے جو حالات کو اپنے بس میں کرے نہ کہ وہ جو حالات کا شکار ہو جائے۔ تم صبح صادق یا عشاء کے بعد ایک ہزار مرتبہ بسم اللہ یا ہارحیم پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ فضیلہ۔ شہدادکوٹ

☆ بیٹی فضیلہ! انسان کو حساس ہونا چاہیے مگر اتنا زیادہ نہیں کہ زندہ رہنا ہی مشکل ہو جائے۔ جن لوگوں کے پاس فرصت زیادہ ہوتی ہے انہیں چھوٹی چھوٹی نکالینس رہتی ہیں۔ اپنے آپ کو مصروف رکھو۔ صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھا کرو۔ آدھی تکلیفیں تو فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ تعلیم حاصل کر رہی ہو تو اس پر توجہ دو۔ گھر کے کاموں میں دلچسپی لو۔ خوراک متوازن رکھو اور خوب پانی پیو۔ اپنا تولیہ الگ رکھو۔ چہرہ صاف ستھرا رکھا کرو۔ نماز عصر اور عشاء کے بعد 7-7 بار سورۃ الاعلیٰ پڑھو اور اللہ سے دُعا کر دو کہ وہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ مدت 2 ماہ و 5 دن ہے۔

□ رخسار۔ سجاول

☆ بیٹی رخسار! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتی رہو۔ نماز عشاء کے بعد 300 بار پڑھو۔

حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ

پھر ماتھ اٹھا کر نہایت عاجزی سے دُعا کرو۔ بیٹی! ایک بات بیشک یاد رکھو کہ سیت انجی بونہ نامکین میں ممکن

ہوتے ہیں لہذا خطوط کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے دیر ہو جاتی ہے۔ تم صرف اپنے معاملات پر توجہ دو اور دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ تم یقیناً وظیفہ شروع کر چکی ہو گی لہذا مکمل ہونے پر آگاہ کرنا۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔

□ اقراء۔ خانیوال

○ باباجی! میں نے پہلی بار آپ کا کالم پڑھا تو دل کو بہت سنگین ہوا۔ یقین ہو گیا کہ دنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ باباجی! میرا مسئلہ بہت شدید نوعیت کا ہے۔ میں عرصہ 7 سال سے کسی کو پسند کرتی ہوں وہ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں مگر میرے گھر والے کسی طور نہیں مان رہے خاص طور پر والد اور بڑے بھائی۔ اگر میرے گھر والے مان جائیں تو وہ اپنے والدین کو ہمارے چر بھیج دیں گے۔ باباجی! میں اسکول میں جاب کر رہی ہوں۔ ظہر اور عصر قضا ہو جاتی ہیں۔ آج کل دن ویسے بھی چھوٹے ہیں گھر آتے آتے مغرب کا وقت ہو جاتا ہے۔ اب برائے مہربانی مجھے تعویذ عنایت کیجیے اور

سے بند و تجارت نہیں کر سکتا کہ میں یہ کروں تو فوٹو دہا کرے۔ یہ نہایت غلط سوچ ہے۔ وظیفے کی کچھ مدت ہوتی ہے اور کچھ آداب۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں صرف دو ماہ کروں گی؟ بہر حال تمہیں جواب اس لیے دے رہا ہوں تاکہ تمہیں شکایت نہ رہے کہ جواب نہیں دیا۔ تمہیں کسی وظیفے کی ضرورت نہیں ہے۔

□ عثمان۔ حورے والا

☆ بیٹے عثمان! تمہیں کوئی مرض لاحق نہیں ہے۔ وہ ایک فطری عمل ہے۔ جہاں تک وہ بے پتلے ہونے کا سوال ہے تو اس کے لیے ورزش بہترین ہے۔ تمہاری خوراک ٹھیک ہے بس ورزش کیا کرو۔ نماز فجر کے بعد 33 مرتبہ سورۃ العصر پڑھو اور اپنے اوپر دم کر لیا کرو۔ مجھے 41 روز کے بعد مطلع کرو۔

□ عرشہ۔ سیالکوٹ

☆ بیٹی عرشہ! وظیفہ مکمل کرنے کے بعد مجھے مطلع کرو۔ ایک بات کی وضاحت کروں کہ جو خطوط رسالے کے لیے آتے ہیں وہ باری آنے پر شائع

ط علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانٹوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجہ اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

88-C II ذراستہ خیال سے کسی کے شفا ہونے کی مثالیں دیکھیں۔ اچھا ٹی۔ فز۔ 7، کراچی

طریقہ استعمال بھی جانتے ہیں۔
 باباجی! اقراء! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ
 فرمائے۔ تعویذ میں ضرور تیار کروں گا مگر تم مجھے یہ بتاؤ
 کہ تمہارے والد اور بھائی اس رشتے کے خلاف کیوں
 ہیں؟ بیٹی! والدین کا تجربہ بہت ہوتا ہے پھر وہ اپنی
 اولاد سے محبت بھی بہت کرتے ہیں لہذا برا جادہ ہی نہیں
 سکتے۔ تمہارا خط واضح نہیں ہے تفصیل سے مجھے خط لکھو
 اس کے بعد میں تمہیں حل بتاؤں گا۔ بیٹی! ایک بات
 ہمیشہ یاد رکھنا کہ والدین کو ذمہ داری ہے کہ اولاد کو خوش
 نہیں رہ سکتی۔

□ اطہر خان - کوشہ۔

باباجی! میں اس سے پہلے بھی آپ کو خط لکھتا رہا
 ہوں اور اللہ کے فضل سے میرے مسائل بھی حل ہوئے
 ہیں آج آپ کو اپنی بہن کے مسئلے کے لیے خط لکھ رہا
 ہوں۔ باباجی! اس کی شادی 2012ء میں میرے سگے
 ماموں فراز سے ہوئی اور بدلے میں میری شادی وہاں
 ہوئی۔ اس طرح ایک گھر کے دو لوگ ہمارے پاس
 ہیں۔ باباجی! میری بہن کے ہاں ابھی تک اولاد نہیں
 ہے۔ یہ بات اسی لیے مجھوں زیادہ ہوتی ہے کہ میری
 شادی بہن کی شادی کے ایک ماہ بعد ہوئی اور میرے گھر
 میں ایک بیٹا جنم ہوا اور دوسری بار ایک امید ہے۔ بہن
 میرے بچوں کو بہت حسرت سے دیکھتی ہے۔ آپ اپنا
 مؤثر تعویذ دیں کہ وہ جلد از جلد ماں بنے۔

باباجی! اطہر! اللہ تمہاری بہن کو خوش اور آباد
 رکھے۔ تعویذ میں تیار کروں گا مگر مجھے کچھ تفصیلات
 درکار ہیں لہذا مناسب ہوگا کہ بہن مجھے جوابی لفافے
 کے ہمراہ خط لکھے۔ میں تفصیل سے جواب دے گا۔ بس
 بیٹی! اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک! وہ نہایت مہربان آقا
 ہے اور جو لوگ اس سے مدد مانگتے ہیں وہ انہیں کبھی
 مانگوں نہیں کرتا۔

□ قمر جہاں - کراچی

باباجی! میں آپ کی دینی بیٹی ہوں جس کو
 آپ نے شادی کے لیے تعویذ اور درود دیے تھے۔ باباجی!
 اللہ کا بڑا کرم ہے آپ کی دعاؤں سے میری شادی
 ہو گئی اور میں اپنے گھر میں بہت سکون سے چوں رہی ہوں۔

جان! اصل میں مسئلہ میری زندگی کا ہے۔ وہ اچھی شکل و
 صورت کی ہے تعلیم یافتہ ہے سلیقہ مند ہے مگر اس کا
 رشتہ کہیں طے نہیں ہوتا۔ لوگ آتے ہیں پسند کرتے ہیں
 ہیں اور پھر بلا وجہ انکار ہو جاتا ہے۔ باباجی! پہلے تو ہم
 نے یہ بات محسوس نہیں کی مگر اب احساس ہونے لگا
 ہے۔ اس کے ساتھ کی تمام بچیوں کی یا تو شادی ہو گئی
 ہے یا کم از کم بات تو طے ہی ہے۔ میری ماس دل کی
 مرینہ ہیں اور یہ مسئلہ ان کی تکلیف میں اضافہ کر رہا
 ہے۔ برائے مہربانی کوئی حل نکال لیں۔

باباجی! قمر! اللہ کا شکر ادا کیا کرو اور عہد کرو کہ
 اب ہر کام میں اللہ کی رضا مندی لیا کرو گی۔ جہاں تک
 تمہاری زندگی کا تعلق ہے تو بیٹی سے کہو بعد نماز فجر ایک بار
 سورۃ احزاب پڑھو اور دعا کرو۔ اپنی ساری باتیں
 بچی کے اوپر سے صدقہ خیرات ضرور نکالنا کریں۔ بعض
 اوقات بچے مد نظر کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کے تمام
 معاملات میں پھر کاوٹ نظر آتے لگتی ہے۔ بہر حال
 اللہ بھروسہ رکھو وہ بہتر کرنے والا ہے۔

□ افضل - بالاکوٹ

باباجی! میں عرصہ 12 سال سے گارمنشن
 کا کام کر رہی ہوں مگر اب کچھ عرصے سے کاروبار سے
 برکت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ سارا سارا اون گزر جاتا ہے
 کوئی گاہک نہیں آتا۔ منگانی کے اس دور میں بچوں کا
 بھی ساتھ ہے۔ مہینہ گزارا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ بچوں
 کی فیس اس کے علاوہ کچھ نیانی اگیس راشن ان خریجوں
 نے تو میری کمر توڑ دی ہے۔ سارا مہینہ ٹینشن میں گزرتا
 ہے۔ باباجی! نوکری تو ہے نہیں کہ اگلے مہینے تنخواہ کے
 آسے باتھ روک کر گزار دکر لیں۔ بڑی پریشانی ہے
 کوئی حل بتائیے۔ وظیفہ میری بیوی کرے گی۔

باباجی! افضل! رزق میں برکت کے لیے بعد
 نماز عشاء سورۃ واقعہ پڑھنا بہت مبارک ہے۔ اس کے
 علاوہ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا بھی
 کبھی حالات بہت مشکل ہو جاتے ہیں ایسے میں صبر اور
 مستقل مزاجی سے معاملات کو سنبھالنا چاہیے۔ اللہ سے
 ضرور مدد مانگتے رہو ورنہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

236

ماہنامہ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم

سال پورا ہونے کے بعد سو روپے پر ڈھائی روپے زکوٰۃ ہے اسی حساب سے زکوٰۃ دینی ہوگی۔ بینک میں اور فنانس خانے میں رکھی ہوئی رقم پر جو زکوٰۃ کاٹ لی جاتی ہے اگرچہ ان میں شرعی احکام کی خلاف ورزی کی جاتی ہے مگر بہر حال زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم خود ادا کی جائے۔ اپنے قریب و جوار کے بہت سے لوگوں کو تھوڑے تصور کے کر کے پیسے بھی دیے جاسکتے ہیں مگر اتنے پیسے ان کو ضرر دے چاہیں گے ان کی کچھ ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اتنی کم رقم بھی نہ دی جائے کہ ان کی کوئی ضرورت بھی پوری نہ ہو۔

حسن انتخاب۔ شہزاد شریف۔ کراچی

دل سے نکلے ہیں کچھ الفاظ

بھلا: خوف زدہ انسان کی ہر بازی مات، ہر جنگ شکست اور ہر کوشش ناکام ہوتی ہے۔
بھلا: جو قوم اپنی مرضی سے مطیع ہو جاتی ہے، وہ اپنی سیرت کی جڑوں کو خود ہی کنوڑ کر لیتی ہے۔
بھلا: دنیا یہ نہیں دیکھتی کہ تم پہلے کیا تھے بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اب کیا ہو۔

بھلا: ذہانت گفتگو کا نمک ہے۔

بھلا: ذاتی لائبریری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ

ہے اور دماغی لائبریری بیش بہا نعمت۔

بھلا: کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لیجیے کہ

یہ کس طرف جاتا ہے۔

بھلا: محبت میں یہ صفت ہے کہ وہ مشتعل ہو کر بھی اپنے جھج میں کم نہیں ہوتی۔

مرسلہ: محمد فیاض محمود۔ کراچی

نوبت

ایک بزرگ اپنے نو جوان بیٹے کو گاڑی چلاتے ہوئے نو جوانوں کی تیز ڈرائیونگ کے نقصانات سمجھا رہے تھے کہ اچانک ان کی گاڑی کے آگے ایک سائیکل سوار آ گیا۔ ان بزرگ نے جو آہستہ اسپید میں گاڑی چلا رہے تھے۔ بریک لگا دی۔ یوں ایکسیڈنٹ سے بچاؤ ہو گیا تو وہ اپنے بیٹے سے کہنے لگے۔

”اگر میری جگہ تم ہوتے تو یہ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہوتا۔“

بیٹے نے انتہائی اطمینان سے جواب دیا۔ ”ابا جی اس ایکسیڈنٹ کی نوبت ہی نہ آتی۔ کیونکہ میں اس جگہ سے ایک گھنٹہ پہلے گزر چکا ہوتا۔“

مرسلہ: محسن علی شای۔ بھکر

دل

دل ایک پرفیوم کی بوتل کی طرح ہے۔ اگر تم اسے کبھی نہیں کھولو گے تو اس کے اندر کی خوشبو کو کوئی جان نہ سکے گا۔ اگر تم اسے ہمیشہ کھلا رکھو گے تو بہت جلد اس کی خوشبو کھو بیٹھو گے۔ لہذا اسے احتیاط سے استعمال کرو۔

مرسلہ: عبدالرحمن۔ کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پتہ چاہئے آج کدھر کو نکل گیا غار
تمہاری طرف ہی وہ پہنچا، نہ یار اپنی طرف
شاعر: کاشف حسین غار

نقل

ایک بس کنڈیکٹر ہکلاتا تھا۔ بس میں ایک اور ہکلا
مسافر سفر کر رہا تھا۔ کنڈیکٹر نے اس سے کرایہ مانگا۔
”سک..... سک..... کرایہ؟“
پچھلے مسافر نے کہا۔ ”پہلے سک..... سک..... سک.....
تو دو۔“

اسی بس میں ایک تھانیدار بیٹھا تھا وہ اپنی جگہ سے
اٹھا اور دونوں کی پٹائی کرنے لگا۔ ایک آدمی نے
پوچھا۔ ”بھائی انھیں کیوں مار رہے ہو؟“
تھانیدار نے جواب دیا۔ ”یہ..... دو..... دو.....
دونوں میری نقل اتار رہے ہیں۔“
مرسلہ: محمد کاشف۔ بلدیہ کراچی

لفظوں کا ہیر پھیر

☆ خاموشی ایک ایسا پردہ ہے جس کے پیچھے
لیاقت بھی ہو سکتی ہے اور حماقت بھی۔
☆ مسکراہٹ، سخاوت کی بجلی اور محبت اس کا
دروازہ ہے۔
☆ خواب وہ نہیں ہوتے جو آپ سوتے ہیں
وہ دیکھتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو آپ کو سونے نہیں دیتے۔
☆ دوستوں کو خوشی بھی دو تو یوں گویا حق دیا ہو،
احساس نہیں کیا۔
☆ پہلی بارش اور پہلی محبت دونوں انسان کو
مبہوت کر دیتی ہیں۔
مرسلہ: ثبیل جاوید، لک موڑ، سرگودھا

بہت خوب

پارٹی میں ایک خاتون دوسری خاتون کو بتا رہی تھیں۔
”میرے پاس نے مجھے ہیرے کی انگلی تھنے
میں دی ہے بغیر لالچ کے۔“
”بہت خوب۔“ دوسری خاتون نے کہا۔
”اس نے مجھے (نقل) میں بکلا بھی لے کر دیا ہے اور وہ

ملا جی کی حاضر و ماضی
ایک دفعہ ملا نصیر الدین نے ہمسائے سے دیگ
مانگی، ہمسائے نے بے دی۔ جب ملا نے واپس کی تو
اس میں چھوٹی سی دپٹی بھی رکھ کر دے دی۔ ہمسائے
نے پوچھا۔

”ملا صاحب! یہ دپٹی کس نے دی ہے؟“
ملا نصیر الدین نے جواب دیا۔ ”یہ دراصل
تمہاری دیگ نے بچہ دیا ہے۔ ایمانداری کا تقاضا
ہے کہ میں تمہیں یہ دے دوں کیونکہ یہ تمہاری ہی
دیگ نے دیا ہے۔“
ہمسائے نے خوش ہو کر کہا۔ ”جی ہاں ضرور۔ یہ
میرا ہی ہوا، مجھے دے دیں۔“ کچھ روز بعد ملا جی نے
دوبارہ دیگ مانگی تو ہمسائے نے خوشی خوشی فوراً دیگ
دھونی اور ملا کے حوالے کر دی۔ جب ملا نے کئی روز
تک دیگ واپس نہ کی تو ہمسائے نے آکر تقاضا کیا۔
ملا نے جواب دیا۔ ”بھائی تمہاری دیگ مر گئی۔“
پھر ہمسائے نے شور مچا دیا اور بولا۔ ”میں ابھی
لوگوں کو اکٹھا کرتا ہوں بھلا دیگ بھی کبھی مرنے لگتی ہے؟“
ملا نے جواب دیا۔ ”جب دیگ نے بچہ دیا تھا تو
بڑی خوشی سے لے گئے تھے، اس وقت تو کچھ نہیں کہا
کہ بھلا دیگ بھی کبھی بچہ دیتی ہے؟ اب مر گئی ہے تو
کہہ رہے ہو کہ دیگ بھی کبھی مرنے لگتی ہے۔“
مرسلہ: شہباز رضا۔ کراچی

غزل

بلا رہا ہے مجھے رہ گزار اپنی طرف
ہوا کو کھینچ رہا ہے غبار اپنی طرف
مجھے کسی کی طرف دیکھنا نہیں پڑتا
میں دیکھ لیتا اگر ایک بار اپنی طرف
سوال یہ ہے کہ اب کس طرح وصول کروں
نکل رہا ہے میرا کچھ ادھار اپنی طرف
پڑا ہوا تھا میں برگ خزاں رسیدہ سا
اڑا کے لے گئی باؤ بہار اپنی طرف
جو دل میں آئی بھی رفتگاں سے ملنے کی
قدم اٹھتے مرے ہے اختیار اپنی طرف

پرائیمری اسکول کی دو منہمک کہانیاں

جائزہ ✖

وقاص حسین

ایک جن زادی کی محبت کی انوکھی داستان وہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز سمجھتی تھی

مذہب..... میں نہیں مانتی مذہب۔ میں مانتی ہوں تو صرف محبت کو۔ وہی میرا دین ہے وہی میرا ایمان ہے۔“ تارا کی باتیں سن کر میرا دماغ اور خراب ہو رہا تھا۔ وہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے کہاں کی باتیں کہاں جوڑ رہی تھی۔

”تم محبت اور مذہب کو تو ایک طرف ہی رکھ دو۔“ میں غصے اور بے بسی سے بولا تھا۔ ”تمہارا اور میرا ملنا ہی انسانی فطرت کے خلاف ہے، تم آگ، میں مٹی۔ تمہارا اور میرا ملن ممکن ہی نہیں ہے۔“ میں نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے اس کو حقیقت سے روشناس کروایا تھا اور پھر اگلے ہی لمحے میں ایک دم غصے میں آ گیا تھا۔ میں نے خود پر سے اپنا کنٹرول کھو دیا تھا۔ میرا ماضی میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا تھا اور میں غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

”میں تم سے بات ہی کیوں کر رہا ہوں مجھے نفرت ہے تم سے۔ میں نے جتنی کبھی تم سے محبت کی تھی اب میں اس سے زیادہ تم سے نفرت کرتا ہوں۔“

”محبت، مذہب اور دنیا کے رسم و رواج سے بالاتر ہے۔ محبت کا کوئی دین نہیں، کوئی مذہب نہیں سب سے پہلے محبت ہے پھر سب کچھ آتا ہے۔ محبت دین کی نفی نہیں کرتی۔“ تارا محبت پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھی اور میرا خون کھول رہا تھا۔

”مذہب سے اوپر کچھ بھی نہیں ہے۔ محبت وقتی جذبہ ہے جسے وقت اور حالات کے دو چار پھیر ہی سرد کر کے رکھ دیتے ہیں۔“ میں غصے سے دباڑا تھا۔ بے بسی سے میرا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس کی گردن دبوچ کر اسے ختم کر دوں۔

”تم مذہب کی بات کرتے ہو۔“ تارا ایک بار پھر بولی تھی۔ ”تو سنو اس دنیا کی بنیاد مذہب پر نہیں، محبت پر رکھی گئی ہے۔ تم مسلمان لوگ ہی کہتے ہو کہ اگر ہمارے پیارے نبی نہ ہوتے تو یہ دنیا ہی وجود میں نہ آتی۔ یہ دنیا اللہ نے بنائی ہی اپنے محبوب کے لیے۔ اس کی محبت میں ہے۔ تو پھر اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ یہی کہ محبت پسے ہوئی ہے اس کے بعد

تمہاری وجہ سے میری چھوٹی بہن اسی دنیا میں نہیں ہے۔ اس کی موت کی وجہ صرف اور صرف تم ہو اور تم کہتی ہو کہ میں تم کو اپنا لوں۔ تم میری بہن کی قاتل ہو۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔ سنا تم نے، نفرت ہے مجھے تم سے۔" میں زور سے چیخا تھا۔

"تو میرے باپ کی موت کا ذمہ دار کون ہے۔" اس کی بارود چھینکتی تھی۔

"تمہارے باپ نے اپنے کیے کی سزا پائی تھی اور دوسرا اس کی ذمہ دار تم خود تمہیں، ہم نہیں تھے۔" میں اپنے سابقہ لہجے میں ہی بولا تھا۔

"اور مجھے کس جرم کی سزا دی گئی۔" تارا چلائی تھی۔

"تم ابھی بھی پوچھ رہی ہو۔" میں سنبھلے سے بولا تھا۔ "میرے بس میں ہوتا تو تم اس وقت میرے سامنے نہ ہوتیں۔"

"میری کوئی غلطی نہیں تھی۔ پھر بھی بیس سال میں نے سزا پائی ہے۔ تم سے تو میں ایک پل دور رہنے کا تصور نہ کر سکتی تھی۔ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو فیض۔" اس کے لہجے میں تبدیلی آئی تھی۔ وہ التجائیہ لہجے میں بولی تھی۔

"میں صرف تمہارے لیے لوٹ کر آئی ہوں اور تم مجھے ٹھکرا رہے ہو۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ اب دنیا کی کوئی



Downloaded From
Paksociety.com

اسی طاقت نہیں ہے جو تمہیں میرا ہونے سے روک سکے۔" تارا کی آنکھوں میں سرخی اتری تھی اور اس کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

"تم کچھ بھی کر لو، میں کبھی تمہارا نہیں ہوں گا۔" میں اٹل کچے میں بولا تھا۔

میری بات سن کر تارا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"تم کچھ بھی کر لو۔" تارا نے میری بات معنی خیز انداز میں دہرائی تھی۔

"تمہیں پانے کے نیے میں کچھ بھی کروں گی۔ کیوں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔" تارا نے ایک فلک شکاف قہقہہ لگایا تھا۔

میں ہنر بڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ میرے انگ انگ سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ جنوری کے اس سرد مہینے میں مجھے گرمی محسوس ہونے لگی تھی۔

میرے ہنر بڑانے پر میری بیوی بھی اٹھ گئی تھی اور اب پوچھ رہی تھی کہ فیصل کیا ہوا تمہیں اور اس قدر پسینہ کیوں آرہا ہے۔

"کچھ نہیں، ایک ڈراؤنا خواب دیکھ لیا تھا۔" میں نے سنبھلتے ہوئے اپنی بیوی کو جواب دیا تھا اور ایک بار پھر لیٹ گیا تھا۔ اپنی بیوی کو سونے کی ہدایت دے کر۔

میری آنکھوں سے نیند کو سوں دور جا چکی تھی اور میرے سامنے ماضی ایک بار پھر گھومنے لگا تھا۔ اپنی چھوٹی بہن کا خوب صورت ہنستا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو پانی بن کر بہنے لگے تھے۔

"کیا وہ سچ میں لوٹ آئی ہے یا پھر یہ ایک برا خواب تھا۔"

مجھے سوچوں نے آگیرا تھا۔ وہ تو قید میں تھی پھر وہ کیسے نکل سکتی ہے، ایک اور آواز میرے اندر سے ابھری تھی۔ نہیں وہ نہیں آسکتی یہ صرف ایک برا خواب تھا میں نے خود کو تسلی دے کر پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرا دل جو پہلے بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اب آہستہ آہستہ معمول پر آ رہا تھا اور میں دوبارہ

پچھلے ایک ہفتے میں تارا نے ہمارا جینا حرام کر دیا تھا۔ پہلے پہل تو مجھے لگا یہ صرف وہم ہے کسی بچے کی شرارت ہوگی لیکن مسلسل حادثوں نے میرا وہم دور کر دیا تھا اور مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ ان سب حادثوں کے سرے کہیں نہ کہیں اس خواب سے ملتے ہیں۔

اس خواب کے پندرہ دن بعد کی بات ہے جب میں ایک شام گھر آیا تو میری بیوی کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگی۔ آج کمرے میں پردے کو خود بخود آگ لگ گئی۔ وہ تو شکر ہے میں نے فوری دیکھ لی ورنہ پتا نہیں آج کیا ہو جاتا۔

میں نے اپنی بیوی کو تسلی دی کہ پریشان نہ ہو، کبھی بچے کی شرارت ہوگی۔ لیکن وہ میری بات ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ کہنے لگی۔

"میں نے پیار اور سختی سے پوچھا ہے دونوں سے لیکن وہ کہہ رہے ہیں ہم نے نہیں لگائی۔"

میں نے اپنی بیوی کو تسلی دی اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس رات کا خواب میں جلد ہی بھول گیا تھا۔ اس لیے میرا اس طرف کوئی دھیان نہیں گیا تھا۔

اور پھر تو یہ مسلسل ہونے لگا۔ کبھی میرے کپڑے جلے ہوئے ملتے تو کبھی پردے، تو کبھی بچوں کے یونیفارم جو رات کو استری کر کے بالکل ٹھیک رکھے جاتے لیکن صبح المادی کھولنے پر پتا چلتا کہ وہ راکھ بنے ہوئے ہیں نہ کہیں آگ کا نشان نہ دھواں ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کو جلایا کہیں اور گیا ہو اور راکھ یہاں پر ڈال دی گئی ہے۔

اور آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ پورے کے پورے بریف کیس کو آگ لگ گئی تھی اور چند منٹوں میں ہی جل کر خاک ہو گیا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی باقی کسی چیز نے آگ نہیں پکڑی تھی حالانکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔

میری بیوی نے ڈر کے مارے کمرے میں نہیں گئی

تھی اور مجھے فون کر دیا تھا کہ اندر آجف لگائی ہے۔
 بات کا مطلب سمجھ کر۔

”اب یہ تو تم نہ کہو۔ ممکن نہیں۔ ممکن تو ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم آسانی سے میرے ہو جاؤ یا پھر میں تم کو اپنا بنا لوں۔ دے لے بھی محبت اور جنگ میں تو سب جائز ہوتا ہے۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی تھی۔

”اور دوسری بات یہ کہ دنیا کی کوئی بھی طاقت اب تمہیں میرا ہونے سے روک نہیں سکتی۔ اب میں تمہیں اپنا بنا کر ہی رہوں گی۔ اس کے لیے چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ مطلب تم سمجھ رہے ہو نا۔ کچھ بھی نہ کا۔“ وہ مجھے سمجھانے والے انداز میں بولی تھی۔

بچپن میں جو دن میرے سب سے خوب صورت اور قابل فخر تھے اب وہی دن میری زندگی کے سب سے زیادہ بھیاںک تھے۔ میں آج تک سمجھتا ہوں کیونکہ میری بہن کی موت میری وجہ سے ہوئی تھی میں ذمہ دار تھا کوئی الزام تو نہیں دیتا تھا لیکن میرا ضمیر مجھے چین سے رہنے نہیں دیتا تھا۔

☆.....☆

”مجھے تم بہت پیارے لگتے ہو۔ میں صرف تمہارے لیے اپنی اکی کے ساتھ آئی ہوں۔“ وہ بولی تھی اور اس کے ہونٹوں سے الفاظ کھلاں بن کر نکلے تھے۔
 ”مجھے بھی تم بہت پیاری لگتی ہو۔ میں صرف تم کو دیکھنے کے لیے روز اس وقت یہاں آتا ہوں۔“ میں نے شرماتے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

”ٹھیک ہے تم کل پھر آنا میں کل پھر اکیلی آؤں گی۔ پھر ہم باتیں کریں گے۔ ابھی مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے گھڑا اٹھا کر سر پر رکھا تھا اور اپنے گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی کی طرف قدم بڑھانے ہی لگی تھی کہ میں نے آواز دی، وہ منس کر پلٹی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“
 ”تارا!“ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

”اور میرا نام فیض ہے؟“ میں نے پیچھے سے

اور پھر میں اسی وقت گھر آگیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اچانک کیا ہونے لگا ہے اور اب اس کا حل کیا کروں۔ میں نے بیوی کو تسلی دی تھی اور خود آکر چھت پر بیٹھ گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ اب کیا کروں، کس کے پاس جاؤں۔ اچھی مجھے بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میرے آس پاس لڑکی کی ہنسی کی آواز گونجنے لگی اور میں ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن مجھے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھ کر جیسے ہی سامنے دیکھا تھا وہ میرے سامنے جلوہ گر تھی۔ مجھے پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔ میں فوری پہچان گیا تھا حالانکہ میں اس کو بیس سال بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی اور پھر بولی تھی۔

”فیض مجھے بھول گئے تھے ناں، بڑے بے وفا نکلے تم تو۔“ کبھی تو تم کہتے تھے کہ میں مر کے بھی تمہیں نہیں بھولوں گا۔“ تارا نے طنز کیا تھا مجھ پر لیکن میں خاموش حیران پریشان اس کو بس دیکھ رہا تھا۔ وہ میری حالت دیکھ کر ہنسی لگی اور پھر بولی۔

”کیسے لگے میرے بچے تمہیں؟ لیکن افسوس تمہیں پھر بھی میری یاد آئی۔“
 ”تم نے یہ اچھا نہیں کیا تارا۔“ میں غصے سے چلایا تھا۔ وہ ہنسی لگی۔ اسی کی ہنسی میں بہت کچھ تھا۔ طنز یہ مذاق اڑنا، غصہ، کرب، برداشت وہ ہنسی تھی اور پھر ہستی ہی چلی گئی۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور پھر بولی۔

”فیض محبت اور جنگ میں تو سب جائز ہوتا ہے اور تمہارے ساتھ تو محبت بھی ہے اور جنگ بھی۔ میری تو خو و سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تمہارے ساتھ کیا کروں۔ تمہاری ہر خطا معاف کروں یا پھر سزا دوں۔“ وہ ایک دم سے سنجیدہ ہوئی تھی۔

”پھر سوچتی ہوئی اپنے پہلے پیار کو سزا کون دیتا ہے۔ چلو پھر تمہیں معاف کرتی ہوں لیکن تمہیں میرا ہونا پڑے گا صرف اور صرف میرا۔ کسی دوسرے کو اس میں حصہ دار نہیں بنادوں گی۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہاں لگائی تھی۔ ”مجھے پتا ہے۔“ اس نے میری طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے جواب دیا اور پھر مجھے حیران چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ میں ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ میں خود پر ایسے اتر رہا تھا جیسے کوئی بڑا قلعہ فتح کر لیا ہو۔ میری ہنسی بند ہی نہیں ہو رہی تھی۔ میں خوانخواہ ہی بنے جا رہا تھا تو اس کا مطلب وہ بھی مجھے روز دیکھتی تھی۔ میں ایک اداسہ بھاگ رہا تھا جیسے مورناچ رہا ہے۔

☆.....☆

شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور اب میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ایسا پچھلے دو مہینے سے چل رہا تھا۔ میں کئی ڈنڈا کھیل کر روز اس قبرستان کی طرف آ جاتا تھا اور پھر اس پری چہرہ کا انتظار کرنے لگتا اور پھر جب وہ آتی تو میں چھپ کر اس کو دیکھتا اور اس کے جانے کے بعد میں گھر جاتا۔

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ میں ایک دن اپنے دست و دھنڈے ہوئے اس طرف کو آ رہا تھا کہ ایک لڑکے نے بتایا کہ میں نے اس کو قبرستان کی طرف دیکھا تھا۔ تو میں اس طرف آ گیا اور پھر میں جیسے ہی قبرستان کے قریب آیا تو وہ پری چہرہ مجھے نظر آ گئی اور میں اس پل اپنا آپ اس پر ہار گیا اور پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ قبرستان سے نکل کر پگڈنڈی پر چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ہوش آیا تو دیکھا چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے پھر جلدی جلدی گھر کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیے تھے اور پھر یہ تو روز کا معمول بن گیا۔ میں روز ہی شام ہونے سے پہلے دوستوں سے نظریں بچا کر اس طرف نکل آتا تھا اور روز اس کو دیکھتا تھا۔ واصل وہ اپنی ای کے ساتھ پانی بھرنے کے لیے روز شام کو قبرستان والے نلکے پر آتی تھی۔ وہ لوگ گاؤں سے پانچ دس منٹ کے فاصلے پر اپنے کھیتوں میں رہتے تھے۔ انہوں نے وہاں اپنی زمین پر ہی گھر بنایا تھا۔ ان کے ہاں زمین کا پانی کھڑا تھا اس لیے وہ قبرستان کے نلکے سے پانی بھرنے کے لیے آتے تھے۔

میرا گھر گاؤں کے درمیان میں تھا اور قبرستان گاؤں کے آخری کونے پر تھا۔ قبرستان کی طرف بہت کم لوگ آتے تھے کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں پر جن بھوتوں کا سایا ہے۔ مغرب کے بعد تو ناممکن سی بات تھی کہ کوئی اس طرف آئے۔ میں نے اس لڑکی کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا اور نہ کسی کو معلوم ہونے دیا تھا کہ میں اس طرف آتا ہوں۔

آج وہ اکیلی آئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ اس لیے میں بغیر ڈر اس کے قریب چلا گیا تھا وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی جس سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور پھر جب وہ بولی تھی تو اس کے منہ سے پھول جھرنے لگے تھے۔

☆.....☆

”تو پھر تم رات کو آؤ گی، کھیلنے کے لیے۔“ میں نے جانتی ہوئی تار کو آواز دے کر پوچھا تھا۔ ”کچھ کہہ نہیں سکتی، اگر ابو نے اجازت دی تو ضرور آؤں گی۔“ وہ کہہ کر چلی گئی تھی۔

گرمیوں کی آمد آمد تھی اور اب ہم سب بچے رات کے وقت چھین چھپائی کھیلنے لگے تھے۔ ہم عمر لڑکے اور لڑکیاں مغرب کے بعد اکٹھے ہو جاتے تھے اور پھر رات گئے کھیل کر گھروں کو واپس جاتے تھے۔ گزرے ایک ماہ میں اپنی عمر سے بھی زیادہ تیز چلا تھا۔ میری عمر زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال تھی لیکن میں نے بڑی عمر والوں کو بھی مات دے دی تھی۔ ایک ماہ میں ہماری دوستی محبت میں بدل گئی تھی اور ہمارے جذبات ٹھاٹھیں مارنے لگے تھے۔ ہم نے بہت سارے وعدے کر لیے تھے، آنے والی زندگی کے بارے میں۔ میرے ہم عمر ابھی دو دوئی چار پڑھ رہے تھے اور میں عشق محبت کی راہوں پر بہت دور نکل آیا تھا۔

میں نے کچھ دن پہلے اپنے دوستوں سے تارا کا تعارف کر دیا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ اس میں زیادہ کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی کسی نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی اور اب تارا ہمارے گروپ کا حصہ تھی۔ وہ کبھی بھی رات کو گھر سے باہر کے لیے کھیلنے کے لیے

آتی تھی اور پھر جلد ہی واپس چلی جاتی تھی۔ یہ چھٹا گھر تھا جس سے میں نے بچا لیا تھا۔ گھر سے آتے آتے مجھے کافی دیر ہوئی تھی۔ گھر والے ایک کام ختم کرتا تو دوسرا کہہ دیتے، اس طرح میرے کھیل کا سارا ٹائم گھر میں ہی نکل گیا تھا اور اب جب واپس آیا تھا تو سارے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

”اچھا شہباز سے پوچھ کر آتا ہوں، شاید اس کی بہن کے ساتھ ان کے گھر چلی گئی ہو۔“ میں نے سوچتے ہوئے شہباز کے گھر کا رخ کیا تھا۔ جہاں پر کھیل رہے تھے وہاں کے آس پاس کے گھروں سے پتا کیا تھا لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا ایک دو نے کہا تھا کہ تارا کے ساتھ تھی۔ شاید اس کے ساتھ ان کے گھر چلی گئی ہو۔“

”نہیں اس کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ وہ کافی دور رہتی ہے اور پھر اگر اس کے ساتھ جاتی تو کسی کو بتا کر تو جاتی۔“ میں نے ان کو جواب دیا تو وہ بھی میرے ہم خیال ہو گئے۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔“

☆.....☆

بات گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور جس جس کو پتا چلی تھی وہ ڈر اور خوف سے سہا جا رہا تھا۔

فیض، شہباز کے گھر گیا تھا۔ رابعہ کا پتا کرنے کے لیے اور جو بات شہباز سے پتا چلی تھی اس پر فیض کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ شہباز نے بتایا کہ میں آج کھیلنے کے لیے گیا ہی نہیں۔ دوپہر کو درخت سے گر کر مجھے چوٹ لگ گئی تھی اور اس بات کی گواہی اس کے گھر والوں نے دی تھی اور پھر جب فیض تارا کے گھر پہنچا تو صحیح معنوں میں اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ یہاں پر کوئی اور مالی لوگ رہتے تھے۔ وہاں نہ تارا ملی تھی اور نہ ہی اس کی ماں تھی۔ اس نے اندر جا کر ایک ایک کمرہ دیکھا تھا۔ اور پھر فیض گرتا پڑتا گھر پہنچا تھا اور گھر آ کر اس نے سب کچھ بتا دیا تھا اور پھر سارا کا سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا اور پھر سب نے مل کر پورا گاؤں اور آس پاس کا علاقہ چھان مارا تھا لیکن

☆.....☆

”فیض تمہاری ای بلا رہی ہیں۔ میں تمہارے گھر جھنکے لیے گیا تھا تو تمہاری امی کہہ رہی تھیں کہ فیض کو بھیجنا کام ہے کوئی۔“

”اچھا میں جاتا ہوں۔ رابعہ (چھوٹی بہن) نظر آئے تو اس کو کہنا میں گھر گیا ہوں۔ وہ شاید تارا کے ساتھ ہو۔“

”ٹھیک ہے میں کہہ دوں گا۔“

تارا اور رابعہ میں اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اکٹھی چھپتیں اور باری آنے پر اکٹھی باری بھی دیتی تھیں۔

”جی امی آپ نے بتایا تھا۔ جلدی بتائیں کیا کام تھا۔ میں نے کھیلنے جانا ہے۔“ گھر میں داخل ہوتے ہی میں امی کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔

”نہیں، میں نے تو نہیں بلایا۔ اچھا چل تو آگیا ہے تو اپنے دادا کا حقہ تازہ کر جا۔“ امی نے اپنا کام مجھے سونپ دیا تھا۔

میں دل پر جبر کر کے حقہ کی طرف بڑھ گیا تھا اور ساتھ ہی شہباز کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کا سوچ رہا تھا جس نے جھوٹ بولا تھا اور مجھے پھنسا دیا تھا۔

☆.....☆

”رابعہ آپ کے گھر تو نہیں ہے۔“

”نہیں تو۔ وہ تارا کے ساتھ تھی اس سے پوچھا؟“

”نہیں وہ بھی نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں۔“

قبرستان میں دیکھو۔“
اور پھر آٹھ دس لوگ قبرستان میں داخل ہوئے
اور ڈھونڈنے لگے اور ایک کونے سے شور بلند ہوا۔
رابعہ مل گئی۔ جس جس نے رابعہ کو دیکھا تھا اس کا خون
خشک ہو گیا تھا اور وہ لڑکا تو ڈر کے مارے بے ہوش ہو
کر گر گیا تھا۔

رابعہ کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ ایک
پرانی قبر پر بیٹھی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے قبر کی
مٹی جلدی جلدی سائیڈ پر کر رہی تھی۔ اس کے دو قدم
کی دوری پر ایک قبر پوری طرح سے کھلی پڑی تھی۔
لوگوں کو دیکھ کر رابعہ خونخوار آوازیں نکالنے لگی تھی۔ کوئی
بھی رابعہ کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا اور
پھر آ کر کچھ بزرگوں نے ہمت کر کے رابعہ کو پکڑا تھا۔
رابعہ کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو گئی تھیں، جو چاند
کی روشنی میں اور خونخوار نظر آرہی تھیں۔

رابعہ کو بڑی مشکل سے چار پانچ بندے پکڑ کر گھر
لائے تھے۔ وہ ایک دو کے تو قابو میں ہی نہیں آرہی
تھی۔ رابعہ کو جیسے ہی گھر لے کر آئے تھے وہ خود کو آزاد
کر وا کر باہر بھاگنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ وہ کسی
کے بھی قابو میں نہیں آرہی تھی۔
اور پڑھ کوئی جا کر مولوی صاحب کو دم کرنے کے
لیے بلا لایا تھا۔ جیسے ہی مولوی صاحب سامنے آئے
تھے رابعہ اور بے قابو ہو گئی تھی اور آخر رابعہ نے مولوی
صاحب کو زور کا دھکا دیا تھا اور مولوی صاحب کسی فٹ
بال کی طرح کئی فٹ دور جا کر گرے تھے اور بے ہوش
ہو گئے تھے۔ چار پانچ بندوں نے مل کر رابعہ کو رسیوں
سے باندھ دیا تھا۔

”خاوم حسین شاہ صاحب کا پتا کرو، یہ مولوی
صاحب کے بس کی بات نہیں ہے۔“ کسی نے ہجوم
میں سے کہا تھا۔

☆.....☆
”شاہ صاحب میں اس سے سچی محبت کرتی
ہوں۔ خدا کے لیے ایسا ظلم نہ کریں مجھے معاف
کروں۔ میں مر جاؤں گی شاہ صاحب۔ میں مر
جاؤں گی۔“ تارا شاہ صاحب کے سامنے گڑ گڑا رہی

”میری محبت سچی ہے۔ میں ایک دن واپس
ضرور آؤں گی۔“ تارا نے بلند آواز میں کہا تھا لیکن
آواز صرف شاہ صاحب کے کانوں تک نہ پہنچی تھی
بلکہ انہیں ہی دم توڑ گئی تھی۔ شاہ صاحب نے آتے ہی

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ فیض نے خود ہی
فرض کر لیا تھا کہ ہمارا وہ گھر ہے۔ اس نے بھی مجھ سے
پوچھا ہی نہیں اگر پوچھتا تو میں سب کچھ سچ بتا دیتی،
میں نے کوئی۔“
”ابھی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ شاہ صاحب
نے پھونک ماری تھی اور اگلے ہی لمحے تارا بوتل میں قید
ہو گئی تھی۔

سب کچھ بھاسپ لیا تھا اور پھر آدھے گھنٹے کی پڑھائی کی تھی اور دونوں باپ بی بی کو حاضر کر لیا تھا اور پھر سب کچھ اگل دیا تھا تارا کے باپ نے۔

تارا کے باپ نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے ایک چلا کاٹا تھا جس کے لیے اس کو ایسی لڑکی کی تلاش تھی جس کی عمر دس سال سے کم ہو۔ وہ صفر کی چودہ پورے چاند کی رات دن سوموار کو رات کے پچھلے پہر پیدا ہوئی ہو۔ بہت تلاش کے بعد اس کو وہ لڑکی ملی تھی اور وہ تھی رابعہ۔ چلے کی شرط تھی کہ لڑکی پر زبردستی قابض نہیں ہونا۔ وہ خوشی کے ساتھ اس کے پاس آئے۔ تارا کے باپ نے سب کچھ پلاننگ کے تحت کیا تھا۔ فیض کو قبرستان کی طرف بھی خود لے کر گیا تھا جس نے فیض کو قبرستان کا کہا تھا وہ بھی تارا کے باپ کا چلہ تھا۔ تارا اس سب سے لاعلم تھی۔ وہ واقعی کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ فیض سے سچی محبت کرنے لگی تھی۔ وہ اپنے باپ کی سازش کا شکار ہوئی تھی۔ تارا جیسے ہی رابعہ کو اپنے گھر لے کر گئی تھی اس کا باپ اسے مار کر اس کے جسم پر قابض ہو گیا اور اب اس کو پرانی دو قبریں کھود کر ان میں سے ریڑھ کی ہڈی نکالنی اور اس کے بعد ان کو جلا کر ان کی راکھ کو اپنے جسم پر مل کر قبر میں بند ہو جانا تھا۔ تب تک کے لیے جب تک رابعہ کا جسم گل سر کے مٹی نہ ہو جاتا لیکن وہ اس سے پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔

☆.....☆

”ہا ہا ہا.....“ فضا میں قہقہے کی آواز گونجی تھی اور فیض اپنی جگہ پر بیٹھا ہی سمیٹ گیا تھا۔ پریشانی یا یوسی دکھ دے بسی فیض کے انگ انگ سے ٹپک رہی تھی۔ فیض چھت میں بیٹھا سوچوں میں گم تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ سب کچھ اس کی سوچ اور پہنچ سے بالاتر تھا۔ وہ ہر جگہ کی خاک چھان آیا تھا لیکن اس کو کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ سب سے پہلے خادم حسین شاہ کے پاس گیا تھا۔ جہاں جا کر اس کو معلوم ہوا تھا کہ شاہ صاحب پانچ سال پہلے وفات پا گئے ہیں اور ان کی جگہ بھی کوئی نہیں لے سکا۔ وہاں سے مایوسی کے بعض فیض نے ہر وہ درجہ جانا تھا جس کا اس کو کسی نے کہا تھا

لیکن وہ ہر جگہ سے ناکام لوٹا تھا۔ وہ جس کے پاس جاتا تھا وہ پوری تسلی دیتے اور پھر اگلے دن ہی اس کو خبر ملتی کہ رات اس بلا کو کسی نے قتل کر دیا اور قاتل کا پتا تک نہیں چلا۔ اب تک وہ پانچ بابوں کے پاس گیا تھا وہ پانچوں قتل ہو گئے تھے۔ اب فیض ہر طرف سے مایوس ہو گیا تھا اور اب چھت پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا جب فضا میں قہقہے کی آواز بلند ہوئی تھی۔

”تو آخر کار تم نے ہار مان ہی لی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا فیض، اب اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں جو تم کو میرا ہونے سے روک سکے۔ تم کو تو بس ہر صورت میں میرا ہونا ہے اور صرف میرا۔ اب تمہارے لیے یہ آخری وارننگ ہے۔ تمنا دن کے اندر اندر اپنی بیوی کو اپنی زندگی سے نکال باہر کر دو ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“ تارا نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”کیونکہ محبت اور جنگ میں تو سب جائز ہوتا ہے۔“ ”جو تم چاہتی ہو وہ بھی نہیں ہو گا۔ جو تم سے ہوتا ہے کہ کر لو۔“ فیض نے تارا کی دھمکی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”فیض میرے ساتھ ضد نہ لگاؤ تم بہت پچھتاؤ گے اور دوسرا یہ تو وقت بتائے گا کہ کیا کیا ہو سکتا ہے۔“ تارا نے وارننگ دیتے ہوئے کہا اور اگلے ہی لمحے وہ ہوا میں تحلیل ہو گئی اور فیض اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔

☆.....☆

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔“ فیض کے چاروں طرف یہ الفاظ گونج رہے تھے اور وہ راکھ کے ڈھیر پر بیٹھا ہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ لوگ چاروں طرف جمع تھے، اس کو دلاسا دے رہے تھے اس کو سنبھال رہے تھے لیکن وہ تھا کہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کبھی اپنا سر دیوار پر مارتا تو کبھی زمین پر اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنا غم ہلکا کرے تو کرے کیسے۔

دو گھنٹے پہلے وہ خوشی خوشی گھر کو لوٹا تھا۔ اس کو کسی نے بڑے ماہر عالم کا بتایا تھا جو ہر قسم کا جادو ٹونے کا ماہر تھا۔ بتانے والے نے فیض کو یقین دلایا تھا کہ اس

ٹھیک ہے میں تمہارا ہو جاتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔ فیض نے خشک لہجے میں کہا تھا۔ آخر فیض مان ہی گیا تھا تارا نے ٹھیک کہا تھا تم کو میرا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

”تم جو کہو گے میں ماننے کے لیے تیار ہوں۔ تم بس حکم کرو۔“ تارا نے خوشی سے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھے سے سوچ لو پھر نہ کہنا۔“ فیض نے فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم کو ہمیشہ کے لیے انسانی جسم میں آنا ہو گا۔ میں تم کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔“ فیض نے اپنی بات مکمل کی تھی اور اب تارا کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ جس کی حالت ہی بدل چکی تھی۔ ”بس اتنی سی محبت تھی۔ میں نے تو سنا تھا محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔“ فیض نے ٹھیک وقت پر چوٹ کی تھی۔ فیض کی بات پر تارا تڑپ اٹھی تھی۔

”ٹھیک ہے تم جو کہو گے میں ماننے کے لیے تیار ہوں۔“ تارا نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا تھا۔ ”لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہو گا۔ وہ یہ کہ تمہیں بھی میرے ساتھ جینا ہو گا۔ میرے ساتھ مرنا ہو گا۔“ فیض، تارا کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا تھا اور پھر اگلے لمحے فیض نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا۔

”مجھے منظور ہے۔“ فیض کے انداز سے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑا فیصلہ کر لیا ہو۔

☆.....☆

”چاروں طرف اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔ سناٹا اس قدر تھا کہ اگر سوئی بھی گرے تو اس کی بھی آواز آئے اور ایسے میں جب بھی دور کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آتی تو وہ ماحول کو اور پراسرار اور خوف ناک بنا دیتی۔ رات کا درمیانی پہر چل رہا تھا اور فیض ایک بیلچہ ہاتھ میں لیے بے خوف و خطر قبرستان میں داخل ہوا تھا اور اب اس کا رخ ایک تازہ بنی قبر کی طرف تھا جس کا ابھی پانی بھی خشک نہیں ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف پھولوں کا پتیاں بکھری پڑی تھیں۔ قبر اب بھی دو گھنٹے

کا کام بھرتی ہو جاسکتا تھا۔ وہ خبر اپنی بیوی کو سامنے کے لیے بے تاب تھا، جس نے کہا تھا کہ میں تم کو پھور کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ مریں گے تو ساتھ جیوں گے تو ساتھ میں۔“ وہ جیسے ہی اپنے محلے میں داخل ہوا تھا اس کو دور سے دھواں دکھائی دیا تھا اس کو لگا کہ کسی نے کوڑے کو آگ لگائی ہوگی ایسا اکثر ہوتا تھا پہلے بھی لیکن وہ جیسے ہی اپنی گلی میں داخل ہوا تھا اس کے مکان کے چاروں طرف لوگوں کا رش تھا۔ اس کا دل کسی انہونی کا اشارہ دینے لگا تھا اور پھر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے مکان کی طرف بھاگا تھا اور پھر جیسے ہی لوگوں کو ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے سامنے بس راکھ ہی راکھ بکھری ہوئی تھی۔ گھر کی ہر چیز جل چکی تھی اور اس میں اس کی بیوی اور دونوں بچے بھی شامل تھے۔

کوئی کچھ کہہ رہا تھا تو کوئی کچھ لیکن فیض تھا کہ اپنے ہوش میں ہی نہیں تھا۔ وہ راکھ اڑا رہا تھا خود پر گرا رہا تھا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھا گیا تھا اور وہ گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

☆.....☆

”بس ہو گئی تم سے محبت اب میں کیا کروں۔ مجھ پر اپنا بس نہیں رہا، میں نے کہا بھی تھا میرے ساتھ ضد نہ لگاؤ لیکن تم باز نہیں آئے۔ میں اتنا نہیں آگئی اور مجھے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا سوائے تمہارے۔“ وہ پتا نہیں ہے میں پچھتا رہی تھی یا پھر فیض کا دل جیتنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ آج تیسرا دن تھا فیض راکھ کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کو اٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے ذرا برابر بھی نہیں ہلا تھا۔ آج تارا واپس آئی تھی اور فیض کو راکھ کے ڈھیر پر بیٹھا دیکھ کر اس کا دل کٹ سا گیا تھا۔ تارا نے فوری فیض کو اٹھایا تھا اور چھت پر بنے واحد کمرے میں لے آئی تھی جو چلنے سے بچ گیا تھا۔ اب شام ہونے کو آئی تھی اور تارا فیض کا سر گود میں رکھ کر اپنا پچھتاوے اور محبت کے بول بول رہی تھی اور فیض بس سامنے دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔

☆.....☆

نہیں میں تم کو بھولا نہیں۔ فیض نے خاموشی
آنسو بہاتے ہوئے اپنی بیوی کو خیالوں میں پکارتے
ہوئے آواز دی تھی۔

”نہیں میں تم کو نہیں بھولا۔ نہیں میں تم نہیں
بھولا۔“ آنسوؤں سے فیض کا چہرہ تر ہو رہا تھا اور وہ
بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا میں تم کو نہیں بھولا۔
ایک عہد میں بندھا ہوا تھا لیکن اب اور نہیں۔ میں نے
سب سوچ لیا ہے۔ فیض نے اٹل لہجے میں کہا تھا۔

☆.....☆

”یہ بدبو کیسی ہے؟“ تارا جیسے ہی کمرے میں
داخل ہوئی تھی اس نے فیض سے پوچھا تھا۔ ابھی
کچھ دیر پہلے وہ سارا شہر گھوم کر واپس لوٹے تھے۔
فیض نے تارا کو ہر چیز دکھائی تھی اور محسوس کروائی
تھی۔ تارا کی بات سن کر فیض خاموش رہا تھا اور تارا
کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کے درمیان میں لے گیا تھا۔
فیض کا ایک ہاتھ تارا کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا
چینٹ کی جیب میں تھا۔ فیض تارا کی آنکھوں میں
دیکھنے لگا تھا اور پھر تارا کو پکارا تھا۔

”تارا!“ تارا نے فیض کی آنکھوں میں دیکھا تھا
صدقے واری جانے والے انداز میں۔

”تارا..... کیا محبت اور جنگ میں سب جائز
ہوتا ہے۔“ فیض کا لہجہ عجیب اور پراسرار تھا۔ فیض
کے سوال پر تارا حیران ہوئی تھی اور اُلجھے ہوئے
انداز میں فیض کی طرف دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ
تارا کچھ جواب دیتی فیض کی جیب سے لائسنس نکلا تھا
اور اگلے ہی لمحے اس میں سے شعلہ نکلا تھا اور فیض
نے تارا کو اپنی طرف کھینچ کر گلے لگا لیا تھا۔ لیٹر سے
نکلے شعلے نے گیس سے بھرے پورے کمرے کو اپنی
لپیٹ میں لے لیا تھا اور تارا کی ”ہاں“ گلے میں ہی
وب کر رہ گئی تھی۔

”یہ تو ایک عہد تھا جو نبھانا تھا مجھے، ورنہ زندگی
کس کو پیاری نہیں ہوتی۔“ فیض کے الفاظ فضا میں
چاروں طرف گونج رہے تھے اور سب کچھ تیزی سے
راکھ ہو رہا تھا۔

پہلے ہی بجائی گئی تھی اور پھر بجے سے فیض کیپے کے
ساتھ قبر کی مٹی ہٹانے لگا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر فیض
نے مکمل قبر کھول لی تھی اور اب بغیر کسی ڈر و خوف کے
وہ قبر کے اندر اتر گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی لاش قبر
کے باہر تھی۔ فیض نے لاش کا کفن منہ کی طرف سے
کھولا تھا اور پھر لاش کا چہرہ دیکھتے ہی فیض کے چہرے
پر کئی رنگ آکر گزر گئے تھے۔ فیض نے لاش کو ایک
طرف رکھ کر اس کے کپڑے تبدیل کیے اور کفن قبر کے
اندر ڈال دیا تھا اور پھر قبر کی مٹی برابر کی تھی۔ اس کو پھر
سے پہلی والی حالت میں لے آیا تھا اور پانی کا چھڑکاؤ
کر کے قبر پر پھول کی پتیاں ڈال دی تھیں جو وہ اپنے
ساتھ لے کر آیا تھا۔ یہ سب کرتے ہوئے فیض کا دل
ایک بار بھی نہیں گھبرایا تھا۔ فیض ابھی کام سے فارغ
ہی ہوا تھا کہ چاروں طرف تیز ہوا چلنے لگی جو آہستہ
آہستہ آمدنی کی شکل اختیار کر گئی۔ آمدنی میں اسے
بہت خوف ناک آوازیں آنے لگی تھیں۔ فیض نے
ایک درخت کے تنے کو پکڑ لیا تھا لیکن اس کے قدم پھر
بھی زمین سے اکھڑ رہے تھے اور پھر اچانک آمدنی
رک گئی تھی اور لڑکی کی لاش کو ایک جھنکا لگا تھا اور وہ اٹھ
کر بیٹھ گئی تھی اور پھر اگلے لمحے وہ لڑکی اپنی جگہ پر
کھڑی ہوئی تھی اور فیض بھی۔ پھر لڑکی بھاگ کر فیض
کی طرف آگئی تھی اور آ کر فیض سے لپٹ گئی تھی۔

☆.....☆

”فیض تم مجھے اتنی جلدی بھول گئے اور تم نے اپنی
نئی دنیا بسالی۔ فیض تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تمہیں اپنے
بیوی، بچے بھی یاد نہیں آئے۔“ فیض ایک جھٹکے سے
اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پسینے سے سارے کپڑے بھیگے
ہوئے تھے۔

”تو خواب تھا یہ۔“ فیض جیسے ہی پوری طرح
ہوش میں آیا تھا فیض کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن وہ
الفاظ ابھی بھی چاروں طرف گونج رہے تھے۔ تم مجھے
اتنی جلدی بھول گئے۔ فیض مجھے تم سے یہ امید نہیں
تھی۔

فیض نے بذی دوسری طرف دیکھا تھا جہاں تارا
بے خبر سو رہی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پراسرار خیر کی دوسری مشہور کہانی

رات کے مسافر ✓



ڈاکٹر خادم حسین کھٹرا

ان جنات کی کہانی جنہوں نے ہر رات حضرت انسان کو ختم کرنے کی قسم کھائی تھی

خوشگوار گزر رہی تھی۔
یہ اُن دنوں کی بات ہے جب گرمیاں زروں پر
تھیں۔۔۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ ہم کئی دنوں
سے ٹھنڈے علاقے کی سیر کا پروگرام بنا رہے تھے۔
”کب سے کہہ رہی ہوں کہ سیر کو چلیں مگر آپ
ہیں کہ نال مثل سے کام لے رہے ہیں۔ ابھی بچوں کی
چھٹیاں بھی ہو گئی ہیں اور موسم بھی قدرے اچھا ہے۔“
جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوا تو بیگم صاحبہ کا
پارا گرم پایا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا انھوں
نے الٹی میٹم دے دیا۔۔۔ وہ مسلسل چھ ماہ سے کہہ
رہی تھی اور میں مصروفیات کے جال میں ایسا جکڑا
ہوا تھا کہ کیا بتاؤں۔ کلینک پہ مریضوں کا رش ہی
اتنا ہوتا تھا۔ مریضوں کو چیک کرتے کرتے شام
ہو جاتی اور کلینک دو چاروں کے لئے بند بھی نہیں
کر سکتا تھا۔۔۔ ادھر بیگم صاحبہ بلاناغہ کہیں
جانے کو کہہ رہی تھیں۔ آج تو اُن کا پارا آسمان کو
چھو رہا تھا تو بالآخر غنیمت ہے یہی جانی کہ ہفتہ کی شام

رات کے گہرے سائے ہر طرف اپنی چادر
پھیلائے ہوئے تھے۔ میں خراں خراں سیڑھیاں
چڑھ رہا تھا۔ خاموشی کا عالم تھا۔ خاموشی کے اس
لمحے تابندہ کی چیخیں مجھے واضح سنائی دے رہی
تھیں۔ ابھی ابھی تو میں بچوں کا کمرے میں سُلا کر
نیچے استقبالیہ کی طرف لوٹ رہا تھا۔ تابندہ واش روم
میں فریش ہونے چلی گئی تھی۔ اتنے میں، میں نیچے جا
کر کمرے کا کرایہ طے کرنا چاہتا تھا۔ ابھی چند
سیڑھیاں اُتر ہی تھا کہ تابندہ کی وحشت ناک چیخوں
نے مجھے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

میں پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں اور اپنے
کلینک پہ صبح شام مریضوں کا علاج کرتا رہتا ہوں۔
میرے دو بچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نعمتوں سے نواز
رکھا ہے اور رحمت کا اُمید وار ہوں۔۔۔ تابندہ
! سیری شریک سفر ہے اور آج سے پندرہ سال پہلے
میری زندگی میں آئی۔۔۔ ماں باپ کی رضا مندی
سے ہم شریک سفر بن گئے اور اب زندگی بڑی



کو چلے چلیں۔ www.paksociety.com
میرے دونوں بیٹے سلطان اور علی شان تیار تھے
اور ان کی ماما بھی تقریباً ریڈی تھیں۔ میں ابھی تک
کلینک پر تھا، بار بار نیگم صاحبہ کی کالز آرہی تھیں۔
بڑی مشکل سے مریضوں سے فارغ ہوا اور
بھگم بھاگ گھر کی طرف گاڑی دوڑا دی۔۔۔ نیگم
صاحبہ کی آخری کال اس وقت آئی جب میں گھر
سے تین کلومیٹر کی دوری پر تھا۔

گھر پہنچا تو تابندہ کا پارا آسمان کو چھو رہا تھا، تیور
بدلے ہوئے تھے، مجھے دیکھتے ہی فوراً بولی۔

”کبھی تو وقت پہ گھر آ جایا کرو۔۔۔ دیکھو تو
کتنا ناگم ہو گیا ہے، بچے کب کے تیار ہیں۔ اب تو
سارے پلان کا مستیاناس ہو گیا ناں۔۔۔ اب کہا
ں جایا میں گئے۔“

ابھی کچھ نہیں ہوا، بہت وقت پڑا ہے۔ میں
شارٹ کٹ راستہ جانتا ہوں، ہم مری جلدی پہنچ
جائیں گے۔ بس تم سامان اٹھاؤ۔ جلدی سے گاڑی
میں سامان رکھو اور ہم نکلتے ہیں۔ میں کہتے ہوئے
ڈرائس بدلنے چلا گیا۔۔۔ بچے اور تابندہ گاڑی میں
سامان رکھنے لگے۔۔۔

جس راستے کا میں نے انتخاب کیا تھا۔ مشکل
ضرور تھا مگر شارٹ کٹ تھا۔ ہم بہت جلد مری پہنچ
جاتے۔۔۔ کئی بار دوستوں کے ساتھ اسی
راستے سے آیا گیا تھا۔

☆☆☆

جب ہم گھر سے نکلتے لگے تو شام کے سات
بج رہے تھے۔ اندھیرا پھیلنے کو تھا۔ برقی بتیاں
روشن ہو چکی تھیں۔ جس راستے سے میں جا رہا تھا
ایک طرف گہری کھائیاں تھیں تو دوسری طرف
آسمان کو مچھوتے پہاڑ۔ گہرائی کی طرف دیکھتے تو
خوف سا آتا اور پہاڑوں کی طرف نظر جاتی تو
رب تعالیٰ کا ذکر کرنے لگتے۔

شام کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہمارا استقبال کر
رہی تھیں۔ قد آور پہاڑوں پہ چھوٹے چھوٹے سر
سبز پودے بہت پیارے لگتے رہتے۔

تھے۔ خوبصورت مناظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔ میں
بچوں کو انجوائے کرا رہا تھا۔ جب خطرناک موڑ
آتے تو بچے ہم سے جاتے۔۔۔

ہماری کل مسافت چھ گھنٹے کی تھی۔ میرا پلان یہ

تھا اگر زیادہ سیٹ ہو گئے تو راستے میں کسی ہوٹل میں رُک جائیں گے۔۔۔ رات کا بقیہ پہروہاں گزار کر تازہ دم ہو کر صبح سویرے مری پہنچ جائیں گے۔۔۔ ای راستے پہ میں نے چند ایک ہوٹل دیکھ رکھے تھے۔ مگر وہاں رُکنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔۔۔

ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے چار گھنٹے بیت گئے تھے۔ میں بھی ڈرائیو کرتے ہوئے تھک گیا تھا۔ مجھے خیند کی خماری ہو رہی تھی اور ایسی حالت میں ڈرائیو کرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔۔۔ بچے بھی جائیاں لینے لگے تھے۔۔۔ تابندہ جو چلتے وقت جوش و خروش میں تھی۔ اب اُس کی حالت بھی دیدنی تھی۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اور جیسے سیٹ پہ کسی جسم کو سلیقے سے رکھ دیا ہو۔۔۔ نہ کوئی حرکت و برکت۔۔۔ لب سلعے تھے۔۔۔ سو میں نے ہوٹل کی تلاش میں گاڑی کی سپیڈ آہستہ کر دی۔ تاکہ پہلے آنے والے ہوٹل ہی میں رُک سکیں۔۔۔ تھوڑی سی مسافت کے بعد مجھے ایک ہوٹل نظر آیا تو میں نے گاڑی ہوٹل کی طرف موڑ دی۔۔۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ بچے سونے کے لئے بے تاب تھے۔ تابندہ بھی ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ ہم جلد ہی کمرے تک پہنچنا چاہتے تھے۔۔۔ میں نے گاڑی پارک کی اور ہوٹل کے اندر داخل ہو کر استقبال پر پہنچا۔ وہاں ستر سالہ بزرگ کرسی پہ بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ بزرگ کے علاوہ مجھے وہاں اور کوئی نظر نہ آیا۔۔۔ کہاں آگئے ہیں ہم؟ میں نے دل ہی دل میں کہا۔۔۔ ہر طرف خاموشی کے پہرے ہیں۔ ابھی اتنی رات بھی نہیں گزری۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہوٹل آبادی میں نہیں ہے۔۔۔ میں نے اندازہ لگایا۔۔۔ اردگرد کوئی شہر، یا آبادی نظر نہیں آئی تھی۔ ایسے ہوٹل مسافروں کے لئے بنائے جاتے ہیں۔۔۔ جو رات گزارنے کے لئے یہاں رُکتے ہیں۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ بزرگ جمائی لیتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔

”کراہیے؟“

”لیکن ہو سکتا ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ بچے کمرے صاف ستھرے ہیں۔“ اُس نے کہتے ہی تیل دی تو دوسرے لمحے دُلا پتلا سانو جوان وارد ہوا۔۔۔

”سلیمان۔۔۔ صاحب کو کمرے دکھاؤ۔۔۔ یہ لو چائیاں۔۔۔ بچے تھکے تھکے لگتے ہیں۔۔۔ جلدی کر دو۔“

بزرگ نے نو جوان کو چائیاں پکڑاتے ہوئے کہا۔

”بہت شکریہ۔۔۔ باباجی۔۔۔ لیکن کرایہ کتنا ہوگا۔۔۔؟“

”وہ بھی طے کر لیتے ہیں۔ پہلے بچوں کو کمرے تک تو چھوڑ آؤ۔۔۔ کمرے دیکھ لو۔۔۔ پسند آجائیں تو کرایہ بھی طے ہو جائے گا۔۔۔ ابھی بچوں کو سلا آؤ۔۔۔ جاؤ۔“

باباجی ابہت رحمدل اور بااخلاق لگتے تھے۔۔۔ نو جوان نے ہمارا ستان اُٹھایا اور آگے آگے چل پڑا۔۔۔ کمرے دوسری منزل پہ تھے۔ ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

یہ کیا؟۔۔۔ ہم سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے تھک سے گئے تھے مگر سیڑھیاں ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔

”بھائی! دوسری منزل کیا آسمان پر ہے جو سیڑھیاں ختم ہی نہیں ہو رہی ہیں۔“

”بس دو چار اور۔“ سلیمان نے جواب دیا۔ خیر چند سیڑھیاں اور چڑھے تو راہداری آگئی۔ کمروں کی لمبی قطار لگی تھی۔ میں نے سیڑھیاں ختم ہوتے ہی لمبے لمبے سانس لئے اور نو جوان نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا۔۔۔

”یہ رہا آپ کا کمرہ۔“

بزرگ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ بچے صوفے پہ چڑھتے ہی لمبی تان کر سو گئے اور تیکم واش روم چلی گئی۔۔۔ میں نے تابندہ سے کہا کہ

آپ بیڑی ہولوں۔ میں کرایہ طے کر کے آتا ہوں

تک جاری تھی۔۔۔۔۔ میں کھڑکی کے قریب پہنچا ہی تھا۔۔۔۔۔ سامنے قبرستان نظر آیا۔۔۔۔۔ بہت بڑا قبرستان۔۔۔۔۔ کہیں کہیں گھنے درخت بھی تھے۔۔۔۔۔ روشنی کی لکیریں میں، ایک درخت کی شاخوں پہ مجھے اپنے دونوں بچے اور تابندہ کی شکل نظر آئی۔۔۔۔۔ جو شاخوں سے اُلٹے لٹکے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ میں بے چین ہو گیا۔۔۔۔۔ میں جذبہ محبت میں چھلانگ لگا کر اپنے خاندان کے پاس جانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ شاید میں کو وہی گیا ہوتا لیکن۔۔۔۔۔ ابھی میں نے ارادہ ہی کیا تھا کہ اُسی ناویدہ ہستی کی آواز نے مجھے جھنجھوڑا۔

”مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ جو کہو گے وہی کروں گی۔“
”اچھا اتنی جلدی، مان گئی۔۔۔۔۔ ابھی تو بڑے تیور دکھا رہی تھی۔۔۔۔۔ میرے بیوی بچے کہاں ہیں، اُن کو میرے سامنے لاؤ۔۔۔۔۔ اور یہ کیا ڈرامہ ہے کہ لباس میری بیوی کا اور جسامت بھی اُسی کی۔۔۔۔۔ لیکن میری بیوی کہاں ہے۔۔۔۔۔؟ تم کسی اور روپ میں آؤ۔۔۔۔۔“
بل جھپکتے ہی دھواں سا ہوا اور بدبو سی پھیلی۔ وہ جو سامنے تھی دھوئیں میں تحلیل ہو گئی اور بلی کے روپ میں کھلی کھڑکی میں بیٹھی میاؤں میاؤں کرنے لگی۔۔۔۔۔

داش روم کے دروازے کی چڑچراہٹ سنائی دی، دروازے کھلے لگے اور میری بیوی نمودار ہوئی۔ اُس کو اصلی روپ میں دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اس کے حواس اُڑے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ چند لمحوں بعد ہوش آیا تو بھاگ کر میرے سینے سے لپ گئی۔ اُس کا جسم تپ رہا تھا۔۔۔۔۔ اور پسینے سے شرابور تھی۔ حالانکہ موسم قدرے ٹھنڈا تھا اور وہ نہانے گئی تھی۔۔۔۔۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ تب اُسے بچوں کا خیال آیا۔

”بچے کہاں ہیں۔۔۔۔۔ وہ تو سو رہے تھے۔“
اُسے اس کہانی کا کوئی پتا نہیں تھا۔ ب میں نے کھڑکی میں بیٹھی بلی کی طرف اشارہ کیا جو میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔۔۔۔۔ تابندہ بلی کو دیکھنے لگی اور میں نے پوچھا۔

”میرے بچے کہاں ہیں۔؟“

کیا پاگل پن ہے؟ بچوں کو بچانے کی خاطر اپنی جان گنوانے پہ تلے ہو۔۔۔۔۔ یہ اُن کی چال ہے۔۔۔۔۔؟ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“
”پھر کیا کروں؟ میری آنکھوں کے سامنے میری اولاد اور میری پیاری بیوی تابندہ لٹکی ہے اور آپ تو جانتے ہیں انسان کی کل کائنات اولاد ہی تو ہوتی ہے۔“

”آپ کے بیوی بچے کمرے میں ہی ہیں لیکن آپ کو نظر نہیں آ رہے۔ اس چڑیل نے اُن کا عکس وہاں دکھایا ہے۔ وہ مجھے مارنے پہ تپتی ہے۔۔۔۔۔ پھر تم نے غور نہیں کیا۔۔۔۔۔ وہاں قبروں پہ بھی ایک لڑکا بیٹھا ہے۔۔۔۔۔ دیکھو تو۔“

میری نظریں قبرستان کی طرف اٹھ گئیں۔۔۔۔۔ واقعی جہاں میرے بیٹے اُلٹے لٹکے تھے۔ اُن کے نیچے ایک کم سن بچہ قبر پہ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں وحشیانہ تھیں۔ ہونٹ نیچے کو ڈھلکے ہوئے اور بازو بہت لمبے تھے۔۔۔۔۔ مجھے اُس بچے سے خوف آنے لگا۔۔۔۔۔ وہ جہاں ہاتھ کرتا، دھواں سا اُٹھتا۔ وحشی چہرے مسکراتے تھے۔۔۔۔۔ اُن کی لمبی لمبی زبانیں تھیں۔ ہر ایک کے منہ میں دو دو زبانیں۔۔۔۔۔ یا اللہ!۔۔۔۔۔

”اب میں کیا کروں باباجی۔“ میں نے بچے کو دیکھتے ہوئے خیالوں میں ناویدہ ہستی سے بات کی۔

”تم اس چڑیل کو اپنے قابو میں کرو اور اس کو

”آپ کے بچے کرنے میں ہی ہیں لیکن پہلے مجھے آزاد کرو۔“ ملی گوانالی آواز میں بولتے دیکھ کر تابندہ کے حواس اڑ گئے۔۔۔

”آزاد تو میں کروں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ ہمیں تنگ کرنے کا تمہارا مقصد کیا تھا۔۔۔؟“

میری بیوی نیم بے ہوشی میں مجھے تنگے جا رہی تھی۔۔ میں نے اُسے اشاروں میں خاموش رہنے کا کہہ دیا تھا۔

”میں گیارہ سال سے اس ہوٹل میں مقیم ہوں جو بھی یہاں آتا ہے زندہ سلامت واپس نہیں جاتا۔۔۔ اسی طرح یہ ہوٹل ویران ہو گیا تھا مگر آج نئی سالوں بعد تم یہاں آئے ہو۔۔۔ استقبالیہ میں جو تیسریں بزرگ ملا ہے ناں۔ وہ بھی انسانی روپ میں جن ہی ہے۔۔۔ وہ میرے ابو ہیں اور سلیمان جو سامان رکھنے آیا تھا میرا شوہر ہے۔۔۔ ہم تینوں کا یہی کام ہے۔ انسانوں کا خون چنا اور اُن کو اذیت دے دے کر مار دینا۔۔۔ پہلے ہم اذیت دیتے ہیں اور دانتے ہیں۔۔۔ پھر خون پیتے ہیں اور مار دیتے ہیں۔“

”مگر کیوں۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ لمبی کہانی ہے۔“

”مجھے کچھ تو بتاؤ۔ میں نے اصرار کیا۔“

”تو سنو۔“ وہ بولنے لگی۔

”بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ اس ہوٹل کی جگہ میرا خاندان آباد تھا۔۔۔ یہاں بہت بڑی آبادی مقیم تھی لیکن قیامت خیز زلزلہ آیا اور سب ملیا میٹ ہو گیا۔۔۔ سب آبادی ختم ہو گئی اور سامنے جو قبرستان ہے، انہی لوگوں سے آباد ہے۔۔۔ اسی جگہ پیری کا درخت بھی تھا جس پہ ہم آباد تھے۔۔۔ یہ پیری کا درخت بہت بڑا اور پرانا تھا۔ جس پہ ہمارے آباؤ اجداد ایک عرصہ سے آباد تھے۔۔۔

یہ جگہ کنڈرات کی شکل اختیار کر چکی تھی لیکن پیری کا درخت سلامت رہا تھا۔۔۔ پھر کافی عرصہ بعد اس ہوٹل کے مالک نے اس جگہ ہوٹل بنایا۔

ہمیں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن جب اُس کا کام چل نکلا تو اُس نے ہوٹل کو وسعت دی اور کمروں کی تعداد بڑھا دی۔۔۔ دوسری عمارت جو مٹی تھی اُس میں پیری کا درخت آتا تھا۔۔۔۔۔ خالوں نے پیری کا درخت کٹوا دیا۔۔۔ ہم نے بڑی مذمت کی۔ کئی مزدوروں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے، کئی مر بھی گئے۔ لیکن وہ پیری کا درخت اکھاڑنے میں کامیاب ہو گئے۔۔۔ ہم نا کام ہو گئے۔۔۔

ہمارا خاندان بکھر گیا۔۔۔ جس کا ہمیں بہت دکھ تھا۔۔۔ پھر ہم نے اس ہوٹل مالک سمیت انسانوں سے بدلہ لینا شروع کر دیا۔۔۔ اب کی بار ہم نے ایک ایک کر کے انسان کو نشانہ بنایا۔۔۔ پہلے اُس عامل کو موت کے گھاٹ اتارا، جو پہلے سیدھے راستے پر تھا اس لئے ہم پہ غالب آ گیا تھا لیکن جو مٹی اُس کے پاس دولت آنے لگی وہ خبیث بن گیا۔۔۔ بہت سی برائیاں اُس میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہی وقت تھا بدلہ لینے کا۔۔۔ اور ہم نے اُس کے لوتھڑے بکھیر دیے۔

اس حادثہ میں بابا اور میں بچ گئے تھے۔ باقی سارے مارے گئے تھے۔۔۔ میرے بابا نے میرا رشتہ دور پار کے رشتے داروں میں کر دیا۔۔۔ میرا شوہر (سلیمان) ہمارے پاس آ گیا۔۔۔ اُن کے رشتے دار، خاندان اور میرے تایا، چچا بھی قبرستان کے درختوں پر آکر رہنے لگے۔۔۔ اس قبرستان میں پیری کے درخت بہت زیادہ ہیں۔۔۔ اُس دن سے ہم نے ہوٹل کو اپنا نشانہ بنایا اور اپنے مرنے والوں کا بدلہ چن چن کر لیا۔۔۔ ہماری انتقام کی آگ ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی۔۔۔

تب سے آج تک ہم یہاں رہتے ہیں اور جو بھی یہاں آتا ہے اُسے مار دیتے ہیں۔۔۔ ہم انسانی روپ میں آنے والوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور اپنی دشمنی کا بدلہ لیتے ہیں۔۔۔ یہ قبرستان روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جن سے ہم انتقام لیتے ہیں ان کی بقایا جات، یہاں دفن کرواتے ہیں۔۔۔ ہوٹل مالک کا تمام خاندان ابھی یہاں دفن ہے جن کو ہم نے

ایک نیک کر کے بارودیا ہے۔۔۔ میں بھی کہانی ہے۔۔۔
 تم واحد انسان ہو جس پہ ہمارا داؤ نہیں چلا اور
 تم نے مجھے غلام بنالیا۔۔۔ بڑے نیک لگتے
 ہو۔۔۔ کب تک نیکیاں کرو گے۔۔۔ آخر تم بھی
 اُس عامل کی طرح بن جاؤ گے۔۔۔ اور پھر۔۔۔

اب تو مجھے چھوڑ دو۔۔۔؟
 "نہیں۔۔۔ آپ کو یہ سلسلہ ختم کرنا ہوگا۔"
 "نہیں۔۔۔ ہم نے قسم کھائی ہے جب تک زندہ
 ہیں۔۔۔ انسانوں سے بدلہ لیتے رہیں گے۔"
 "تم زندہ رہو گے تو بدلہ لو گے۔۔۔ میں تمہیں
 ختم کر دیتا ہوں۔" میں نے رُعب دار لہجے میں
 کہا۔ "میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو ختم کر دوں
 گا۔۔۔ نہیں تو یہاں سے چپ چاپ ہمیشہ کے لئے
 چلے جاؤ اور وعدہ کروں آئندہ کسی انسان کو تنگ نہیں
 کروں گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ نہیں ہو سکتا۔"
 "اچھا۔۔۔ تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو
 جاؤ۔۔۔ تمہارے ساتھ ساتھ سب کو ختم کر تا
 ہوں۔۔۔ مجھے تو میرے راہبر نے منع کیا تھا، مگر تم
 نہیں مانو گے۔۔۔ تمہیں ختم کرنا ہی ہوگا۔"
 یہ کہتے ہی میں وظیفہ شروع کرنے لگا۔۔۔ وہ
 چیخنے لگی۔۔۔
 "نہیں۔۔۔ جس اللہ کو مانتے ہو۔ اُسی کا
 واسطہ میرے خاندان کو چھو نہ کہنا۔" اُس نے فوراً ہار
 مان لی۔۔۔

"تم بھی تو اُسی اللہ کی مخلوق ہو۔۔۔ اُسی کو
 مانتے ہو۔۔۔ پھر اُس کی مخلوق کو کیوں اذیت دیتے
 ہو۔۔۔ کیوں مارتے ہو۔۔۔ بند کرو یہ سلسلہ۔"
 اُس نے میری بات مان لی۔۔۔ اب میرے
 بچے میرے حوالے کرو۔۔۔ میں تمہیں آزاد کرتا
 ہوں۔۔۔

اُس نے اگلی ٹانگ کو حرکت دی اور دھواں سا
 ہر طرف پھیل گیا۔۔۔ بیڈ کے نیچے سے لمبی کے دو
 بچے نمودار ہوئے اور بیڈ پہ چڑھے۔ دوسرے لمبے
 مجھے دھواں میں کوئی چیز نظر آئی۔ پھر دیکھتے ہی

دیکھتے دو انسانائی ہوئے نظر آئے۔۔۔ وہ جوں ختم ہوا تو
 میرے بچے بیڈ پہ پڑے سو رہے تھے۔۔۔ تابندہ
 مدہوشی کے عالم میں مجھ سے جدا ہوئی اور بیڈ پہ جا کر
 بچوں کو دیوانہ وار چومنے لگی۔۔۔ میں نے اپنے
 بچوں کو دیکھ کر رب کا شکر ادا کیا۔۔۔

یا اللہ تیرا شکر ہے۔۔۔ میں دل ہی دل میں
 اپنے رب کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔۔۔ اتنے میں کھڑکی
 سے آواز آئی۔

"اب مجھے تو آزاد کر دو۔"
 "پھر کسی انسان کو تنگ تو نہیں کرو گے۔؟"
 "نہیں۔"

چڑیل نے وعدہ کیا۔۔۔ میں نے وظیفہ
 پڑھنا شروع کیا اور وظیفہ پڑھتا گیا۔ پھونک لگی
 پہ مارتا گیا۔ وظیفہ مکمل ہوتے ہی ایک طوفان سا
 اٹھا۔ زور دار طوفان آیا۔ تیز آندھی اور
 بارش۔ ہر طرف جل پھل ہو گئی تھی۔۔۔ کھڑکی
 سے لمبی غائب ہو چکی تھی۔۔۔

طوفان تھا تو قریبی گاؤں سے موذن اذان فجر
 دے رہا تھا۔۔۔ رات کا اندھیرا چھٹ گیا اور سحر
 ہونے لگی تھی۔۔۔ میں گھر کے دروازے کے
 ساتھ کھڑا تھا۔ تابندہ اور بچے بیڈ پہ سو رہے
 تھے۔۔۔ جنات جا چکے تھے۔۔۔ میں خود کو ٹٹول
 رہا تھا۔۔۔ میں نے وضو کیا اور نماز فجر ادا کی
 ۔۔۔ بچوں کو جگایا اور سفر پہ روانہ ہو گئے۔ سورج اپنی
 کی کرنوں سے روح زمین پہ روشنی بکھیر رہا تھا اور ہم
 جیسے ہنسائے مری پہنچ گئے تھے۔ خوب سیر سپاٹے
 ہوئے اور شام تک ہم واپس گھر بھی لوٹ آئے۔

آج بھی میں جب کبھی اُس واقعہ کو یاد کرتا ہوں
 تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ
 کی حمد و ثنا کرنے لگتا ہوں۔۔۔ وہی تو ہے جس نے
 ہمیں ہر بلا سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔۔۔ اور اشرف
 المخلوقات بنا کر سبھی مخلوق سے افضل بنا دیا
 ہے۔۔۔ یہ کسی نعمت سے کم ہے کہ انسان ہر مخلوق کو
 اپنے تابع کر سکتا ہے۔۔۔

اپنی سخن منہی کو آزمائیے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

اسامہ یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک نئی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

خضر حیات..... روڈہ تھل

رضوانہ کوثر..... لاہور

چڑھ گئی اس پہیل نفرت کی بن کے درو دیوار سجانے کو گھبرا گیا تھا
وہ جو اک تھا شجر محبت کا لونا تو مرے گاؤں میں وہ گھر ہی نہیں ہے
قاسم خان بلوچ..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

تلاش یار میں نکلے اندھیری رات میں ایک تم کو نہ پا سکے ہم لوگ
بس اک چراغ تھا روشن ہمارے ہاتھوں میں اتنی مدت کہاں رہے ہم لوگ
جو تم نے ہم سے کہا، ہم نہیں سمجھ پائے کسی ترتیب دے گیا کوئی
نجانے بھید تھے کتنے تمہاری باتوں میں کتنے خاموش ہو گئے ہم لوگ

ناظم حسین شاہ..... منجمن آباد

رانا حبیب الرحمن..... ڈسٹرکٹ جیل ٹوبہ ٹیک سنگھ

دشمن نئی چال چل رہا ہے بند سیپوں میں ہوں غلظت ہوں بارش کا
دریاؤں کا رخ بدل رہا ہے میں تمہاری آنکھوں کے پانیوں میں زندہ ہوں
دیتا تھا جو دوسروں کا صدقہ ابو ذر بلوچ..... بہاول نگر
خیرات سے اب وہ پہیل رہا ہے بے طرح تغیر کی جانے کون سی رات ہے
تیز بارشوں میں ہیں گھونسلے پرندوں کے تیز بارشوں میں ہیں گھونسلے پرندوں کے

اسامہ بلال اعوان..... لاہور

علی اصغر انصاری..... منجمن آباد

اب تو وفا کے نام سے نفرت سی ہو گئی اب تو وفا کے نام سے نفرت سی ہو گئی
انجھے ہیں دوست جب سے تری دوستی میں ہم انجھے ہیں دوست جب سے تری دوستی میں ہم
ابو ہریرہ بلوچ..... پورے والا
مرے چارہ گر کو خبر کرو کہ نہو لہو یہ جگر عیا
یہ تو ہو کہ اس کو ملے خبر جو مریض عشق تھا مر گیا
خولجہ حسین..... منجمن آباد

عین بارشوں کے دن جب کوئی مچھڑتا ہے خوش ہے غم سے ذرا جدا ہے
اس کے بعد موسم پھر لازوال ہوتا ہے ہمارا کچھ اور مسئلہ ہے
اس کی بات رہنے دو، اس کو پیار دیے بھی یہاں سے آگئے کہاں کو جاؤں
جب کسی سے ہو جائے بے مثال ہوتا ہے یہاں سے آگئے تو راستہ ہے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابرار جہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے افق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

شازبہ رضوی کراچی
لحوں کی گرم ریت چاروں مری ہی تھی
ٹوٹے ہیں میرے ہاتھ کہ جنبش مری ہی تھی
ہونوں کی سکیپاہوں میں نام تھا مرا
سانسوں کے ارتعاش میں لرزش مری ہی تھی
افضل حسین باہر..... کراچی

زرد پیڑوں کو نہ راس آئی بہاروں کی دعا
ابر آئے بھی تو سیلاب کی صورت آئے
اشفاق شاہین..... اودکاڑہ

ہو گیا اپنی ذات میں مگر
روشنی جیسے رات میں مگر
تیرے درد کا کچا مگر
آنکھوں کی برسات میں مگر

اشعر حقیق..... کراچی
چھتوں سے بارشوں کی ٹھن مگر
گھروں میں لوگ پھر بھی سو رہے ہیں
لاریب اجہر..... کراچی

تنی رہتی ہے جہاں آنسوؤں کی
کیسی بارشوں میں آگئے ہیں
تکسی سے پوچھ کر رستہ ہمارا
سنا ہے لوگ منزل پا گئے ہیں

زین شہور..... کراچی
سیم اور تھوڑ ہو گیا ہوں میں
کوئی بادل برس نہیں سکتا
یاسمین عمران..... وزیر آباد

امر واقعہ ہے یہ چاہتوں کے پیڑوں پر
بارشوں کے موسم میں آشیانے لگتے ہیں

شعبان کھوسہ..... کوئٹہ
سیلاب کے جاتے ہی چلے آئے ہو تم بھی
جب اپنی تباہی پہ میں رویا تو کہاں تھے
غیاث الدین..... شادور
ہم سنا نہیں سکتے تم سمجھ نہیں سکتے
بے دیار لوگوں کے دکھ عجیب ہوتے ہیں
امیر حمزہ مری بلوچ..... حیدر آباد

میں یاد کر ہی ترے ساتھ ہوں تو کاش مجھے
ہزاروں سال تجھے جیتنے میں لگ جائیں
شفیع محمد مری بلوچ..... لاڑکانہ

عشق میں اذیت کی کوئی انتہا بھی ہے
دور نہیں رہا تیرا پھر بھی دل سوالی ہے
تجھ سے ربط قائم ہے، خود کو یاد رکھا ہے
رسم کو نبھایا ہے۔ ریت بھی تو ڈال ہے

مہوش یوسف..... ڈسکہ
کچھ کھو دینے کا اک وھڑکا کچھ نہیں کرتے دیتا
دل سے لپٹے رہتے ہیں اندیشے گزری عمروں کے
آمنہ خان..... فیصل آباد

تمہارا ذکر اگر دن میں بھول جاؤں تو
قضا سمجھ کہ میں راتوں کو جاگ لیتا ہوں
شامکہ اختر..... لاہور

موسموں کے تو بدلنے کا پتا بھی نہ چلے
جانے کس وقت گزر جاتی ہیں عمریں خاموش
ملک صفدر عباس اعوان..... جہانپاں

میں تو ساحل تھا جو چلتا بھی تو کیسے چلتا
وہ بھی موجودہ کی طرح آیا تو میں بھر ٹھہرا
چاند پگلا تھا جو چلا آیا میری جانب
میں تو بادل تھا جو ہمیشہ سے ہی بے گھر ٹھہرا

میرا یہ پسندیدہ شعر ”سچی کہانیاں“ کی نذر ہے



نام:

پتا:

WWW.PAKSOCIETY.COM